مشرقی خاندیش (ضلع جلگاؤں) کے مرحوم فن کار۔ حیات وخدمات

مرتب ◂ ڈاکٹر عبدالکریم سالار

اُردو کے بے لوث سپاہی

مشرقی خاندیش (ضلع جلگاؤں) کے مرحوم فنکار۔ حیات و خدمات

URDU KE BE-LAUS SIPAHI

JALGAON (MAHARASHTRA)

مرتب

ڈاکٹر عبدالکریم سالار

"یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے نیز شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے"

کتاب کا نام : اُردو کے بے لوث سپاہی

مرتب : ڈاکٹر عبدالکریم سالار

معاونین : رشید قاسمی، قیوم اثر

تہذیب وتدوین : مشتاق کریمی

ٹائپ سیٹنگ : ارتکاز صابر

ضخامت : ۲۴۰ر صفحات

تعداد : ۵۰۰

طباعت : نورانی آفسیٹ پریس، مالیگاؤں

سن اشاعت : ۲۰۱۶ء

قیمت : ۱۲۰ر روپے

رابطہ

ڈاکٹر عبدالکریم سالار

۷۰۳ر شہید عبدالحمید نگر (شنی پیٹھ) جلگاؤں (مہاراشٹر) 425001

موبائل: 9423187515

فہرست

حضرت سلطانؔ نقشبندی: فن اور شخصیت

مضمون نگار : ڈاکٹر محسن جلگانوی
تعلیم : ایم اے، ایم فِل، پی ایچ ڈی
رابطہ : 9505967365
مطبوعات : شعری مجموعے۔الفاف، تھوڑا سا آسمان زمین پر،
آنکھ سچ بولتی ہے، شاخ صندل، نثر۔سکندر آباد کی ادبی دستاویز (انتھالوجی)
پتا : فلیٹ نمبر 505-513، بلاک اے، شانتی گارڈنس، اپارٹمنٹس، ناچارام، حیدر آباد

خون دل سے جس نے سینچی گلشن فن کی زمیں
آج اے سلطاںؔ اسی فن کار کی باتیں کریں

مندرجۂ بالا شعر' حضرت سلطانؔ نقش بندی کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنی زندگی میں یہ شعر کس تخلیق کار کی عقیدت میں کہا تھا' لیکن یہ شعر ان کی اپنی زندگی پر صد فیصد صادق آتا ہے کہ انہوں نے اپنا خونِ جگر اس سرزمین کے لئے وقف کردیا تھا جس کو انہوں نے ''گلشن فن کی زمین'' قرار دیا تھا۔

1977ء میں ان کی رحلت' راقم الحروف کے وطنِ مالوف جلگاؤں میں ہوئی تھی۔1986ء میں ان کی شاعری کا شعری مجموعہ ''پس مرگ'' کے عنوان سے حیدر آباد سے شائع ہوا۔جس کے پیش لفظ میں راقم الحروف نے ''خامہ خوں چکاں اپنا'' کے عنوان سے کچھ یوں رقم کیا تھا:

''مجھے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے لیکن اس پل صراط سے مجھے گزرنا بھی ہے تاکہ حضرت سلطان کے اس مقدس احساس کی روح کو تسکین پہنچائی جاسکے جس نے اپنے اعتماد کی سند مجھ ایسے فرد کے ہاتھوں میں تھمادی تھی جس کے ہاتھوں کا ارتعاش' ان کے فالج زدہ ہاتھوں سے کچھ زیادہ ہی تھا۔''

حضرت سلطان نقشبندی کی غزلیں جو کتابی صورت میں ''پسِ مرگ'' کے عنوان سے منظر عام پر

آئی تھیں وہ انہوں نے اس وقت میرے سپرد کی تھیں جب میں اپنے وطنِ مالوف سے دربدری کے بے سمت سفر کی جانب روانہ ہوا تھا۔ بے زمینی کی اس مسافت میں میری زندگی کا شیرازہ قریہ قریہ شہر شہر بکھرتا چلا گیا، لیکن میں نے آندھیوں اور طوفانوں کی شدید صورتوں میں بھی اس امانت کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ برسہابرس تک میں اپنی سانسوں کو سمیٹے رکھنے کی جدو جہد اور لامکانی کے سفر میں رہا۔ میری ہزار تاویلات اور عذر کے باوجود ان کی خواہش رہی کہ کتاب کی ترتیب وتدوین اور اشاعت کا کام میں ہی انجام دوں۔ مختلف مراحل پر میں نے اپنی بے ثباتی اور کم مائیگی کے بابت انہیں لکھا لیکن حکمِ حاکم تھا کہ مجھے اس آگ کے دریا کو پار بھی کرنا ہے اور دوسرے کنارے سے ''امر بیل'' بھی لانی ہے۔ امر بیل کا لانا تو درکنار، دریا کو عبور کرنے میں ہی اتنی تاخیر ہوگئی کہ حاکم کا وجود ہی نہ رہا۔ دیمک زدہ اوراق، برساتوں کی رم جھم میں نہائے الفاظ، تراشیدہ تراشیدہ اشعار، ورق ورق بکھری غزلیں چن چن کر جوڑ جوڑ کر ''پس مرگ'' کی صورت گری عمل میں آئی۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں کمی بیشی رہ گئی ہو۔ ایک خاص بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت سلطان کے بیان کے بموجب ان کا معتد بہ کلام بعض کرم فرماؤں کے ہاتھوں میں طباعت کے لئے گیا تو پھر واپس ان تک نہ آسکا اور بچا کچا سرمایۂ سخن میرے احساس فرض کے ہاتھ پہنچا۔

سلطان صاحب کی ادبی شخصیت مہاراشٹرا اور بالخصوص خاندیش کے علاقے میں اہمیت کی حامل تھی لیکن ان کے حینِ حیات ان کی شخصیت اور شاعری پر کوئی مبسوط مضمون یا مقالہ نہیں لکھا گیا۔ میں ان کے تمام تلامذہ میں سب سے کم عمر اور شعور ووجدان سے عاری شاگرد تھا۔ اپنی بے ربط چند غزلوں کو ان کے حسنِ نظر سے گزارنے کی سعادت حاصل کرسکا تھا۔ ہمارے اہلِ ادب نے ان کی زندگی میں ان کے منصب کو نہیں پہچانا۔ زندگی بھر انہوں نے نام ونمود سے خود کو بچائے رکھا۔ انہیں جرائد و اخبارات میں چھپنے چھپانے سے دلچسپی نہ تھی یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی جسمانی خستگی اور بے بصری کی وجہ سے وہ ان وسائل سے استفادہ نہ کر سکے ہوں۔ راقم الحروف نے ایک مختصر عرصہ میں ان کی چند غزلیں روزنامہ انقلاب بمبئی میں چھپوائی تھیں۔ نیاز فتح پوری کے مشہور زمانہ ادبی ماہنامے ''نگار'' میں ان کی طرحی غزلوں کے چند اشعار جناب حامد جلگانوی کی دلچسپی سے شائع ہوتے رہے۔ اس زمانے میں ''نگار'' میں کسی شاعر کے نام کی اشاعت بھی باعث فخر وانبساط تھی۔ وہ اپنی علالت اور حالات کی ستم ظریفیوں کے باعث گوشۂ تنہائی اختیار کرنے پر مجبور تھے اور پس پردہ رہ کر ادب وشعر کی عظمت کو اپنا وطیرہ بنالیا تھا۔

وہ کلاسیکی شاعر تھے‘ اسی روایت کے دائرہ میں رہ کر انہوں نے معنی آفرینی کے وافر مضامین بساط قرطاس وقلم پر بکھیرے۔ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن جیسے حمد‘ نعت‘ منقبت‘ خمسہ‘ رباعیات‘ قطعات مسدس‘ تضامین اور نظم میں طبع آزمائی کی لیکن راقم الحروف تک ان کی غزلوں کے علاوہ دیگر شعری سرمایہ نہیں پہنچ سکا۔ میری دانست میں وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ انہوں نے غزل کی حلاوت وآب وتاب کو معیار بخشا۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زبان و بیان کی باریکیوں کے نکتہ ور تھے اور علم عروض کے شناور بھی۔ انکے یہاں اپنے معاشرے کا کرب بھی تھا اور اپنے وقت کی اقدار کے انحطاط کی حسیّت بھی۔

حضرتِ سلطان پر‘ عنفوانِ شباب ہی میں دوبار فالج کا حملہ ہوا تھا‘ وہ تقریباً ٹوٹ چکے تھے۔ ’’پس مرگ‘‘ کی اشاعت کے آخری مرحلے میں صابر زاہد مرحوم نے حضرت سلطان پر ایک مضمون ’’بیتی رتوں کا نوحہ‘‘ کے عنوان سے لکھ کر روانہ کیا۔ اسے ’’پس لفظ‘‘ کے تحت شامل کتاب کیا گیا۔ اس مضمون میں ان کا جو سراپا ابھرا ہے وہ ایک اجنبی قاری کو مبہوت کر دیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

’’ایک کنج میں یکا وتنہا‘ بے برگ وبار‘ خزاں رسیدہ شجر اندر باہر جڑوں میں مفلوج سراپے کے ساتھ ساتھ رمق رمق زندہ۔ بیتی رتوں کا نوحہ گنگناتے ہوئے۔ دائیں بائیں سوکھی ٹہنیوں سے سنڈ منڈ جھولتے ہاتھ‘ آسیب زدہ راستے کی طرح بھیانک چہرہ‘ آنکھوں کی جگہ دو اندھے کنوؤں کی گہرائی‘ پچکی قبر سا پیٹ‘ پیٹھ پر مزار سا ابھار لئے۔‘‘

انہوں نے نہایت خوددار طبیعت پائی تھی۔ ہزار آفات ومسائل کے باوجود کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہیں کیا۔ اس بے مرگ وبار اور خزاں رسیدہ شجر کی چھاؤں میں اتنی پہنائیاں تھیں کہ دھوپ کا مارا کوئی بھی مسافر اپنا نیم جاں سراپا یہاں بجھا سکتا تھا۔

ان کا وطنِ مالوف پارولہ تھا‘ ان کی ولادت 1901ء میں ہوئی تھی اور 1977ء میں جلگاؤں میں پیوند خاک ہوئے۔ پارولہ سے ان کے آبا واجداد مالیگاؤں منتقل ہو گئے تھے۔ 1950ء میں وہ مالیگاؤں سے جلگاؤں اپنے رشتہ دار کے یہاں آئے پھر یہیں کہ ہو کر رہ گئے اور اس شہر کو اپنا وطنِ ثانی قرار دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز پیشۂ تدریس سے کیا تھا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد فالج کے حملہ کے باعث وہ ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس زمانے کی بساط شعر وادب پر اطہر جلگانوی‘ ناظر انصاری‘ حامد جلگانوی‘ پروفیسر افتخار فخر‘ یعقوب سحر‘ مجاہد اور دیگر اساتذہ وشعراء تھے لیکن ان کی موجودگی نے یہاں کی انجمنوں کو کارکرد اور متحرک بنانے میں بڑا رول ادا کیا۔ نئے لکھنے والوں میں نصیر

شوق، محسن جالگانوی، آرزو، نذیر رزمی، صابر زاہد، اعجاز بیاولی، ذاکر جھساولی ان کے تلامذہ میں شامل تھے جنہوں نے آنے والے زمانے میں ادب و شعر میں قابلِ اعتناء نقوش چھوڑے۔

سلطان صاحب کے کلام کی فصاحت و بلاغت کے تناظر میں اکثر مقامات پر ناسخ کی چھاپ نظر آتی ہے جبکہ انہوں نے حضرت ابر احسنی گنوری سے تلمذ حاصل کیا تھا اور بعض غزلوں میں نوح ناروی سے بھی اصلاح لی تھی۔ ان کے یہاں ظفر، غالب، میر اور داغ کی شاعری کے اسالیب کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے جن سے ان کا اسلوب مہمیز ہوا تھا۔

ان کی شاعری کو بنیادی طور پر ''غمِ جاناں'' اور ''غمِ دوراں'' میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ میرا احساس ہے کہ عنفوانِ شباب میں جب ان کا سابقہ اپنے جس محبوب سے ہوا تھا تو اس پیکر رعنائی نے ایک دنیا کو دیوانہ بنا رکھا تھا جس کے لئے انہوں نے کہا تھا:

اک میری نظر کیا ہے دنیا ہوئی سو دائی
جب تم نے تغافل سے لی جھوم کے انگڑائی
اک نور کا مسکن ہے کاشانۂ دل میرا
زینت گہہِ محفل ہے اک صورتِ زیبائی
آنکھوں میں اترتا جا سانسوں میں نکھرتا جا
اے پیکر تابندہ اے پیکر رعنائی

اس قبیل کے اشعار ان کی شاعری میں جابہ جا پھیلے ہوئے ہیں۔ غالباً اس ماہ جبیں کا ہی فیض تھا کہ ''غمِ جاناں'' کا باب ان کے شعروں میں روشن یادوں کی شمعیں فروزاں کرتا ہے۔ اپنے محبوب کی یادوں کی پرچھائیاں ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک ان کا پیچھا کرتی رہیں۔ ایک شعر میں انہوں نے کہا تھا:

عالمِ نزع بھی ممکن ہے کہ مل جائے حیات
مجھ سے آکر جو مری ماہ لقا مل جائے

اپنے محبوب سے اٹوٹ محبت اور پھر خود شکستگی کے باعث انہیں زخموں کا سلگتا بن، درد کا سناٹا اور دربدری کا لامحدود سفر درپیش رہا۔ ان کے مقدر میں محرومیاں ہی محرومیاں تھیں۔ یہی احساس اذیت ناک کرب بن کر ان کے شعری لہجہ میں در آیا تھا۔ خونِ تمنا، شکستِ آرزو، محرومی و محزونی ان کے شعروں میں نوحہ گری کرتی نظر آتی ہے۔

ہر نئی چوٹ تھی گم گشتہ چراغوں کا نشاں

ہر نئے زخم سے اک زخم پرانا نکلا

ان کے ساتھ پیش آئے حادثات، کرب والم کی شدتیں اور دردوغم کی حدتوں کے موضوعات ان کے فکری اظہار کا لازمہ بن گئے تھے جس کا عکس مندرجۂ ذیل اشعار میں دیکھنے کو ملتا ہے:

ظلمت سی سمت سمت مسلط ہے آج کل

سلطاںؔ کہاں نگاہ میں اب روشنی رہی

دل اگر بھٹکے نہ صحرا میں تو پھر جائے کہاں

کیا کرے جب شہر میں اس کا مکاں کوئی نہ ہو

ان کے یہاں اپنے عہد کی تحریکات، سیاسی انقلابات، مابعد آزادی سانحات فرقہ وارانہ فسادات، عالمی تاراجی اور اضمحلال کی کیفیتوں کا احساس ان کے فکری شعور اور عصری تقاضوں سے باخبری کی نشاندہی کرتا ہے۔ان کی ''غمِ دوراں'' کی شاعری ان کے زخموں اور کرب کی خون آلودگی سے عبارت ہے۔

اسیر قفس بھی ہیں بے بال و پر بھی

بصد یاس و حرماں جئے جا رہے ہیں

مجھ سے اے سلطاںؔ یہ کہتی ہے میری بے بسی

زندگی کے دوش پر اتنا گراں کوئی نہ ہو

ان کے کلام میں ان کی اپنی بے مکانی، خود شکستگی، لاچاری وخود انہدامی کے موضوعات اور اظہار کی اضطرابیت سے ذہن خوں چکاں ہوجاتا ہے اور آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں۔

انہوں نے تجربات کی صورت میں اپنے عہد اور زندگی سے جو کچھ پایا، پوری خلاقیت اور دیانت داری کے ساتھ اسے شعری پیکر میں ڈھال دیا۔

سلطان صاحب نے اپنے فن کی کشید اپنے خون جگر سے کی تھی۔ جب جب مہاراشٹرا اور بالخصوص خاندیش کے شعروادب کا ذکر آئے گا یقیناً ان کا نام سرفہرست ہوگا۔

میں رہوں یا نہ رہوں کل اے زمانے والو

میری یادوں کی مرے فن کی یہ سوغات رہے

☆☆☆☆

سیف بھساولی: تم سے وابستہ مری یاد کے افسانے ہیں!

قلمی نام : احمد کلیم فیض پوری (بنیادی طور پر افسانہ نگار)

تاریخ پیدائش : ۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء فیض پور، ضلع جلگاؤں (مہاراشٹر)

کتابیں : چندا کے دیس میں (بچوں کیلئے نظمیں) 2010،

ساگوان کی چھاؤں میں (افسانوں کا مجموعہ) 2012

اعزازات : اردو ساہتیہ اکادمی مہاراشٹر، ادبی خدمات کیلئے اعزاز 2009، اردو ساہتیہ اکادمی مہاراشٹر افسانوں کے مجموعہ ساگوان کی چھاؤں پر 2012 انعام کیلئے منتخب

پتا : 2252، املی پورہ، بھساول (مہاراشٹر) 09028825045

شہر بھساول جہاں ریلوے کے ایک بڑے جنکشن کیلئے ملک بھر میں جانا جاتا ہے وہیں اردو ادب کے ایک بڑے مرکز کیلئے بھی شہرت رکھتا ہے۔ تقسیم سے پہلے یہاں بزم ادب کے زیر اہتمام کل ہند مشاعروں کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ ان مشاعروں میں ملک کے تقریباً سبھی ممتاز شعراء نے شرکت کی جن میں سیماب اکبر آبادی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی، ماہر القادری، سردار جعفری، کیفی اعظمی، خمار بارہ بنکوی، شکیل بدایونی، حسرت جے پوری، نریش کمار شاد، منظور حسن شور، بیکل اتساہی، شمیم جے پوری، ادیب مالیگانوی، سیدہ اختر، عالم فتح پوری، حق کانپوری، دلاور فگار، دل لکھنوی، گلزار دہلوی، تاباں جھانسوی، ایاز جھانسوی، قمر جلال آبادی، صبا افغانی، فنا نظامی کانپوری، ہلال سیوہاروی، سلیمان خطیب، مظفر شاہ جہاں پوری، اختر الایمان، جاں نثار اختر، عارف بلیاوی، ظفر گورکھپوری، راز الہ آبادی، عتیق احمد عتیق وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایک زمانے میں جب شہدائے کربلا کی یاد میں یہاں سالانہ مسالمے منعقد ہوا کرتے تھے۔ جانشین داغ حضرت نوح ناروی ہر سال ان مجلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس وقت خاندیس

کے عظیم شاعر حضرت ایمان بیاولی کے علاوہ برہان پور، جلگاؤں اور دھولیہ سے شاعروں کی ایک بڑی تعداد مجلس مسالمہ میں شریک ہوتی تھی۔ بھساول میں جس جگہ مجلس مسالمہ ہوا کرتی تھی وہ آج بھی حسینی چوک کے نام سے موجود ہے۔ جام محلہ مسجد کے سامنے کا یہ چوک اسی زمانے کی یادگار ہے۔

مشاعروں نے یہاں شعروادب کی آبیاری کی۔ ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ جس کے نتیجہ میں قمر بھساولی، سیف بھساولی، کیف بھساولی، قمر اعظمی، محشر بھساولی اور حسین پائلٹ جیسے شعراء میدان شعر میں آوارد ہوئے۔ اس کے علاوہ اطراف کے مقامات جیسے راویر، رسلپور، یاول، چوپڑا، ارنڈول، جلگاؤں اور جامنیر سے شعراء کی ایک کھیپ سامنے آئی۔

یوپی، بہار اور دہلی سے آنے والے شعراء نے سرزمین خاندیس کو ادب کے حوالے سے کبھی قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔ اسے سنگلاخ زمین کہا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے شعراء کی محنت لگن اور کوششوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ وہ سرزمین ہے جہاں پتھر کے سینہ سے ادب کے چشمے نکالے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے شعراء نے کیا گل بوٹے کھلائے ہیں ملاحظہ کیجئے ؎

میری بربادیاں آئینہ بن گئیں
دیکھ کر لوگ مجھ کو سنورنے لگے (قمر بھساولی)

مشعلیں جل رہی ہیں پانی میں
کوئی آنکھوں میں جھانکتا ہی نہیں (سیف بھساولی)

وہ ترے قرب میں گزرے ہوئے ایام لطیف
زندگی رو کے لپٹ جائے اگر یاد کرے (کیف بھساولی)

مرے دوستوں کی فطرت سر انجمن نہ پوچھو
یہ مجھی کو ڈس رہے ہیں مری آستیں میں پل کر (قمر اعظمی)

ان کا کتا مجھے پیشاب سے نہلاتا ہے
میں ہوں پتھر مجھے آئینہ بتا دے کوئی (حسین پائلٹ)

میں مر بھی گیا لیکن دھڑکا نہ مٹا دل کا
رہ رہ کے اچھلتے ہیں پتھر مری تربت کے (ایمان بیاولی)

ایمان بیاولی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کا یہ شعر ؎

جو عکس گیسو نظر آیا تھا وقت مے نوشی
جھجک کے رکھ دیا ساغر کہ ہے شراب میں سانپ

اعظم گڑھ کے ایک مجرے میں طوائفوں نے گایا تھا اور طوائفیں زبان و ادب کی ایسی شیدائی ہوا کرتی تھیں کہ کسی نامعقول کلام کو سونگھنا تک گوارا نہ کرتی تھیں۔ ایمان کی شاعری پر وہ فدا تھیں۔

بھساول کی سرزمین میں احسان رسولپوری، شمس اعجاز، محشر بھساولی، محشر منظری مصطفی آبادی، مبارک بھساولی، کریم انجم، رشید بھساولی، خوشتر بھساولی، قمر اکبر آبادی، خورشید انجم، صابر پرواز، ذاکر حسین ذاکر اور حامد بھساولی جیسے شعراء کی ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان شعراء میں محشر بھساولی، احسان رسولپوری اور شمس اعجاز کو چھوڑ کر باقی شعراء دوسری اور تیسری صف میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

حالیہ دنوں میں حامد بھساولی جیسے جواں فکر شاعر نے جو ملک گیر شہرت حاصل کی ہے وہ بھساول کی ادبی تاریخ میں یقیناً یاد رکھی جائے گی۔

اس دور کے مشاعرے اردو زبان کی تہذیب کی علامت ہوا کرتے تھے۔ شعرائے کرام بھی اپنی شاعری کے وسیلہ سے عوام کی ذہنی تربیت اور ذوق سخن کی آبیاری بحسن خوبی انجام دیا کرتے تھے۔ اس زمانے کے مشاعروں میں شاعرات کی بھرتی نہیں ہوا کرتی تھی۔ آج مشاعروں کا ماحول اور مشاعروں کی تہذیب یکسر بدل گئی ہے۔ مشاعروں میں قوالی کی شمولیت نے عوام کا ذوق بدل کر رکھ دیا ہے۔ ایسے شاعر بالخصوص شاعرات بھی جن کی پشت پر کسی حقیقی شاعر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اردو محفلوں کی اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ بعض شاعرات اپنا کلام ہندی میں لکھ کر لاتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ آج مشاعرے اردو کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ نہیں بھان متی کا کنبہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

۱۹۶۵ء میں جب میں مستقل طور پر بھساول آیا تو شعرائے کرام کی ایک بھیڑ یہاں موجود تھی۔ ان میں بیشتر سے میری رسم و راہ ضرور تھی لیکن خدا جانے کیوں سیف بھساولی سے میرا جی لگا۔ شاید اس لئے کہ وہ صاف ستھری اور پر کشش شخصیت کے حامل تھے۔ یا شاید اس لئے کہ وہ استاد محترم حضرت ادیب مالیگانوی کے حوالے سے پہلے ہی مجھے جانتے تھے۔ مالیگاؤں سیف صاحب کی اہلیہ کا وطن تھا۔ اکثر وہاں جاتے اور حضرت ادیب مالیگانوی کے سلام و پیام لے کر آتے تھے۔ چند دنوں بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ سیف کو جس شخص کی تلاش تھی وہ انھیں مل گیا ہے بلکہ زیر دام آچکا ہے۔ چنانچہ دوستی

جلد ہی برادرانہ تعلق میں بدل گئی۔ دو گھر ایک ہو گئے۔

سیف صاحب کا گھر البتہ ان کی اہلیہ کی انتہائی نفاست پسندی کی وجہ سے ایسا الف لیلوی پاکیزگی کا نمونہ تھا جس کے دالان تک میں پرندے کو پر مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر خوش قسمتی سے میرا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔ کافی غور وخوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ چونکہ سیف یہاں ریلوے اسپتال کے ملازم تھے۔ اسی لئے ان کی بیگم نے اپنے گھر کو اسپتال بنا رکھا تھا تاکہ وہ اپنے شوہر کو اسی ماحول کا اسیر بنائے رکھے۔ کہیں اور نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے!

سیف صاحب کی اولادوں میں سلمیٰ ناہید، شاہد لطیف، عالیہ شبانہ اور ساجد لطیف سب کے سب بچے زیر تعلیم تھے۔ جو ماں کی تربیت اور خوف کی بناء پر گھر سے اسکول اور واپس گھر کے سوا کہیں نہیں جاتے تھے۔ اور بچوں میں سب سے زیادہ عالیہ شبانہ مجھے پسند تھی۔ یہ گڑیا میری کسی تخلیق کی بیک وقت سنجیدہ قاری اور ناقد تھی۔

ان دنوں میری ایک نظم 'کلکاری' کے عنوان سے ماہنامہ 'بانو' میں شائع ہوئی تھی۔ لفظ کلکاری کو میں نے حزن وملال کے سینس میں لیا تھا۔ جسے دیکھ کر شبانہ نے مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ (کیا بڑوں سے غلطی سرزد نہیں ہوتی؟)

شاہد لطیف کو بچپن ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ یہ شوق بالآخر اسے شاعری اور صحافت کی دہلیز تک لے گیا۔ بمبئی میں کالج کی تعلیم حاصل کی اور وہیں روزنامہ انقلاب سے وابستہ ہوا۔ فخر کی بات ہے کہ آج اس موقر اخبار کی ادارت سنبھالے ہوئے ہے۔ آٹھ سال تو ہو ہی چکے ہیں جبکہ انقلاب کے کسی مدیر نے اتنے دنوں وہاں کی ہوا نہیں کھائی ہے۔ ایک میر اصغر علی جامی کی بات الگ ہے جو سن پچاس سے باسٹھ تک بارہ سال انقلاب کے مدیر رہ چکے ہیں۔

سلمیٰ ناہید کتابوں میں دھنسی رہتی اور ساجد میاں کم پڑھتے دکھائی دیتے۔ شام کے وقت اجازت پا کر کھیلنے نکل جاتے۔ سیف صاحب نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا بہت خیال رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سب بچے آج نہایت خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔

بزم ادب کے کل ہند مشاعروں کا دور ختم ہوا تو مقامی طرحی اور غیر طرحی نشستوں نے ان کی جگہ لے لی۔ سیف بھساولی تواتر کے ساتھ غزلیں کہہ رہے تھے۔ اپنی تازہ غزل لے کر میرے گھر آ جاتے یا کبھی ہم ریلوے جونیئر انسٹی ٹیوٹ کے پارک میں جا بیٹھتے۔ خوب کھل کر گفتگو ہوتی۔ بعض اوقات میں

ان کے کسی شعر سے متفق نہ ہوتا تو وہ خوب ریاضت کرتے۔اس طرح مجھے اور خود کو مطمئن کرنے تک چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔

سیف مجھ سے عمر میں پندرہ سال بڑے تھے اور ایک پختہ سینئر شاعر۔شہر میں لوگ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن شعر پر میری ناپسندیدگی کا انھوں نے کبھی برا نہیں مانا تھا۔یہ بات آج کل کے شاعروں ادیبوں کے لئے یقیناً درس عبرت ہے۔آج حال یہ ہے کہ آپ ذرا منہ کھولیں اور دیکھیں کہ اختلاف میں وہ آپ کی کتنی پیڑھی نیچے اتر آتے ہیں!

وہ کہتے ہیں نا کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔میں یوں تو بنیادی طور پر نثر کا آدمی ہوں لیکن سیف کی صحبت میں رہ کر شعر کی طرف راغب ہوا۔غزل لکھنا مجھے کبھی نہیں آیا۔البتہ آزاد نظم کی سلطنت میں قدم رکھا تو پہلی ہی نظم شمع جیسے موقر جریدے میں شائع ہوئی۔مجھے بڑا حوصلہ ملا۔یہ ۱۹۷۲ء کا زمانہ تھا۔اس کے بعد میں رکا نہیں۔ملک کے ادبی و نیم ادبی رسائل میں چھپتا رہا اور سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔

قلمکار جہاں رہتے ہیں وہاں معاصرانہ چشمکیں ہوتی ہی ہیں۔خدا جانے کس کی وجہ سے قمر اور سیف ایسے ہم نوالہ ساتھیوں میں ٹھن گئی اور یہاں کے ادیب و شاعر دو دھڑوں میں منقسم ہو گئے۔ایک بڑی تعداد قمر بھساولی کے خیمہ میں چلی گئی جبکہ سیف صاحب کے پکش میں مبارک اور میں رہ گئے۔اس کے بعد مبارک نے بھی بغاوت کردی اور چونکہ میں سیف پر پختہ ایمان لے آیا تھا اس لئے کبھی بے ایمانی نہیں کی۔اس کے نتیجہ میں قمر گروپ کے نزدیک معتوب رہا۔وہ دور آج کی طرح اخلاقی طور پر اتنا گرا ہوا نہیں تھا۔اس لئے ہم کسی چوراہے، ہوٹل اور ادبی نشستوں میں ایک دوسرے کے ساتھ خوش دلی سے ہی ملا کرتے تھے۔یہ اور بات ہے کہ تخلیق کے معاملہ میں اپنے کو برتر سمجھتے تھے۔

اس دوران قمر بھساولی کا مجموعہ کلام 'آواز' کے نام سے منظر عام پر آیا۔سارے بھساول میں دھوم مچ گئی۔کتاب میں شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی اور ماہر القادری جیسی نابغۂ روزگار شخصیتوں کی آراء شامل تھیں اور یہ کہ قمر صاحب کی کتاب کا اجراء عظیم الشان طریقہ سے عمل میں آیا تھا۔

سیف صاحب نے اگرچہ زبان سے کچھ نہ کہا لیکن اپنی کتاب آنے کی خواہش کبھی کبھی دبی زبان سے وہ کر دیا کرتے تھے لیکن اپنی قلیل تنخواہ اور بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات، وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔میں خود بھی ان کے لئے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ بھساول میں جعفر پرویز نام کے ایک بڑے تاجر ہوا کرتے تھے۔ان کا شمار ادب نوازوں میں ہوا کرتا تھا۔ایک نوجوان شاعر اشعر ملیح آبادی کو لے کر انھوں نے ایک بہت ہی میعاری ادبی رسالہ 'ساحل' کے نام سے نکالا تھا۔اشعر یہاں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں آئے تھے۔ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر جعفر نے انھیں اپنے گھر رکھ لیا تھا مگر اشعر ملیح آبادی کی ناگہانی موت (عمر ۲۴ رسال) کی وجہ سے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔جعفر پرویز قمر اور سیف کے قریبی دوست تھے۔ان کے لئے ہمیشہ اپنا ہاتھ کھلا رکھتے تھے مگر آزادی کے بعد وہ بمبئی منتقل ہو گئے اور ایسے روپوش ہوئے کہ کسی کو ان کا پتہ نہ چلا۔

آخر ستر اسی کی دہائی میں ان کا سراغ ملا تو سیف صاحب کے ہمراہ میں بھی ان سے ملنے گیا۔بمبئی کے جیل روڈ میں واقع خدام الزائرین نام کا ادارہ وہ چلا رہے تھے۔ہمارا والہانہ استقبال کیا۔کتاب کی تجویز پیش کی گئی تو فوراً قبول کرلیا۔بڑی اونچی سوچ کے انسان تھے۔کہا کتاب پر ظ انصاری سے رائے لکھوالوں گا۔تم اپنے طور پر ایک اور نام ڈھونڈ لو۔کتاب اعلیٰ پیمانے پر شائع ہوگی۔جو سیف کے شایان شان ہوگی۔

دلوں میں شادمانی لئے ہم بھساول لوٹ آئے۔کتاب کا نام 'شگفت گل' طے ہوا اور ہم کام سے لگ گئے۔دہلی کے ایک معروف ناقد ڈاکٹر عنوان چشتی سے میرے مراسم تھے۔میں نے شگفت گل کے لئے ان کی رائے حاصل کرلی۔جعفر نے ظ انصاری کی رائے بھجوادی۔مگر جعفر کی ایک بار اور گم شدگی نے ہمارے ہوش اڑادیے۔مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔آخر مہاراشٹر اردو اکادمی کے مالی تعاون سے کتاب منظر عام پر آئی۔ظاہر ہے غزلوں کی کتابت سے لے کر اکادمی سے مراسلت تک میری سخت محنت کام آئی۔اسی کو دیکھتے ہوئے سیف صاحب نے یہ شعر کہا تھا؎

منزل شگفت گل سہل ہوگئی مجھ کو

تیرا ساتھ تھا ورنہ تھک کے بیٹھ جاتا میں

ازراہ محبت سیف اپنا مجموعہ کلام میرے نام معنون کرنا چاہتے تھے لیکن ایسا نہ ہوا۔مصلحتاً چند نام اور شامل کرنے پڑے جس کی وجہ سے مذکورہ شعر کا ثانی مصرعہ یوں کرنا پڑا

ان کا ساتھ تھا ورنہ تھک کے بیٹھ جاتا میں

بہر حال کتاب چھپی۔شاندار اجراء عمل میں آیا اور فخر کی بات یہ رہی کہ سیف صاحب کو پانچ ہزار

کا کیسۂ زر پیش کیا گیا جو ایک گرانقدر اعزاز تھا۔

سیف بھساولی نہ تو مذہب کے پرچارک تھے نہ سماج سدھارک اور نہ سیاست ان کا مذہب تھا۔ وہ نرے شاعر تھے اور شاعری ان کا ایمان تھا۔ اسی تناظر میں انھیں دیکھا جانا چاہئے۔ اور اسی سالم شکل میں ان کو آئندہ نسلوں کے روبرو کر دیا جانا چاہئے۔

سیف صاحب نے اپنے فکر وفن کے گل بوٹے اسی جگہ کھلائے ہیں جسے بالاتفاق شعروادب کی بنجر اور سنگلاخ زمین کہا جاتا رہا ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی شاعری کو دور و نزدیک متعارف کرایا ہے۔ ان کی آواز ایک حقیقی شاعری کی پہچان کا وصف بن چکی تھی۔ وہ نامساعد حالات کے نہ تو شکوہ سنج رہے ہیں اور نہ بے رحمیٔ ماحول کے شاکی ہی رہے۔ باد مخالف کے منہ زور تھپیڑے ان کے چراغ فکر کی لو کو مدھم نہیں کر سکے اور نہ زمانے کی کڑی دھوپ ہی ان کے چہرۂ فکر کا رنگ اڑا سکی۔ اپنی ابتدائے شاعری میں وہ جس حوصلہ، جرأت اور مضبوط عزم کے ساتھ شوق کی طرف گامزن ہوئے تھے اسی حوصلہ اور قوت کے ساتھ دیوانہ وار آگے بڑھتے رہے۔ آبلہ پائی کے خوف سے بے پروا ہو کر ادب کے خارزاروں میں اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔ پھر ایسا مقام بھی آیا جہاں شاعری ان کے لئے وجۂ رسوائی بن گئی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

پیچھے پیچھے ہے تیرا دیوانہ
آگے آگے چلی ہے رسوائی

منزل سفر میں شاعر کی رسوائی بھی اس کے لئے ایک خراج ہے جو شاعر کی پہچان اور حیثیت کا معیار مقرر کرتی ہے۔ غالب شاعر نہ ہوتے تو زمانے کی دہلیز پر رسوا کیوں ہوئے ہوتے۔ نیک نامی کی یہ رسوائی شاعر کو گمنامی کی اندھی تاریکی سے نکال کر شہرت کے اجالوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ بنجر زمین کے اس شاعر کو شہرت کے اجالے بھی نصیب ہوئے اور چاہتوں کے خزینے بھی۔

سیف بھساولی نہ صرف میرے عزیز دوست تھے بلکہ ہم جلیس بھی تھے۔ اسی بناء پر پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کی کہکشاں تک پہنچنے میں تمام تر ان کی ریاضت فکر اور شعوری کوشش ہی کو دخل نہیں ہے بلکہ اپنی کہکشانی فکر سے انہوں نے شاعری کی مانگ میں نور بھرا ہے۔ ایسی اچھی شاعری جو اس جگہ مارتی ہے جہاں پینے کو ایک قطرہ پانی نہیں ملتا۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ابھی کہاں ہے شعور جلوہ ابھی نظر معتبر نہیں ہے

شگفتِ گل پر نظر ہے سب کی شکست دل کی خبر نہیں ہے

ہمیں نے شب ہائے زندگی میں جلا کے دل اپنا نور بانٹا

ستم ہے کیوں جلوۂ سحر کا ہمارے گھر میں گزر نہیں ہے

لپٹے ہوئے ہیں ذہن سے سائے چنار کے

ہم بھی گزار آئے ہیں کچھ دن بہار کے

لہو ٹپکے نہ جب تک فکر سے دل خوں نہ ہوجائے

غزل میں سیف صاحب دل کشی مشکل سے آئی ہے

کیوں آج معطر ہے خوشبو سے ہر اک جھونکا

کیا موجِ صبا تو نے وہ زلف سنواری ہے

اسلوب کی انفرادیت اور اظہار کی ندرت صرف ترقی پسندوں کے ہاں نہیں ہے بلکہ سیف جیسے کلاسکی شاعر کے ہاں بھی ہوتی ہے۔جن کے اشعار جدیدیت اور ترقی پسندی کو آئینہ دکھانے کے لئے کافی ہیں۔سیف کے متذکرہ بالا اشعار دل کی باریک پرتوں تک میں اتر جانے کی تاثیر رکھتے ہیں۔

سیف بھساولی اپنی زندگی میں جس قدر محتاط اور مخلص رہے ان کی شاعری میں بھی احتیاط اور اخلاص کا رنگ اسی قدر جھلکتا ہے۔سوز و گداز،غم و انبساط اور کرب و راحت کا امتزاج ایک اعتدال کے ساتھ ان کی شاعری میں ملتا ہے۔حد سے تجاوز ان کا شیوہ نہیں ہے کہتے ہیں ؎

میں اپنے طور پر ہوں سیف اعتدال پسند

مرا مذاق مرے ہم سخن سمجھتے ہیں

شاعری میں اعتدال پسندی نے سیف کو وہ انفرادیت عطا کی ہے جسے ان کے ہم عصر نہ صرف محسوس کرتے تھے بلکہ معترف بھی تھے اور اعتراف و قبولیت کا درجہ کسی شاعر کو اپنے فن سے حقیقی لگاؤ فکری ریاضت اور ایماندارانہ دیانت کے بعد ہی ملتا ہے۔بلاشبہ اعتدال کو جنم دینے والی ریاضت بھی فکری جہتوں کی تلاش میں شاعر سے اپنا لہو مانگتی ہے۔انہیں کی زبانی ؎

لہو لہان ہے چہرہ مرے تفکر کا

اس آئینہ کو مرے غم کا ترجماں سمجھو

سیف بھساولی نے اگرچہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ ایک غزل گو کی حیثیت ہی سے

جانے جاتے ہیں۔غزل ان کی محبوب صنف سخن ہے۔جس کے گیسو سنوارنے میں زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کیا ہے۔غزل بھی ایسی جس کے ڈانڈے کلاسکی ادب سے ملتے ہیں۔ادب کا یہ رویہ انھیں اپنے اساتذہ سے ملا ہے اور یہی رویہ جدیدیت سے آنکھیں ملاتا ہوا ہر گام آگے بڑھتا چلا گیا ہے۔

بہر حال سیف نے اپنے لئے جو راہ متعین کی تھی وہ انہیں شاعری کے اس گل کدے تک لے گئی جہاں ایک نرم و نازک شعر کی خوشبو قاری کے مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔شگفتہ گل کی شاعری اسی آئینہ خیال کا خوبصورت عکس ہے۔

سیف بھساولی آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ اپنی شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم شگفتہ گل کو ایک ذمہ دار قاری کی حیثیت سے ذرا چھو کر دیکھ لیا کریں اور اپنی نسل کو بھی یہ موقع فراہم کریں۔

اپنی یادوں کا یہ فسانہ اگرچہ یہیں اختتام کو پہنچ گیا ہے لیکن کچھ ان کہی باتوں کا وہ بھی ایک فسانہ تھا جو سیف کی زندگی میں آشکارا نہ ہو سکا۔ایک پھانس بن کر آج بھی دل میں چبھتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔

اللہ مغفرت کرے۔آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

☆☆☆☆
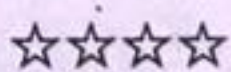
مجاہدؔ جلگانوی: وہ مجاہد ہاں وہی شاعرِ درویش صفت

مضمون نگار : قاضی مشتاق احمد

تاریخ پیدائش : ۲۰/مارچ ۱۹۴۰ء

تعلیم : بی اے (معاشیات)

پیشہ : ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈائریکٹر محکمہ سماجی بہبود، مہاراشٹر

مطبوعات : سہمی ہوئی بہار، جس نے یورپ نہیں دیکھا، اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک، اردو شاعری کل آج اور ہمیشہ، خوشبو جیسے لوگ، آسماں اور بھی ہیں، خوشبو کا سفر، درد کا پیوند

پتا : B-6, Revenue Society,ICS Colony, Ganesh Khind, Pune-7

موبائیل : 09422317129

مجاہدؔ جلگانوی اپنے دور کے ایک ممتاز شاعر تھے۔ اپنی شاعری میں روزمرہ استعمال ہونے والے الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کرتے تھے۔ وہ اپنی بات کو سیدھے سادے عام فہم اور سہل ممتنع میں کہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اپنی شاعری میں وہ تشبیہات اور استعارات کا جلوہ بکھیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمارے دور میں مجاہد جلگانوی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ وہ ادبی مورخین کی بے اعتنائیوں کے شکار ہوئے۔ ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس پر سردار جعفری، مجروح سلطانپوری اور ساحر لدھیانوی جیسے شعراء چھائے ہوئے تھے۔ یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ اگر اس زمانے میں ان کا شعری مجموعہ شائع ہوجاتا تو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا صحیح معنوں میں اعتراف ہوتا۔ مجاہد نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا سردار جعفری، مجروح اور ساحر جیسے بڑے شاعر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے اور وہ بھی زبردست طریقے سے۔ مجاہد بھی اپنے دور کے بڑے شعراء سے متاثر نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان کا کلام کسی بھی لحاظ سے ان شعراء کے کلام سے کم تر نہیں۔ مگر کیا کیجئے فن اپنی جگہ ہے اور قبول عام کچھ اور شے ہے۔ مجاہد کی نظم ''ارتقاء'' ترقی پسندانہ افکار

سے ہم آہنگ ہے۔ بمبئی کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں انہوں نے چاند پر جانے والوں کے نام یہ نظم پڑھی تھی اور مشاعرہ کے صدر سردار جعفری نے نہ صرف داد دی تھی بلکہ ترقی پسند تحریک سے جڑ جانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید ترقی پسند مشہور شعراء کی فہرست میں مجاہدؔ کا نام بھی شامل ہو جاتا ۔مجاہدؔ کو اپنے وطن عزیز جلگاؤں سے محبت تھی اس لئے انہوں نے وطن سے دور جانا پسند نہیں کیا اور وہیں پیوندِ خاک بھی ہوئے۔

جفائیں تم کو مبارک وفائیں ہم کو عزیز
ہم اپنا کام کریں گے تم اپنا کام کرو

تنہائی کے زہر کو پی کر قطرہ قطرہ مرتا ہے
گیان سے پہلے ہر اک گوتم ان راہوں سے گزرتا ہے

مجاہدؔ آہوں کو نغموں میں ڈھال لیتا ہے
کہ اس نے پالیا مرگ و حیات کا مفہوم

دل کی رگوں سے خون تمنا نچوڑ کے
آنسو گرا رہا ہوں جگہ چھوڑ چھوڑ کے

اتنا لہو لہان کرو مجھ کو دوستو !
کہ میرے پیرہن کی زمانہ مثال دے

یہ وہ اشعار ہیں کہ کئی برس گزر جانے کے باوجود بھی مقبول ہیں۔ مجاہدؔ کی اپنے ہم عصر شعراء میں اس لئے بھی انفرادی حیثیت ہے کہ انہوں نے بڑی رواں دواں اور شوخ غزلیں بھی کہی ہیں۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کی صفت لفظی و معنوی کو بھی برتا ہے۔ فرماتے ہیں:

تری زلفوں کا میں اسیر ہوں اسی چھاؤں کا میں فقیر ہوں
ترے گیسوؤں کی یہ قید ہی مرے حق میں رشکِ نجات ہے

ترے حسن اور مرے عشق میں یہی فرق ہے اے نگارِ جاں
ترا حسن روبہ زوال ہے ،مری عاشقی کو ثبات ہے

آج ہے اک مصرعِ تنہا کی صورت زندگی
تم ملو تو شعر کی تکمیل ہو جاؤں گا میں

سنبھلنا ان سے مجاہدؔ کہ لوگ تیرے لیے

دلوں میں آگ ،لبوں پر گلاب رکھتے ہیں
پرانے زخم یادوں کے شبستانوں میں رکھتا ہے
وہ مرجھائے ہوئے پھولوں کو گلدانوں میں رکھتا ہے

میری تقدیر کی سوغات مری ویرانی
تیری زلفوں کے گلابوں میں نہ کانٹے بھر دے
میرے انفاس سے لپٹی ہوئی حالات کی گرد
تیرے عارض کے اجالوں کو نہ میلا کر دے

مجاہدؔ جلگانوی ۳۱۹۳۲ء میں جنمے یعنی ترقی پسند تحریک اور مجاہدؔ کا ساتھ ساتھ جنم ہوا۔اس لئے غزل کی بجائے نظم سے ان کی شاعری کا آغاز یقینی تھا۔حالانکہ ان کی سات پشتوں میں کسی نے شاعری نہیں کی تھی بلکہ شاعری ان کے ننھیال کی دین تھی۔مجاہدؔ کی مشہور نظموں میں سے 'ارتقاء' چاند پر جانے والوں کے نام۔اس کا ابتدائی بند ہے:

ہے زیست ،سیر رخ و الم یہ بات نہیں تو چپ کیوں ہو
جینے سے گریزاں جینے کے حالات نہیں تو چپ کیوں ہو
تنویر کی محفل میں رقص ظلمات نہیں تو چپ کیوں ہو
ازراہِ کرم کچھ تو بولو دانشمندو ،اے فرزانو!

۱۳رجولائی ۱۹۸۱ء کو مجاہدؔ کے وطن عزیز میں ہونے والے فساد سے متاثر ہوکر انہوں نے ''شعلوں کا سفر'' لکھی تھی۔ملاحظہ فرمائیں:

شعلوں کا سفر

جب زخم دھواں دیں گے تو خنجر بھی جلے گا
تڑپوں گا اگر میں تو ستمگر بھی جلے گا
تو میرا پروسی ہے مرا گھر نہ جلا دیکھ
یہ آگ بڑھے گی تو تیرا گھر بھی جلے گا
شعلوں کو ہوا دیں گے اگر قافلے والے
رہزن بھی جھلس جائے گا رہبر بھی جلے گا
پہنچے گا اگر قبر کے پہلو میں شکورا

شمشان کی آغوش میں شنکر بھی جلے گا
توڑے نہ کوئی مسجد و مندر کو مجاہدؔ
یہ آئینے ٹوٹیں گے تو پتھر بھی جلے گا

اسی رنگ کے چند اور اشعار:

تھا تقاضائے خودی جاں سے گزر جانا پڑا
مقبروں کے شہر میں زندوں کو مر جانا پڑا
خود نگار ذات کی تشکیل مرگِ ذات ہے
جب کھلا وہ گل تو خوشبو کو بکھر جانا پڑا
اُس مسیحا نے بھی زخموں کی پذیرائی نہ کی
نادلِ نخواستہ قاتل کے گھر جانا پڑا
عالم انسانیت کی بربریت دیکھ کر
اپنی ہی پرچھائیوں سے مجھکو ڈر جانا پڑا
یہ حقیقت ہے کہ کربِ زندگی میرے لیے
آگ کا دریا تھا لیکن پار کر جانا پڑا
جب مجاہدؔ سرخیٔ روئے غزل کچھ کم ہوئی
حسن کی رگ رگ میں لہو بن کر اتر جانا پڑا

ایسا نہیں کہ مجاہدؔ بہت سنجیدہ قسم کے انسان تھے۔ اپنی شوخیوں اور شرارتوں کی وجہ سے وہ خاصے بدنام تھے۔ اپنی بذلہ سنجیوں اور حاضر دماغی کی وجہ سے وہ محفلوں کی جان تھے۔ مشاعروں میں جاتے تو آتے ہی چھا جاتے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشاعرہ میں مجاہدؔ مدعو تھے۔ بیشتر شعراء فسادات کے تعلق سے اشتعال انگیز اشعار سنا رہے تھے اور جواباً سامعین "نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس ماحول میں مجاہد کو دعوت سخن دی گئی اور مجاہدؔ نے بغیر کسی تمہید کے مشاعرہ کے بے ہنگم ماحول میں نعت شریف شروع کردی اور مشاعرہ کا ماحول بدل گیا۔ مشاعرہ کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

(راوی: احمد نسیم مالیگانوی اور عبدالغفار ملک)

مجاہدؔ کی حاضر دماغی اور ظریفانہ طبیعت کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ وہ سائیکل پر اپنے دوست اسیر برہانپوری کے ساتھ ڈبل سیٹ جارہے تھے۔ راستہ میں ایک پولیس والے نے انہیں دیکھ لیا اور ان

سے چالان کرنے کے لیے اپنا نام پوچھا۔ مجاہدؔ نے نہایت متانت کے ساتھ اپنا نام بتایا ''متزلزل الحسین اعتماد الدولہ'' بار بار دوہرانے کے باوجود پولیس کانسٹیبل وہ نام نہ لکھ پایا اور تنگ آکر کہا ''بھئی! معاف کرو اور جاؤ۔''

مجاہدؔ کے بچپن کے دوست سحر جلگانوی کے بقول ''مجاہد کی شاعری بالخصوص غزل کے تین ادوار پر محیط ہے۔ روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت ہر دور میں مجاہدؔ کی غزل کا بانکپن اپنے ہم عصروں سے تغزل آمیز لفظیات اور منفرد اسلوب کی وجہ سے قدرے مختلف رہا ہے۔ غزل مجاہدؔ کے لیے اور مجاہدؔ غزل کے لیے پیدا ہوا تھا۔ مجاہدؔ کی ماں نے دودھ کے ساتھ ساتھ اسے غزل کا مشروب بھی پلایا تھا۔ مجاہدؔ پیدائشی فطری شاعر تھا۔ عروسِ غزل کی کنگھی چوٹی اور بناؤ سنگھار میں مجاہد کا بڑا حصہ رہا ہے۔ مجاہد نے ہر دور کے جغادریوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نیزہ بکف غزل سے گفتگو کی ہے۔

روایتی غزل کے چند اشعار:

ان کی گلی میں پہنچے تو بدنام ہوگئے
ہم بھی تھے نیک نام ابھی کل کی بات ہے

جفائیں تم کو مبارک ، وفائیں ہم کو عزیز
ہم اپنا کام کریں گے تم اپنا کام کرو

اپنے جلوؤں کو نگاہوں کے حوالے کردو
رحمتِ حسن گناہوں کے حوالے کردو

مجاہدؔ جلگانوی ایک فطری شاعر ، اچھے ناظم مشاعرہ ، بے لوث سماجی خدمت گذار ، بالغ نظر سیاستداں اور بے باک صحافی تھے۔ انہوں نے جلگاؤں سے ''نقیب'' نامی ایک اردو ہفت روزہ جاری کیا تھا بعد میں اس کا نام بدل کر 'یاقوت' کردیا گیا۔ یہ اخبار حالاتِ حاضرہ پر تبصروں، چٹ پٹی خبروں، مستقل کالموں کی وجہ سے بہت مقبول ہوگیا۔ مئی ۱۹۷۰ء میں جلگاؤں کے فرقہ وارانہ فسادات مجاہدؔ کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئے۔ مجاہدؔ جس محلہ میں رہتے تھے وہ بدنام علاقہ ''کاٹیا فیل'' فرقہ پرستوں کے نشانہ پر تھا۔ اور پھر وہی ہوا جو عموماً فسادات میں ہوتا ہے۔ ''برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر''۔ محلے کے کئی بے قصور نوجوان پولیس کی لاٹھیوں اور گرفتاریوں کے شکار ہوئے۔ عبد الغفار ملک کے والد عبدالرزاق ملک مشتعل ہجوم سے تن تنہا مقابلہ کرتے ہوئے لہو میں نہا گئے۔ عبد الرزاق ملک کی دلیری محلہ کے نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی اور نوجوانوں میں بیداری کی لہر

دوڑ گئی۔ مجاہدؔ نے اپنے مخصوص انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔

عقابی روح پھونکی ہم نے پژمردہ جوانوں میں
ہماری تاریخ سب سے الگ ہے داستانوں میں
محلے کے مورخ جب کبھی تاریخ لکھیں گے
ہمارے ناموں کے پرچم کھلیں گے آسمانوں میں

مجاہدؔ نے انتظامیہ اور مظلومین کے درمیان ایک خوشگوار ماحول پیدا کر کے مسائل کو سلجھانے میں اہم رول ادا کیا۔ خصوصاً دل دہلا دینے والا ہاجرہ بی کے چار معصوم بچوں سمیت ۴۳ / بے گناہوں کو زندہ جلا دینے کا وحشیانہ سانحہ۔ مجاہدؔ نے بی بی سی لندن تک ہاجرہ بی کی آواز پہنچا کر ہاجرہ بی کو انصاف دلایا۔ بی بی سی لندن کے حوالے سے مادن کمیشن نے استفادہ کیا اور اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں ۱۹۷۰ء کے فسادات کو ''مسلم کش فساد'' قرار دیا اور یہ بھی لکھا کہ یہ ایک مخصوص طبقہ کو مالی اعتبار سے برباد کرنے کی منصوبہ بند سازش تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ مجاہدؔ شہزادہ نکہت شاعر آوارہ مزاج تھا۔ خوش پیراہی و خوش سلیقگی، نفاست پسندی اس کی پہچان تھی۔ بقول صاحبزادی تحسین فاطمہ ''جس گلی سے گزر جاتے وہ گلی گل و گلزار ہو جاتی تھی۔ لوگ باگ سمجھ جاتے کہ ابھی ابھی ادھر سے مجاہدؔ کا گزر ہوا ہے۔

موسم زرد کو سر سبز بنانے والا
ہر نئی رت میں نئے پھول کھلانے والا
جس نے صحرا کو چمن زار بنا ڈالا ہے
اس سے ملیے وہ ہے خوشبو کے گھرانے والا

وقت کی ستم ظریفی کہ فرقہ وارانہ فسادات کے بعد مجاہدؔ کے نصیب میں اپنے اکلوتے بیٹے ڈاکٹر تنویر عالم کی جواں مرگی بھی لکھی تھی۔ دنیا کا سب سے بڑا بوجھ باپ کے کندھے پر نوجوان بیٹے کا جنازہ ہوتا ہے۔ مجاہدؔ نے وہ بوجھ بھی اٹھایا لیکن اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔

موت ایک مستقل حیات سہی
لیکن اچھی نہیں جوانی میں

اپنے جواں سال بیٹے ڈاکٹر تنویر عالم کے ناگہانی سانحہ ارتحال سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے خون دل سے یہ اشعار لکھے:

وہ برق غم جو ٹوٹ پڑی میری جان پر
ہوجاتی پاش پاش جو گرتی چٹان پر
اک چاند جس کو شام ڈھلے رات لے اڑی
تنویر اپنی چھوڑ گیا آسمان پر
پل بھر میں تُو نکل گیا افلاک سے پرے
رفتار بھی حیران ہے تیری اڑان پر
تاریکیوں میں ڈوب گیا کیوں تمام شہر
شام اجل تو آئی تھی میرے مکان پر
جس سے لرز اٹھے تھے بستی کے بام و در
اک ایسا قہر ٹوٹا مرے سائبان پر
دل سوزِ غم تو سہہ گیا پر اسکی آنچ سے
چھالے دمک رہے ہیں ابھی تک زبان پر
ترسیں گے اسکے عکس درخشاں کو آئینے
نازاں تمام شہر تھا جس نوجوان پر
یوں خدمتِ عوام میں ڈوبا ہوا تھا وہ
دیکھی ہوا نہ ڈالی نظر بادبان پر
گو لاکھ کوششیں کی مجاہدؔ پہ آخرش
غالب یقین ہوگیا وہم و گمان پر

موت سے چند روز پہلے مجاہدؔ نے شاعری سے پہلوتہی کر کے اللہ سے اپنا رشتہ مستحکم کرلیا تھا۔ رات رات بھر تزکیۂ نفس کے ساتھ مراقبے میں بیٹھ کر رو رو کر توبہ و استغفار کیا کرتے تھے۔ طویل ترسجدوں کی کثرت اور اشک وندامت سے جانماز بھیگ جایا کرتی تھی۔ اور اس حالت میں اسے موت نے ہم سے جدا کردیا۔ (راوی: تحسین فاطمہ)

مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ جلگاؤں کی اقرا ایجوکیشن سوسائٹی نے ایک مستقل میموریل ٹرافی ڈاکٹر تنورِ عالم مجاہد جلگانوی کے نام منسوب کر کے ان دونوں فنکاروں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ عبد الرزاق سردار ملک فاؤنڈیشن اور انجمن تعلیم المسلمین اینگلو اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج کے مالی تعاون

سے مجاہدؔ جالگانوی کا مجموعہ کلام ''تنویر خیال'' (سن اشاعت: جنوری ۲۰۰۸ء) اور اب خاندیش کی ایسی شخصیات کے حالات زندگی مرتب کر کے شائع کیے جا رہے ہیں جنھوں نے اس علاقہ میں خصوصاً ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی ہے۔ اس سے نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی واقف ہو جائے گی اور ان کے کارنامے بھی محفوظ ہو جائیں گے۔

پرانے زخم یادوں کے شبستانوں میں رکھتا ہے
وہ مرجھائے ہوئے پھولوں کو گلدانوں میں رکھتا ہے

میں نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالکریم سالار سے کہا کہ اس سلسلہ کو صرف ''یادرفتگاں'' تک ہی محدود نہیں رکھا جائے بلکہ اس سفر میں ان خدمت گذاران اردو کو بھی یاد رکھا جائے جن کا تعلق علاقہ خاندیش سے ہے، جو خوش قسمتی سے بقید حیات ہیں اور ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

آج کے دور میں جینا بھی مجاہدؔ فن ہے
تم ہو فنکار مرے یار تو مر مت جانا

''قابل رحم ہے وہ قوم جو جنازوں کے ہجوم کے سوا کہیں اور اپنی آواز بلند کرتی اور ماضی کی یادوں کے سوا اس کے پاس فخر کرنے کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔'' (خلیل جبران)

☆☆☆☆

فخرِ خاندیش مرحوم اطہرؔ جلگانوی

(مرحوم اکبر رحمانی کے مضمون سے ماخوذ)

استادالشعراء حضرت اطہرؔ جلگانوی خاندیش کے ان ممتاز شعراء میں تھے جن کے دم سے خاندیش میں بالخصوص مشرقی خاندیش میں اردو شاعری کے چرچے تھے۔ پورے خاندیش میں ان کے بے شمار شاگرد تھے۔ پھر ان شاگردوں کے بھی کئی شاگرد تھے۔ غرض مشرقی خاندیش میں پہلی دہائی سے پانچویں دہائی یعنی آزادی سے قبل کے دور کو ''دورِ اطہرؔ'' کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

آپ کا اصل نام غلام مصطفیٰ اور اطہرؔ تخلص تھا۔ رستم خاں کے نام سے بھی مشہور تھے۔ والد کا نام اعتبار خان تھا جو محکمۂ پولیس میں جمعدار تھے۔ ان کے جدامجد جن کا پیشہ سپہ گری تھا افغانستان سے روزگار کی تلاش میں آگرہ آئے تھے۔ غدر کے ہنگامے کے دوران یا اس کے چند ماہ بعد یہ خاندان آگرہ سے ہجرت کر کے دھولیہ کے قریب قصبہ سونگیر میں آکر آباد ہوا۔ یہیں اطہرؔ کے والد نے محکمۂ پولیس میں ملازمت اختیار کی تھی۔ جب ان کا تبادلہ جلگاؤں ہوا تو وہ پورے خاندان کے ساتھ یہاں آکر بس گئے۔ جلگاؤں ہی میں ۱۸۸۴ء میں اطہرؔ جلگانوی پیدا ہوئے۔ آپ نے کسی مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اردو، فارسی اور عربی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی تھی۔

اطہرؔ جلگانوی کو بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا۔ گھر میں چھوٹا سا کتب خانہ تھا۔ اخبارات، ادبی رسائل اور شعری گلدستے بھی آتے تھے۔ اردو کے ممتاز شعراء کے دیوان بھی تھے۔ ان رسائل و کتابوں کے مطالعہ کی وجہ سے اطہرؔ کو شعروسخن سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ طبیعت موزوں تھی اس لیے کم عمری میں شعر بھی کہنے لگے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ انہوں نے شعر گوئی کا آغاز کب کیا۔ شاعری سے دلچسپی کی وجہ یہ بھی رہی ہوگی کہ اطہرؔ کے زمانے میں شاعروں کی بڑی مدد کی جاتی تھی۔ انہیں سوسائٹی میں عزت کا مقام حاصل تھا۔ جگہ جگہ محرم کی مجالس اور میلادالنبی کی تقریبات ہوتی تھیں۔ مرثیے، نوحے، سلام اور نعتیں پڑھی جاتی تھیں اور بڑی تعداد میں عوام وخواص ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ کسی کے مرنے پر چہلم کی جو تقریب ہوتی تھی اس میں نعتیہ کلام اور سلام پڑھا جاتا تھا۔ ایسے شاعرانہ ماحول کا

اطہر کی طبیعت پر اثر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ اپنے پیشہ آبا سپہ گری چھوڑ کر شعر و سخن کی طرف راغب ہوئے اور اس فن میں ایسا کمال دکھایا کہ استاد الشعراء کہلائے۔

اطہرؔ جلگانوی نے پہلے اس دور کے مشہور شاعر کوثرؔ خیر آبادی کی خدمت میں اصلاح کی درخواست بھیجی مگر بعد میں انہوں نے مشہور نعت گو محمد باقر حمید لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔

'ریاضِ نورس' آپ کا پہلا مجموعہ کلام تھا۔ اطہرؔ جلگانوی ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ مخلص سماجی کارکن بھی تھے۔ خاندیش کی چند تعلیمی و سماجی انجمنوں سے آپ وابستہ تھے۔ جارج انجمن اسلام کے کچھ عرصہ سیکریٹری رہے۔ اس طرح انجمن تعلیم المسلمین کے بھی عہدہ دار تھے۔ ضلع کلکٹر امین الدین صاحب نے مسلم ہاسٹل کی تعمیر کے لیے چندہ جمع کرنے کی جو مہم شروع کی تھی رستم خان اطہرؔ اس کمیٹی کے خازن اور سیکریٹری تھے۔ ضلع کلکٹر جو بھی چندہ وصول کرتے تھے اطہرؔ صاحب کے پاس بھیج دیا جاتا۔ انہوں نے خاندیش کے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح کی کوشش کی۔

اطہرؔ جلگانوی ایک نیشنلسٹ رہنما تھے۔ وہ کانگریس کی پالیسیوں کی حمایت بھی کرتے تھے۔ میونسپل اردو اسکول نمبر ۱۰ کے پاس ان کا ذاتی مکان تھا۔ وہاں اکثر دوست احباب جمع ہوتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی مخالفت بھی کی تھی۔ ۳۰ جولائی ۱۹۴۹ء کو جلگاؤں میں سپرد خاک ہوئے۔

بڑی محنت کے باوجود اطہرؔ جلگانوی کا کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔ ان کے پوتے صدیق خان کہتے ہیں کہ کلامِ اطہرؔ کے علاوہ سلامِ اطہرؔ، غمِ محرم، دیوانِ اطہرؔ اور رباعیات اطہرؔ یہ مجموعے بھی ان کی زندگی میں شائع ہوچکے تھے۔ یہ سب ہمارے یہاں تھے لیکن ۱۹۷۰ء کے فساد میں سب خاک ہوگئے۔ غمِ محرم کا ذکر جلوۂ یار میرٹھ میں ملتا ہے لیکن دیگر مجموعوں کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ (مرحوم اکبر رحمانی)

نعت گوئی میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ قدردانانِ سخن کے اصرار پر چند قصائد ایک جگہ جمع کیے اور اس کتاب کا نام ریاضِ نورس رکھا تھا۔ امیر مینائی کے شاگرد آثم بریلوی اپنے قطعاتِ تاریخ میں اطہرؔ اور ان کے کلام کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

لکھا اطہرؔ نے احمدؐ کی ثناء میں
وہ دیواں جس کے واصف ہیں سخنور
بہاروں پر ہے باغ نعت اطہر
ہر اک مضمون ہے اس کا گلِ تر

جسے سن سن کے ہو سب محو مومن
ہے ایسا پُر اثر وصفِ پیمبر
لکھی آثم نے یہ تاریخ اس کی
چھپا لبِ نعت میں دیواں یہ بہتر

اطہرؔ کے نعتیہ کلام کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

میں مدح خوانِ رتبۂ خیر البشرؐ ہوا
مرغوب دل کو نعتِ نبیؐ کا ہنر ہوا
سر دھن رہا ہوں بس اسی اندوہ میں مدام
اب تک درِ نبیؐ پہ نہ اپنا گزر ہوا

جس جگہ محفل میلاد کا چرچا دیکھا
رحمتِ حق سے وہاں نور برستا دیکھا
قافلہ کوئی مدینے کو جو جاتا دیکھا
دلِ مشتاق کو پہلو میں تڑپتا دیکھا
بزم میلاد میں یہ سن کے قصیدہ اطہرؔ
غُل ہر ایک سمت بپا صلِّ علیٰ کا دیکھا

اطہرؔ کی نعتیں اور غزلیں ہندوستان کے معیاری رسائل اور شعری گلدستوں میں اکثر شائع ہوتی تھیں۔انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور اس صنف میں بھی انہوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ اپنے زمانے کے اچھے غزل گویوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ان کی غزلیہ شاعری روایتی ہے۔عشق کی مختلف کیفیات، حسن کی دل نوازیاں، زندگی کی نیرنگیاں، زمانے کی ناقدری کی شکایت ان کی غزلوں کے موضوعات ہیں۔ان میں اگر چہ کوئی ندرت نہیں لیکن ان کی غزلوں میں روانی، فصاحت ،لطفِ زبان ومحاورہ، تازگی وشگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔اس لحاظ سے وہ خاندیش کے شعرائے قدیم میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

نمونہ کلام

آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو چکے
ان کے ہم اور وہ ہمارے ہو چکے

دیکھ کر افشاں جبینِ یار کی
مانند گردوں پرستارے ہوچکے
قسمتِ خوابیدہ اطہر جاگ اٹھی
آج وہ مہماں ہمارے ہوچکے

جلوۂ یار میرٹھ میں اطہرؔ جالگانوی کا کلام اکثر چھپتا تھا۔ جنوری ۱۹۱۱ء کے شمارے میں ایک طرحی مصرعہ پر اطہر کی ایک غزل شائع ہوئی ہے۔ اس غزل کے بارے میں ایڈیٹر نے یہ سرخی لگائی ہے ۔ ''جناب منشی غلام مصطفی صاحب اطہرؔ مصنف ریاض نورس، غم محرم، جلگاؤں'' اس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ 'ریاض نورس' کے علاوہ اطہر کا ایک اور مجموعہ کلام ۱۹۱۱ء سے پہلے غم محرم کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اب غزل ملاحظہ کیجیے۔

وہ اپنی چاندسی صورت دکھائے دیتے ہیں
مثالِ آئینہ ششدر بنائے دیتے ہیں
میں چھیڑتا ہوں تو وہ مسکرائے دیتے ہیں
ہزاروں بجلیاں دل پر گرائے دیتے ہیں
یہ مشقِ شعر سے حاصل ہوا ہمیں اطہرؔ
کہ داد اب ہمیں اپنے پرائے دیتے ہیں

اطہرؔ جالگانوی کے دل میں قومی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ محب وطن ہونے کے علاوہ محب قوم بھی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے نظم کو ذریعہ بنایا۔ اطہر کی قومی نظمیں ملاحظہ فرمائیں۔

خواب غفلت سے اٹھو وقت ہے بیداری کا
مرحلہ کرنا ہے طے قوم کی دشواری کا
دولتِ علم سے بے بہرہ رہے جاتے ہیں
یہی باعث ہے مسلمانوں کی لاچاری کا
رہنما قوم کے جس راہ چلائیں گے چلو
فائدہ ان کی اگر لینا ہے ہشیاری کا
قومی نظموں میں کھلا کر گلِ مضموں دیکھا
وصفِ اطہرؔ جو طبیعت میں ہے گل کاری کا
خوابِ غفلت سے ہو اب بیدار قوم
جاگ اٹھ ہشیار ہو، ہشیار قوم
وائے بے فکری نہیں فکرِ دوا
بڑھ گیا حد سے سوا آزار قوم
آج ظلمت کے گڑھے میں ہے پڑی
تھی جو کل اک مطلعِ انوارِ قوم
وائے بے خبری نہیں اپنی خبر
بادۂ غفلت سے ہے سرشار قوم
اُف غلامی آج غیروں کی کرے
تھی جو کل تک آپ خودمختار قوم
اور کوئی مطلب اطہرؔ نہیں
ہے غرض اتنی کہ ہو بیدار قوم

اطہرؔ جلگانوی نے خاندیش میں اردو زبان، ادب، تعلیم اور شاعری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی ادبی و تعلیمی خدمات نا قابل فراموش ہے۔ ان کی زیر نگرانی جلگاؤں سے سہ ماہی ''کہکشاں'' نامی ادبی رسالہ شائع ہوتا تھا جس کے ایڈیٹر قاضی مشاہد علی عرف فیروز ہاشمی تھے۔ اطہر نے خاندیش میں اردو شاعری کا جو چراغ روشن کیا تھا۔ اس سے نا جانے کتنوں نے روشنی پائی۔ مشرقی خاندیش کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں اطہر جلگانوی کے شاگرد نہ تھے۔ اطہرؔ کے تلامذہ میں جو قابل ذکر ہیں ان کے نام ہیں خوشتر جلگانوی، سکندر نورانوری، نشتر جلگانوی، کلیم بیاولی، ایمان بیاولی، عبد الرحمن خان برتر جلگانوی، منشی شیخ ناصر، محمد حیات کمتر جلگانوی، عبد الشکور اخضر اور منشی غلام محی الدین خاں اختر جلگانوی (اطہرؔ کے چھوٹے بھائی)۔

اطہر جلگانوی اور ان کے لائق شاگردوں نے خاندیش میں اردو زبا و ادب کی آبیاری میں جو خون جگر صرف کیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اس خطے میں شعر و سخن کے رنگارنگ پھول مہک رہے ہیں۔

☆☆☆☆
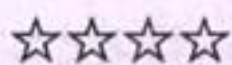
قمر بھساولی

مضمون نگار : عبدالرشید شیخ قاسم

قلمی نام : رشید قاسمی

تاریخ پیدائش : یکم جون ۱۹۵۳ء (سرکاری ریکارڈ)

انعام/اعزاز : ۱۹۸۱ء میں ماہنامہ بانو میں مقابلہ کا پہلا انعام، ۲۰۰۲ میں اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی میں بحیثیت رکن نامزدگی، ریاستی صحافتی ایوارڈ ۲۰۱۲ء ایک اردو ناول کا مراٹھی ترجمہ اور مراٹھی مضامین کے اردو تراجم کی اشاعت کا منصوبہ

موجودہ مصروفیات : روزنامہ ممبئی اردو نیوز میں مراٹھی مضامین کا اردو ترجمہ

پتا : تعبیر، امن پارک، شیواجی نگر، جلگاؤں 9175896209

مشرقی خاندیش کا علاقہ بالخصوص جلگاؤں ضلع شعر و ادب کے لیے بہت زرخیز نہ سہی، بنجر بھی نہیں رہا ہے۔ خصوصی طور پر یہاں کی فضاء ماضی تا حال شعری رجحانات کے لیے سازگار رہی ہے۔ یوں بھی سارے ملک کی فضاء شاعرانہ مزاج کے فروغ اور ارتقاء میں ہمیشہ موافق رہی۔ مشرقی خاندیش (جلگاؤں ضلع) میں بھساول سینٹرل ریلوے کا اہم جنکشن ہے۔ یہ شہر آج بھی ملک گیر سطح پر مشاعروں کے توسط سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ کبھی یہاں آل انڈیا مشاعروں کی دھوم ہوا کرتی تھی۔ ان مشاعروں کی رونق جن کے دم سے تھی، ان میں ایک اہم نام قمر بھساولی ہے۔

قمر بھساولی مزاج سے شاعر اور پیشہ سے ریلوے ملازم تھے۔ بھساول ہی میں ۲۴ رجولائی ۱۹۲۴ء کو ایک مزدور گھرانے میں آنکھ کھولی۔ کبھی اس شہر کی آبادی کا بڑا حصہ مزدوروں پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ فی الحال مزدور تو ہیں، اسکول ٹیچر، چھوٹے بڑے بزنس مین، سبکدوش ملازمین بھی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ قمر بھساولی کی ابتدائی تعلیم مدھیہ پردیش کے شہر کھنڈوا میں ہوئی۔ ہائی اسکول تعلیم بھساول میں مکمل کی۔ چونکہ ان کے بچپن میں یہاں ادبی فضاء خوشگوار تھی۔ ہواؤں میں شعر و نغمہ کی

خوشبو بکھری محسوس ہوتی تھی۔ آئے دن شعری محفلیں برپا ہوتیں، جن میں مقامی نومشق، نوعمر شعراء کے علاوہ ملک کے نامور فنکار اپنی شاعری اور آواز کا جادو جگاتے تھے۔ قمر بھساولی اس سحر انگیزی سے کیونکر بچتے؟ وہ بھی دوشیزۂ شعر کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے اور ایسے ہوئے کہ جان جاتے ہی چھوٹے!

بزم ادب بھساول کا بہت فعال ادبی ادارہ تھا۔ اس ادارے کو شعری نشستیں، محفلیں منعقد کرنے کا شرف حاصل تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب قمر بھساولی اپنے احباب کے اصرار پر بزم ادب کے سربراہ متعین ہوئے۔ پھر تو آل انڈیا مشاعروں کی باڑھ سی آگئی جہاں قمر بھساولی نے بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ بھساول میں اتنی شعری محفلوں کے انعقاد اور شاعرانہ فضاء کے باوجود کسی مقامی شاعر کا شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ قمر بھساولی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کا شعری مجموعہ 'آواز' اس علاقہ کا اوّلین مطبوعہ شعری مجموعہ ہے۔

قمر بھساولی کو غزل عزیز صنف سخن رہی۔ اوّل اوّل تو وہ جلسوں اور میلادوں میں اپنی شعری صلاحیتوں کا اظہار کرتے رہے لیکن جب شعوری عمل کی حد میں داخل ہوئے تو استاد شاعر ماہر القادری کے سامنے زانوئے تلمیذ تہہ کیے۔ ماہر القادری نے شعری مجموعہ 'آواز' میں اس اظہار خیال کے ذریعہ اپنی عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا کہ جناب قمر بھساولی نے مجھ سے مشورہ سخن کیا اور میں ان کا استاد نہیں، مشیر ہوں۔ اور یہ بھی ان کی محبت ہے جو مجھے اس قابل سمجھا۔ میں اپنی مشاورت کو اس سلسلہ میں کوئی کریڈٹ دینا نہیں چاہتا۔ ماہر القادری کے یہ الفاظ قمر بھساولی کی قدآوری کو درشاتے ہیں۔ پاکستان آنے کے بعد قمر صاحب کا کلام رسالوں میں پڑھتا رہا اور ان کی ترقی اور تیزی کے ساتھ ترقی دیکھ کر جی خوش ہوا بلکہ ان کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔

چونکہ بھساول کے مشاعروں میں شاعر شباب شکیل بدایونی بھی شریک ہوتے رہے۔ جب قمر بھساولی ان سے ٹھیک طور سے متعارف ہوئے، تو ان کا رنگ تغزل مزید نکھر گیا۔ بقول قمر بھساولی 'میں نے حضرت شکیل کی معیت میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی۔ جس سے مجھے ملک گیر تعارف حاصل ہوا۔' شکیل بدایونی نے قمر بھساولی کی ایک شاعرانہ خوبی کا کس دل پذیر انداز میں اعتراف کیا ہے 'ایک چیز ان کے کلام میں نمایاں دیکھی وہ قنوطیت ہے۔' وقت اور حالات کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ زندگی میں قنوطیت شامل ہو ۔اس کے باوجود انہوں نے جس خوبی اور پختگی کے ساتھ اپنے خیالات کو اشعار کا جامہ پہنایا وہ

قابل ستائش وتحسین ہے۔

نویں دہائی سے قبل بھساول شاعری اور مشاعرہ کا ایک بڑا مرکز تھا۔تقریبات ہوتی تھیں ۔ادب وشعر پر گفتگو ہوتی تھی ۔پھر کل ہند مشاعروں کی سرگرمیاں تھم گئیں۔شہرۂ آفاق فنکاروں کی آمد نہیں رہی ۔بیتے برسوں میں یہاں وہاں چھوٹی بڑی نشستیں ضرور منعقد ہوتی رہیں لیکن وہ گرم بازاری نہیں رہی ۔اردو دنیا کے جغادری فنکاروں کی آمد اور پزیرائی کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں اور بس! بھساول میں اردو کے شعری جہان کو جن شعراء نے رونق بخشی تھی ان میں قمر بھساولی کا نام سرفہرست ہے۔اب بھی شعر (اورافسانہ) کے جگنو چمک اٹھتے ہیں لیکن روشنی ماند ہے۔اطمینان یہ ہے کہ روشنی ہے تو سہی۔

زندگی سے متعلق قمر بھساولی کے ایک زندہ شعر کے ساتھ وہ دیگر اشعار نقل کیے جارہے ہیں جو شاعر کے مقام ومرتبہ کا تعین کرتے ہیں۔

☆کسی عالم میں بھی تجھ سے نہ کی دامن کشی میں نے
تجھے ہر روپ میں اے زندگی آواز دی میں نے

☆میری بربادیاں آئینہ بن گئیں
دیکھ کر لوگ مجھ کو سنورتے رہے

☆بقدر غم ہی اگر نوازیاں ہوتیں
تو آدمی کا مسرت سے حال کیا ہوتا؟

☆ہم نے گرد سر کرلیا وقت کو
رہبر وقت کے ساتھ چلتے رہے

☆ہم نے ہر درد کی تاریخ جنوں لکھی ہے
خود ہمیں اپنے گریباں کا مگر ہوش نہیں

☆کشمکش میں جو مزہ ہے وہ سہاروں میں نہیں
زندگی طوفان میں پنہاں ہے کناروں میں نہیں

☆بلا کشان محبت کی خیر ہو یارب
زمانہ بیٹھا ہے سینہ میں کچھ غبار لیے

☆آج ہر شاخِ گلستاں پہ قمر
نقش ہے ہاتھ کی لکیروں کا

☆رہِ حیات میں ایسے بھی کچھ مقام آئے
مٹایا اپنوں نے دشمن ہمارے کام آئے

☆مری تباہی کا پھر تذکرہ ہے یاروں میں
خدا کرے نہ کہیں پھر تمھارا نام آئے

☆بہت قریب سے دیکھی ہے زندگی میں نے
بہت ہی سخت مری راہ میں مقام آئے

☆بے جذب و کشش دہر میں کچھ بھی نہیں ملتا
کیوں لوگ دعاؤں میں اثر ڈھونڈ رہے ہیں

☆ہر خوشی نذرِ غم ہوگئی ہے
زندگی محترم ہوگئی ہے

☆ سپر بن جاتی ہے خود مفلسی ہی عزم و ہمت کی
مگر یہ شرط ہے کہ آدمی خود دار ہوجائے

بربط وچنگ

دنیا کا بدلا ہے رنگ — رہ رہ کے اٹھتی ہے امنگ
حسن نے جب دل کو تولا — میری وفا نکلی پاسنگ
اپنا گریباں اپنا ہاتھ — آپ ہی سے ہے اپنی جنگ
دکھ کے ساتھی غم کے شریک — شعر ونغمہ بربط و چنگ
حسن سے اور امیدِ وفا ! — یعنی ربطِ شیشہ و سنگ
نیچی نظریں لب پہ ہنسی — دل لینے کے ہائے رے ڈھنگ
لالۂ و گل مہتاب و شفق — تجھ بن بے کیف و بے رنگ

جو کچھ بھی ہے غم ہی تو ہے
غم سے قمر کیوں ہے دل تنگ

محسوسات

مری زندگی ہے وہ آئینہ کئی روپ جسکے بدل گئے
کبھی عکس جلوہ نما ہوا کبھی جلوے عکس میں ڈھل گئے

یہ تصورات کی محفلیں یہ تخیلات کے مشغلے
کبھی آ گئے ترے پاس ہم کبھی اور دور نکل گئے

نہ وہ صبح ہے نہ شام ہے نہ پیام ہے نہ سلام ہے
تری آنکھ مجھ سے جو پھر گئی مرے صبح و شام بدل گئے

وہ امید حاصل زیست ہے جو وعدۂ دوست ہے
وہی پھول جان بہار ہیں جو نسیم صبح سے جل گئے

کہیں نالۂ غم زندگی'' کہیں نغمۂ غم دوست'' ہے
یہ چراغ گردش دور ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے

تو سنبھل سنبھل کے قدم بڑھا کہ یہ راہِ عشق ہے اے قمرؔ
جو بگڑ گئے تو بگڑ گئے جو سنبھل گئے تو سنبھل گئے

☆☆☆☆

احمد نسیم میناںگری

رشید قاسمی

احمد نسیم میناںگری کی زندگی کا بڑا حصہ مالیگاؤں میں گزرا۔ بسلسلہ ملازمت مرحوم مالیگاؤں منتقل ہوئے تھے۔ لیکن مرحوم نے دم آخر تک اپنے قلمی نام کے ساتھ میناںگری لاحقہ برقرار رکھا۔ میناںگر دراصل دھرن گاؤں (ضلع جلگاؤں) کا قدیم نام ہے۔

'زخموں کا پیرہن' احمد نسیم میناںگری کا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کے تعلق سے شاعر نے جگر مرادآبادی کا ایک قول کوڈ کیا ہے۔ ''اچھا انسان ہی اچھا ادب تخلیق کرتا ہے۔'' جبکہ بعض ناقدین نے کردار کو غیر ضروری بتایا ہے۔ آگے جا کر احمد نسیم نے فرمایا، ''نئی شاعری گیتوں کی زبان اور بحروں میں نمودار ہو رہی ہے۔ غزل کی مروجہ بحروں سے ہٹ کر ہندی بحروں اور گیتوں کی زبان میں کوئی بھی شعر کہے گا تو اس کے لب ولہجہ کی ایک الگ چاشنی محسوس ہوگی۔ نئی شاعری اس راستے پر چل رہی ہے۔ نئی شاعری نے غزل کو آگے نہیں بڑھایا بلکہ گیتوں کی زبان کو فروغ دیا ہے۔ حرف آخر کے طور پر مرحوم نے فرمایا؛

''میری غزلوں میں نئی پرانی روش کا سنگم دکھائی دے گا جو میری متوازن فکر کی دین ہے اور بس ۔۔۔'' مرحوم نے اپنے مجموعہ کے ٹائٹل پر ایک معنی خیز شعر تحریر کیا ہے؛

ہم نے ہی راہ شوق میں کاٹی ہے فصل غم
زخموں کا پیرہن ہے ہمارے بھی جسم پر

مرحوم احمد نسیم میناںگری کے مجموعہ کلام 'زخموں کے پیرہن' سے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔ ان اشعار میں شاعر کی فکر تک با آسانی پہنچا جا سکتا ہے۔

بے سایہ ہو گئے تھے ہماری طرح شجر
دانستہ ہم بھی بن گئے پت جھڑ کے ہمسفر
چشمے ہیں پتھروں کے جگر میں چھپے ہوئے

دیکھا ہے ہم نے سخت چٹانوں کو توڑ کر
آنکھوں کے فاصلے ہی تھے جو طے نہ ہو سکے
ورنہ وہاں سے دور نہ تھی دل کی رہگزر
دل میں طویل رات کا غم کاٹتے رہے
سورج کے انتظار میں مشرق پہ تھی نظر
ہم نے بھی راہ شوق میں کاٹی ہے فصل غم
زخموں کا پیرہن ہے ہمارے بھی جسم پر

ذلتوں کے سوا ہاتھ کچھ آئے نا
ہاتھ غربت میں کوئی بھی پھیلائے نا
رشتوں ناطوں کا یوں تو بھرم ہے بہت
وقت پڑنے پہ کوئی بھی کام آئے نا
منزلیں آگہی کی ابھی دور ہیں
دل کہیں دور جا کر بھٹک جائے نا
زندگی بھر مسافر کی صورت جیے
پھر بھی دنیا کے الزام ،سر آئے نا
لوگ مرتے ہیں اب بھی سرِ رہگزر
کتنی ظالم ہے دنیا ترس کھائے نا

ظرف کے مقدر میں بولنا نہیں آیا — ٹوٹنا تو آیا ہے ،چیخنا نہیں آیا
بوجھ سے کتابوں کے ذہن تو ہوئے اوجھل — آگہی کے چشموں میں ڈوبنا نہیں آیا
خلوتوں سے محرومی اک بڑی تباہی ہے — وقت کی سیاست پر سوچنا نہیں آیا
ہم نے سچی باتوں کو نغمگی تو بخشی ہے — شاعری میں لفظوں سے کھیلنا نہیں آیا
اے نسیمؔ لہجے میں تلخیاں تو آئی ہیں — زندگی نہیں آئی ،حوصلہ نہیں آیا

☆☆☆☆

قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی

رشید قاسمی

اس اہم کتاب کی ترتیب اور تیاری میں وہ گوہر نایاب حاصل ہوئے جو اردو دنیا سے برسوں روپوش رہے۔اردو کے بڑے معتبر اور قدیم رسالہ شاعر کی نومبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں قاسم شبیر نقوی (نصیر آبادی) کا ایک طویل مضمون بعنوان 'اردو زبان وادب میں ہندوؤں کا حصہ' شائع ہوا تھا۔اس کی زیراکس کاپی ہمیں دستیاب ہوئی۔جناب قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی کے اس مضمون میں اس خیال کو غلط ٹھہرایا گیا کہ ہندوؤں کا اردو سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کیا گیا کہ اردو زبان کی نشو ونما میں مسلمانوں کے برابر ہی ہندوؤں کا ہاتھ رہا ہے۔مضمون میں ایک جگہ درج ہے ''ناشائستہ اردو ہندی ہے اور شائستہ ہندی اردو ہے۔''ایک جگہ یہ بھی درج ہے کہ ''کوئی نوعیت خدمت اردو کی ایسی نہیں ہے جس میں ہندوؤں نے معتد بہ حصہ نہ لیا ہو!'' ''ایک اہم تبصرہ یہ کہ اردو زبان وادب ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔''

اسی مضمون میں یہ معلومات بھی بہم پہنچائی گئی کہ فلمستان میں ہندوؤں کو اردو سے ہر وقت سابقہ پڑتا رہتا ہے۔بہت سے جریدے اور مجلّے ہندوؤں کی ادارت کے ممنون احسان ہیں۔اردو کے ڈرامے،افسانے اور گیت وغیرہ اردو نواز ہندوؤں کی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ہر قصبہ اور ہر شہر میں اردو کی ادبی انجمنوں کی حمایت ہندوؤں کی طرف سے دل کھول کر ہوتی ہے۔

قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی کے قلم سے ماہنامہ شاعر کی جولائی ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں 'اردو میں مرثیے کی تاریخی اور ادبی حیثیت' کے نام سے ایک اور مضمون شامل ہے۔اس طویل مضمون میں مرثیہ کی تاریخی اور ادبی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔صاحب مضمون لکھتے ہیں ''وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ مرثیہ صرف فضائل،اخلاق اسلامی اور خالص مذہبی عقائد کی ترجمان،ایک قسم نظم ہے۔بر سر غلط ہیں۔ان کی تنگ نظری نے انھیں اجازت نہیں دی کہ وہ مرثیہ کو ادبی کسوٹی پر پرکھتے اور جانچتے۔ایک اور جگہ آپ رقم طراز ہیں ''مرثیہ وصف مشیت سے عبارت ہے۔مرثیہ گوئی کا صحیح مبدا ملک عرب ہے۔جو

زبان عرب میں ہے۔ یہ انکشاف بھی درج ہے کہ ہندوستان میں ہی اردو شاعری کی ابتداء مرثیہ گوئی سے ہوئی۔ یہ سرمایہ ہندوستان نے مقلدانہ طور پر فارسی سے لیا۔ انیس اور دبیر کے تعلق سے لکھا ہے 'اردو شاعری اپنے دو کمالوں کی خالی جگہوں کو پر نہیں کرسکتی۔ انیس اور دبیر کے مرثیے اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہیں۔ اردو شاعری کے تمام رنگارنگ جلوؤں کا مخزن۔

قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی کے مندرج مضامین نہایت دقیع ہیں۔ شاعر جیسے موقر رسالہ میں ان دو مضامین کی اشاعت سے ثابت ہوتا ہے کہ خاندیش کی سرزمین بنجر کبھی نہیں رہی۔

اک طرف کعبہ ہے اک سمت صنم خانہ ہے
آپ کے عشق کا دیوانہ کدھر سے گزرے
چند ساعت ہی رہے ذوقِ نظر کو تسکین
تیرا جلوہ کبھی یوں بھی تو نظر سے گزرے
دلِ قاسمؔ کو عطا کروہ بصیرت کا جمال
جو بھی گزرے تری صورت میں نظر سے گزرے

خود اپنی ذات میں گم تیرے جلووں میں نہاں ہم تھے
بہر انداز تیری بے نشانی کے نشاں ہم تھے
بہ الفاظِ دگر خودراز تھے خود رازداں ہم تھے
نہ تھا تیرے تصور کے سوا کوئی جہاں ہم تھے
محبت کا ہر اک انجام اک آغاز تھا قاسمؔ
اُسی منزل پر اکثر پھر پلٹ آئے جہاں ہم تھے

☆☆☆☆

صابر زاہدؔ کی اجتہادی فطرت نے غزل کو نئے نئے تجربوں سے گزارا

(صابر زاہدؔ کی ناگہانی موت پر ایک تاثر)

مضمون نگار : عبدالقیوم خان نتھّے خان

قلمی نام : قیوم اثرؔ

پیدائش : ۳؍فروری ۱۹۵۲ء

تعلیم : ایم اے بی ایڈ (پونہ)

پیشہ : سبکدوش صدر مدرس

مطبوعات : زیر ترتیب افسانوں اور غزلوں کا مجموعہ ''نظم ونثر''، افسانچوں کی دنیا

پتا : شیواجی نگر، جلگاؤں 9273486330

غزنم، رلی ملی غزل، ثلاثے، سہ سطری نظمیں، نثری نظمیں اور غیر منقوط غزل جیسے انمول تجربات اپنی شاعری کے ذریعہ اردو کے ذی فہم قارئین کے سامنے رکھنے والے نئے لب ولہجہ کے شاعر مرحوم صابر زاہدؔ جن کا مکمل نام سید صابر علی سید مظفر علی ہے۔ شیشگر گھرانے میں یکم مارچ ۱۹۴۷ء کو جلگاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہیں اینگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں سے ایس ایس سی کا امتحان کامیاب کر کے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے اسی وقت شاعری کا آغاز ہوا۔ مشہور و معروف شاعر مقیم اثر بیاولی نے درست ہی کہا کہ 'صابر زاہدؔ مژگاں کو نچوڑ کر شعر کہنے والا شاعر نہیں بلکہ دل نچوڑ کر شعر کہنے والا شاعر ہے۔ وہ ایسا طائر خوش رنگ ہے جسے عصبیتوں کے بے رنگ قفس محدود نہیں کر سکتے۔' بہت صحیح ہے کہ اردو جدید شاعری کا شہنشاہ کہلائے۔ ایک ایک لفظ سے فکر کے انگنت سیلاب اُمڈ آتے ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ بہت خدمات کے بعد ہی شاعر کو یہ حق بنتا ہے کہ نئے قوافی تلاشے۔ صابر زاہدؔ نے اس میدان میں برتری کا احساس جگایا تھا۔ وہ اپنے لہجے میں بڑے مفاہیم محیط کرنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اُن کا ابتدائی لب ولہجہ اپنی پختگی اور فکری رجحان کا آئینہ دار ہے۔

یہ ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے
بدن ڈھانپوں کہاں تک آرزو کا
سمٹ جائے تو ہے کوزے میں دریا
کہاں ہے انت ورنہ جستجو کا

''صدر شعبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے پروفیسر عنوان چشتی نے ۱۹۹۱ء میں یوں کہنے سے گریز تک نہیں کیا کہ صابر زاہد کی شاعری پڑھ کر ان کے جمالیاتی تجربوں میں شامل ہونے کی مسرت ہوئی۔'' ان کے دو مجموعے سپاہ لمس اور ارتکاز منظر عام پر آچکے ہیں۔ مقبولیت کے آسمان بھی چھو چکے۔ ان کے اردگرد ہمیشہ پڑھے لکھوں اور فکر مندوں کا گروپ رہا کرتا تھا۔ ہر لمحہ صابر زاہد ادب کا کوئی موضوع ہو گفتگو پر تیار رہتے تھے۔ حلقۂ احباب میں معروف افسانہ نگار رشید قاسمی، عزیز رحیمی، فہیم احمد، ظہیر احمد، سید منصف علی، صدیق امام انصاری اور راقم الحروف کے علاوہ جلگاؤں کے سبھی قلمکار شامل تھے۔ صرف اردو ہی نہیں مراٹھی اور انگریزی پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ سرکاری ملازمت کے دوران کئی اونچے نیچے موڑ آئے۔ جہاں غصیلا لہجہ تھا وہیں نرم طبیعت نے انھیں عوام و خواص میں مقبول بنائے رکھا۔ سبکدوشی کے بعد پوری طرح مذہبی رجحان ان پر غالب آگیا تھا۔ فطرتاً تنہائی پسند تھے۔ حیات بھر اشعار بیاض شعر پر اتر کر اپنے عالی مرتبت ہونے کا ثبوت چھوڑ گئے۔ غزل ہوئی تو کوشش کرتے فنی عیوب نکل جائے اور رہ جاتے تو محسوسات تک بھی نہیں پہنچ پاتے۔ سہ سطری نظمیں، نثری نظمیں اور رخش ہوا یہ تین مجموعے زیر ترتیب تھے لیکن اس جہانِ فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ دیکھتے ہیں کہ متعلقین کیا کریں گے! جیسے ہی شاعری میری طرف رجوع ہوئی صابر زاہد کے ساتھ گفتگو کرنے کے در بھی وا ہونے لگے۔ چند اشعار سناتا تھا تو دیر تک غور کرتے، خاموش رہتے، سگریٹ کا دھنواں منہ سے کم ناک سے زیادہ نکلنے لگتا تب کہیں جاکے گردن کو ہلکی سی جنبش ملتی۔ میں سوچتا، خوش نہیں ہوتا، فکر کی گہرائی ناپنے لگتا۔ جب غزل پر بات ہوئی تو گلفشانی کی وضاحت سامنے آجاتی۔ دوستی پختہ سے پختہ ہونے لگتی۔ مزاجوں میں ہم آہنگی پیدا ہوئی تو اردگرد کے شیریں ماحول پر بھی نظر جانے لگی۔

غزل کے رستے میں تو جانبازی کوئی صابر زاہد سے سیکھ لیتا۔ کہاں کہاں نہیں پہنچے۔ غزل کو ادبی حسن سے نکھارنے، سنوارنے میں آخر سانسیں تک لگادیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شمس الرحمن فاروقی کو ان کی غزلیں ادبی حسن کے اعتبار سے بہت بلند نہیں لگیں۔ اگر فاروقی انکاریہ جملے کا استعمال نہ کرتے تو کیا برا

تھا۔غزلوں کا ادبی حسن بلند تو رہتا۔ہاں اظہار خیال کرنے والوں کی کسوٹی پر ہوسکتا ہے غالب کی غزلیں بھی بہت بلند نہ لگے۔پھر لہجے کی تازگی و توانائی کو بہتر گردانا چہ معنی دارد؟ ہاں ظ۔انصاری نے تو بھرپور ستائش کی ہے۔اسلئے بھی کہ اللہ کے حضور ہاتھ پھیلائے انسان کیا نہیں مانگتا۔لیکن سچا فنکار اپنی خصوصی دعاؤں میں بھی غزل کی تابندگی اور فکر کی گیرائی کا طلبگار ہے۔صابر زاہد یوں دعا گو ہوئے۔

سورج کی تمازت میں بجھا کر سو بار
مہتاب سی تابندہ غزل دے اللہ
سوز تخلیق سے نواز اللہ
فکر کو بخش ارتکاز اللہ

صابر زاہد کی اجتہادی فطرت نے غزل کو نئے نئے تجربوں سے گزارا۔کبھی تو غیر منقوط غزل ہوگئی کبھی غزل در غزل، کبھی رلی ملی غزلوں پر کامیاب طبع آزمائی کی۔سراہنا کی گونج بھی ہر طرف سے سنائی دی۔غزنم ایک اور تجربہ ہوا۔سارے تجربے فکر کی نادر گہرائی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے۔صرف کہنے کیلئے غزل نہیں تھی۔سارے حسن سے سیراب ہوئیں۔نقد تبصرے تو حق پر بھی ہوتے ہیں نا۔رلی ملی غزل نے تو تیسری غزل کو وجود بخشا۔کوشش کی جائے تو چوتھی بھی نکل آئے۔

خود آپ اپنے ہی نغمے الاپتا کوئی
بھٹکتا پھرتا ہے گلیوں میں بے سرا کوئی
سپاٹ شعر ہیں الفاظ بھی اکھرے ہیں
سنے گا کون اسے سارے لوگ بہرے ہیں

زندگی کی کٹھن راہوں پر ثابت قدمی سے چل کر غزل کو فکر و خون سے آراستہ کرنے والے مجاہد کو ہی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ نئے نئے قافیے تلاشے۔صابر زاہد نے استحقاق ذاتی کو خوب ارتکاز بخشا ہے۔کہنہ مشقوں کو ہی یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ قافیہ پیمائی پر بھی اپنی گرفت مضبوط رکھے۔ہر تازہ وارد کو یہ اظہار بھلا نہیں لگتا۔صابر زاہد نے اجتہاد کے دامن سے لفظائے بھی ہیں۔جیسے 'یکجایئے ،اوندھایئے ،لمسایئے ،زنجیرنا ،تصویرنا ،دیواریہ ،اتواریہ' وغیرہ صابر کے یہاں جمالیاتی اسلوب بھی سر اٹھاتا ہے۔ایسا لگنے لگتا ہے کہ وہ جدیدیت کی باگ ڈور سنبھالے کہاں سے کہاں نکل گئے۔انداز بہت قریب سے گزرتا ہے۔دل کو چھیدتا بھی ہے۔جمالیاتی اسلوب کو بھی جدید پیراہن دے کر وہ گویا ہوتے ہیں۔

میرا مکتوب مجھ سے بڑھ گیا ہے
تیرے لب کی حلاوت چوستا ہے

میرے سلگتے ہونٹوں کی دیوار توڑ کر
سگریٹ کا دھنواں تیرے گالوں کو چھو گیا

مجھ سے ملنے کوئی آیا تھا مگر لوٹ گیا
گھر کی ہر چیز مہکتی ہے گلابوں کی طرح

ان کے اس جمالیاتی اسلوب میں بھی جدیدیت کا رجحان نمایاں ہے ۔وہ اپنے محبوب کو (ساتھی) آگہی کی طرف رجوع بھی کرتے ہیں۔

دیکھ تو میرے ساتھ نہ چل　　　شہر ہے سانپوں کا جنگل

صابر زاہد درس وتدریس میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔شاید بہت کم متعلقین یہ جانتے ہوں گے کہ وہ مدرس ہونے کے خواہاں تھے۔ ۳۵ رسال قبل وہ غلط لہجہ وتلفظ ،غلط بیانی اور نہ درست ناطقے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔زبان وبیان گویا ہاتھ جوڑے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے ہوئے تھے۔

ٹائپ کا شور بن گیا توپوں کی گھن گرج
احساس فائلوں کی طرح دب کے رہ گیا

آیا تھا کوئی میرا پتہ پوچھتا ہوا
دفتر میں ایک صلیب پہ لٹکا ہوا تھا میں

ساری شامیں یونہی بے رس گنوادی جائیں گے
فائلوں میں خواہشیں دل کی دبا دی جائیں گی

یہ اشعار صابر زاہد کے باطنی درد کو آشکار کرتے ہیں ۔آئے دن رونما ہونے والے حالات بھی وہ سپرد قلم کرتے تھے۔ اتحاد واتفاق نیز ایمان کی ناپختگی کے کارن پیدا ہونے والے خوف وہراس پر انھوں نے زبردست طعنہ کسا، اتنا ہی نہیں استعجابیہ علامتوں کے ڈھیر سے نکل کر صاف گوئی کو اپنے اظہار کا وسیلہ اسطرح سے بنایا کہ زہراب بھرا تیر دل کی گہرائیوں میں اترتا ہی جاتا ہے۔تلملاہٹ ہوتی ہے مگر روشن دماغی تو عطا ہو۔شعور جاگے تو واہ وا۔مسائل سے راہ فرار درست نہیں۔ان کے حل ڈھونڈ نکالنا لازم وملزوم ہے۔

جارہے تھے لوگ بستی چھوڑ کر
قحط تھا، بلوا تھا یا شب خون تھا

پھیلی تھی شہر بھر میں سراسیمگی کی لہر
سرکس کے بھوکے شیر کی مریل دہاڑ سے

کرامت علی کرامت نے اپنے اظہار خیال میں سچائی رقم کی تھی۔ وہ کہتے ہیں صابر زاہد کی غزلوں کا ہر شعر ہمیں دعوت فکر عطا کرتا ہے اور صابر زاہد کی غزلیں جدید حسیت کی ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ انھوں نے صابر زاہد کے مثلثے اور ہائیکو پر بھی پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے۔ مصور سبزواری نے صابر زاہد کی شاعری کو مجتہدانہ آواز کہا ہے۔ ناقدین کے اظہار میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ ہر ایک اپنی نظر سے پڑھتا، دیکھتا اور سمجھتا بھی ہے۔ حقدار کو اس کا حق پہنچے نہ پہنچے انھیں کچھ بھی لینا دینا نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں صابر زاہد نے کہا:

لفظ سچے ہیں نہ اظہار میں تہہ داری ہے
میرے نقاد کو ابلاغ کی بیماری ہے

ہاں یہ بہت درست ہے کہ نئی غزل کو صابر زاہد نے زندگی بھر سنوارا، نکھارا، نئے نئے تجربوں سے گزارا اور نادر المثال پیراہن بھی دیے ہیں۔ فکر کے گہرے سمندر سے شاعری کے گوہر نایاب نکال لانے کا ہنر صابر زاہد کے یہاں عمر بھر دست بستہ رہا۔ ان گنت اشعار جدیدیت کی تہہ داریت پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں اور بے ساختہ زبان حق کہنے پر مجبور نہیں آمادہ ہو جاتی ہے کہ ہاں نیا شعر انمول فکر کے سانچے میں ڈھل کر کندن بن گیا۔ اپنی ہی فکروں میں ڈوبا ہوا شاعر اسطرح رقم طراز ہے۔ ناقدین کے حضور احتراماً راقم الحروف نئے اشعار پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہے کہ صابر زاہد کی فکروں کو اور تازگی ملے اور ہم حقدار کو اس کا حق دینے میں ذرہ برابر بھی نہ ہچکچائیں۔ ورنہ ادبی نظریں ٹیڑھی ہو جائیں گی ۔

غموں کا قرض ہے زاہد نہ آنکھ میں آنسو
مکیں جو بھاگیں گے تہمت مکاں پہ ٹھہرے گی

شہر میں سناٹا تھا یا شہر سناٹے میں تھا
آدمی اب سوچتا ہے کون کس کو رو گیا

سلسلہ آہٹوں کا ٹوٹا ہے
اک اداسی کھڑی ہے سر کھولے

نیند آتی ، نہ سوتا ہوں گھڑی بھر زاہدؔ
دل سے یہ روگ کسی طرح خدایا جائے

سناٹا چیختا ہے یوں ہر رات میرے ساتھ
جیسے یہ میرے درد کا ہمدرد ہوگیا

سچا شاعر اپنی فکر کی بلندی اور گہرائی کو صدق دل سے پرکھنے لگا تو ذہن و دل کے سارے بند دریچے وا ہوئے۔ گیرائی کا ایک طبق روشن ہوا۔ بے ساختہ فکر شعر کی صورت میں وارد ہوکر اعتبار عطا کرنے پر آمادہ ہوگئی۔

راکھ کر دے نہ ترے اپنے ہی شہکاروں کو
بڑھتے بڑھتے زاہد تیرے معیار کی آنچ

لگتا ہے پھانس اس کے گلے سے نکل گئی
سناٹا اسقدر کبھی چنگھاڑتا نہ تھا

تو اپنی ذات میں اک بھیڑیا سہی زاہدؔ
یہ شہر لوگوں کا جنگل ہے تجھ کو کھا لے گا

صابر زاہدؔ کی فکری تہہ داریت اور صلاحیتوں کا مجموعہ ان کے اشعار سے واضح ہوجاتا ہے۔' آسان شعر انھوں نے پسند نہیں کیا اور نہ ہی اپنے دونوں مجموعوں میں کہیں دانستہ شامل کیا۔ دو چار غزلوں کے شعراء ان کے قریب سے گزر بھی نہیں سکتے تھے۔ شاعری کے تعلق سے بہت سخت مزاج رہے ہیں۔ تازہ واردوں نیز انا پسندی کے مریدوں سے وہ دوٹوک مخاطب ہوتے تھے۔ کئی شعرائے کرام استفادہ حاصل کرتے اور خاموشی سے نکل جایا کرتے تھے۔ دوسری بار اپنی غزلوں پر اس شہنشاہ غزل سے اصلاح کروانا تو دور کی بات تھی مشورے میں بھی اپنی زبان کو قابو میں رکھنا پڑتا تھا۔ شعر کا مزاج سمجھ کر اسے قیمتی لباس دینے والا 'شعراء' کی ظاہری و باطنی فکروں کو بھانپ لیا کرتا تھا۔ ان کی خدمات اور پیغامات اسی طرح کاغذ پر اتر جایا کرتے تھے۔

ہر روایت کا بھرم توڑ دیا ہے ہم نے
اپنی غزلوں کو نیا موڑ دیا ہے ہم نے

نئی غزل کا ہے درپیش پل صراط میاں
یہ اونٹ سوئی کے ناکے سے پار کرنا ہے

اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر صابر زاہد مالیگاؤں سے واپس جلگاؤں آگئے تھے۔نمازیں اور قرآن کریم کی تلاوت ان کے خون میں جیسے رچ بس گئی تھیں۔تلاوت کے بارے میں تو ان کا اعتبار تھا کہ قرآن کی تلاوت سے ان کی بینائی قائم رہی۔گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر ہی روزمرہ کا معمول رہا۔آخری وقت تک غزلیں رسالوں اور اخباروں کی زینت بنتی رہیں۔اللہ کا یہ بڑا احسان رہا کہ موت آئی تو لیلتہ الجائزہ میں۔تدفین عید الفطر کے انتہائی مبارک و مغفرت والے دن ہوئی۔ہزاروں برادران اسلام نے نماز جنازہ ادا کی کہ تاریخ گواہ رہے گی۔یہ ضرور ہوا کہ صابر زاہد کی رخصتی نے وہ خلاء پیدا کر دیا جس کا پُر ہونا ممکن نہ ہو سکے گا۔جتنا سوچیں گے قد اتنا بلند ہوتا جاوے گا۔شاید صابر زاہد اسی ضمن میں یہ شعر کہہ گئے۔

ہے وہاں چیل اور کوؤں کا بسیرا زاہدؔ
میں نکل آیا تو ویران ہے بستی اس کی

(صابر زاہد کی ناگہانی موت پر ایک تاثریہ بھی)

زندگی جب میرے افکار کے در کھولے گی
خون روئے گی ، رلائے گی ، چلی جائے گی

فکر کی دیوی کو اب کون سہارا دے گا
اپنا سر پیٹتی پاگل کی طرح لوٹے گی

شاعری لفظوں کی تلوار ہے اوسان سنبھال
ڈگمایا تو تیرا سر بھی قلم کردے گی

فن تو ہے موت کے مضبوط شکنجے میں قید
رات بھی آج کے سناٹے سے ڈر جائے گی

نظم کے در پہ ذرا سوچ کے دستک دینا
اس کے وا ہوتے ہی اک سانپ سی پھنکارے گی

کوئی ترکیب، جہد کوئی، کوئی ہو تفہیم
اس کی پرچھائیں کے پڑتے ہی چمک اٹھے گی

کھو کھلی نقد و نظر خوف سے لرزیدہ ہے
ہوش میں آتے ہی خود اپنا پتا پوچھے گی

اس کے جاتے ہی غزل چیخ کے بولی مجھ سے
اب اثرؔ کون سی چدھلیز سکوں بخشے گی

☆☆☆☆

شاعر، صحافی، ماہر قانون اور مدرس۔ شمس اعجاز

قیوم اثر

۱۹۴۵ء کے آس پاس تلاش معاش میں شمس اعجاز اپنے آبائی وطن بالا پور سے ہجرت کر کے بھساول آگئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ کے والد محترم ارمان بالا پوری کسی تعارف کے محتاج نہیں تھے۔ بچپن ہی سے والد صاحب کی صحبت میں مشاعروں، ادبی محفلوں اور میلاد خوانی کی محفلوں سے رو شناس ہوئے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ شاعری اور علم و ادب آپ کو وراثت میں ملے تھے۔ جس وقت یہاں پہنچے بھساول اردو شعر و ادب کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھا۔ ہندوستان بھر میں پہچانا جاتا تھا۔ یہاں کے معزز قارئین اور سامعین نے ہر اس فنکار کو قدر استحسان کی نظر سے دیکھا جس نے ادب کی خدمت کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ مہاراشٹر بھر میں بھساول کو ادب کی مرکزیت کا درجہ حاصل تھا۔

چونکہ بالا پور بزرگان دین، شعر و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے قلم کی روانی میں ان کے اثرات بھی نمایاں ہوتے گئے۔ بھساول ان کیلئے ساز گار زمین ثابت ہوئی۔ اگتے اور ڈوبتے سورج کے ساتھ ان کے جاں نثاروں کا حلقہ بڑھتا گیا۔ ملاقاتیں ہوتی اور لوگ فکری بلندیوں پر لحہ لحہ چونک پڑتے تھے۔

معاشی حالت ٹھیک نہ ہونے کی صورت میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور بھساول میں ہی درس و تدریس سے جڑ گئے۔ آہستہ آہستہ آپ نے تعلیم جاری رکھی اور گریجویٹ بھی ہوئے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ مدرسہ میں انگریزی پڑھانے کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ عمیق مطالعہ کی بدولت اساتذہ میں بڑی قدر تھی۔ درس و تدریس کے دوران بہت کم عرصہ میں شہر کا بچہ بچہ ان کے زیر عاطفت تعلیم حاصل کرنے میں فخر محسوس کرنے لگا۔ زندگی اور مسائل پر جب کبھی بات کرتے مدلل گفتگو ہوا کرتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ادب کی زمین پر مرحوم قمر بھساولی، مرحوم سیف بھساولی، قمر اکبر آبادی، احسان رسلپوری، مبارک بھساولی اور خوشتر بھساولی وغیرہ وغیرہ جیسے اردو دانوں کی شہنشاہیت کے ڈنکے بج

رہے تھے انھیں کے بیچ اپنی فکری صلاحیتوں کی وجہ سے منفرد مقام بنانا مشکل تھا لیکن بنالیا، لوہا بھی منوالیا۔ اردو شاعری کے لئے شمس اعجاز مزاحیہ شاعری کے لئے شمس الدین اور انگریزی کیلئے صابو ۔ان ناموں سے کافی عرصہ تک لکھتے رہے۔

صحافت اور ادب دونوں آپ کے ساتھ سایہ کی طرح رہے ہیں۔ ابتدائی ایام میں آکولہ سے شائع ہونے والے 'امن' میں باقاعدہ چھپتے رہے ہیں۔ بزرگ اور معتبر شاعر قمر بھساولی اور سیف بھساولی کی رہنمائی میں بڑے بڑے مشاعروں میں مرکزی حیثیت حاصل کی۔ صحافتی میدان میں افکار ملت، اردو ٹائمز، اخبار عالم اور ریڈیئنس کے لئے مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ روزنامہ انقلاب سے آپ کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا جب آپ کو ۲۰ روپے تک معاوضہ ملتا تھا۔

اردو ٹائمز علامہ تکلیف روحانی کی ستم ظریفیاں، پروفیسر چیانگ سی اور صابو کی نثر نگاری، پوسٹ مارٹم جیسا کالم ترجمہ اور تلخیص، حالات حاضرہ پر چونکا دینے والے واقعات پر خامہ فرسائی، مدارس میں مدرسین کے مسائل، سیاسی چال بازیاں اور درس و تدریس چھوڑ کر وکالت کے میدان میں قدم رنجا فرمانے والے معتبر ایڈوکیٹ کی مختلف مسائل پر رہنمائی جیسی رشحات قلم سے شمس اعجاز کی ناگہانی موت کے بعد اردو کے باذوق قارئین اور سامعین کف افسوس ملتے رہ گئے۔ آپ جو کچھ بھی لکھتے تھے ملنے والے معاوضہ سے نئی کتابیں اور رسائل خرید کر اپنے مطالعہ کا معیار بڑھاتے تھے۔ صحافتی میدان میں لکھتے لکھتے ۱۹۹۰ء میں اردو اکیڈمی نے صحافتی ایوارڈ سے بھی نوازا۔

ایک سال قبل رمضان المبارک میں جلگاؤں کے معروف شاعر صابر زاہد رحلت فرما گئے اور امسال بھارت بھر میں نظم و نثر کے توسط سے پہچانے جانے والے شمس اعجاز بھی ادبی دنیا کو یتیم کر گئے۔ اب جو کچھ باقی رہ گیا اس ورثہ کو کس طرح سنبھالا جاسکتا ہے یہ بھی ایک مسئلہ بن گیا۔

گزشتہ دنوں اخبار مہاراشٹر نے کم دھوم نہیں مچائی۔ ڈاکٹر محمود حسین (علیگ) اور شکیل حسرت کے ساتھ مدیر کے فرائض بھی شمس اعجاز نے انجام دئے تھے۔ وجہ کچھ بھی ہو اخبار اپنی روانی کھو بیٹھا ۔ یہاں تک کہ جب شمس اعجاز قوانین کا مطالعہ کر رہے تھے اس اخبار کی ذمہ داری احمد کلیم فیض پوری نے بھی سنبھالی تھی۔

۶۰ ر کے دہے میں بھساول میں ادارہ ادب اسلامی کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے صدر بذات خود شمس اعجاز اور جنرل سیکریٹری احمد کلیم فیض پوری تھے۔ جب تک زندہ رہے ساری تخلیقات اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہیں۔ غزل کو نیا نکھار عطا کیا گیا۔ فکر ایسی تھی کہ ادب نوازوں کی زبانوں سے

بے ساختہ واہ نکل پڑتی۔ مشاعروں کی شہنشاہیت بھی شرما جاتی۔ طنز، نیاپن، گہری فکر، سبق آموزیاں ،نئی ترکیبیں، لفظوں کا برتاؤ قدرت کی طرف سے عطا بن کر اترتے تھے۔ زندگی بھر آمد کے پہلو سے راہ فرار اختیار نہیں کی۔ پوری شاعری میں آورد کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا جیسے

کورا کاغذ لے کے شاعر بیٹھا ہے
کھیت پڑا ہے سوکھا مولیٰ پانی دے

اعجاز یہیں نہیں رکے ابتدا ہی سے وہ باحوصلہ اور خود اعتمادی کا سرچشمہ رہے۔

داتا مجھ کو تھوڑی سی تن آسانی دے
کم سے کم اس دنیا کی سلطانی دے

اپنی فکروں اور رشحات قلم کاغذ کے سپرد کر دینے کے باوجود انسانی ہوس اور بے توجہی کا گلہ بھی صاف صاف لفظوں میں کرتے رہے ہیں۔ یہ اعتبار کیا کم ہے کہ کوئی اپنے آپ کو معتبر کہلوائے ۔اپنے لکھے کو مستند کہے۔ کوئی مانے نہ مانے تخیل کے گمان سے زہر بھرا تیر بھی برسانے سے باز نہیں آئے۔ احباب سے گلہ تو ایک کہانی ہے لیکن اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے سے ان کا وقار تو مجروح ہوتا ہے۔ انھوں نے آسانی سے معاف نہیں کیا بلکہ قارئین کو ان کا درجہ بھی سمجھا دیا کہ وہ کس قدر نادانی کرتے ہیں۔

اپنے احباب کی نظروں میں ہے جاہل اعجاز
ایک مشہور صحافی اور مصنف ہو کر

اچھی شاعری شاعر کو قدرتی طور پر ایک مقام بخشتی ہے۔ غالب نے اپنے آپ کو برتر بتانے کی خاطر کئی اشعار کہے تھے مثلاً

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اور اپنے آپ کو برتری کے دریا میں کامیابی سے تیرانے والے ساحر لدھیانوی نے کہا

کل پھر آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے

اور فراق گورکھپوری نے کہا۔

آنے والی نسلیں تم پر فخر کرے گی ہم وطنو

جب تم ان سے ایسا کہو گے تم نے فراق کو دیکھا ہے

اسطرح مفاہم کا برتاؤ شاعر کو اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔اعجاز نے ایسے کئی اشعار سپردِ قلم کیے ہیں جو اردو کے ورثے کہلائیں گے۔

شمس اور شاعری سے واسطہ

یہ تو بس سنجوگ ہونا چاہیے

اللہ کیسے مل گئی لفظوں کو روشنی

میری بیاض شعر میں جگنو کہاں سے آئے

خود کو پالینا، پہچاننا، سمجھنا پھر برتنا مشکل فن ہوتا ہے نا! یہ تو ایک صوفیانہ میدان ہوا جب آدمی اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرلے تو یقیناً ایک مہاتما بن سکتا ہے۔شرط یہ ہے کہ وہ انصاف ہاتھ سے نہ جانے دے۔یہ لمبا سفر ہے نیک بندوں نے اپنی زندگی کی پوری یاترا اپنے آپ کو سمجھنے میں گنوادی اور جب کبھی منزل ملی تو اپنے آپ کو پالیا۔وہ لوگ دھنیہ ہوگئے۔زندگی نام ہے کٹھن راستوں کا۔قدم قدم پر مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔اور سامنا کرنے کی طاقت اعتماد پر انحصار کرتی ہے۔یہ صوفیانہ انداز اعجاز نے اس طرح برتا۔

خود کو پاجاؤں کس طرح اعجاز

کس طرح اتنی دور تک جاؤں

شعری میدان کے تازہ واردوں کو اعجاز نے ایستادگی کیلئے پورا پورا وقت دیا تھا۔یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں استادی اور شاگردی کا معاملہ آٹے میں نمک سے بھی کم رہا۔ان کی فکروں نے انھیں اس قدر جکڑ رکھا تھا کہ وہ اردگرد کے ماحول کو جانتے مگر کسی کے کلام پر اصلاح یا مشورہ دینا اس لئے پسند نہیں فرماتے تھے کہ فن کار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مطالعہ کی میز پر آزمالے تو بہتر ہے تاکہ دور تک سفر کیا جاسکے۔اشارتاً گویا ہوئے۔

پھر وہی مشق سخن قافیہ پیمائی وہی

اف میرا شوق بھی اردو کا تپ دق نکلا

نظم اور نثر دونوں میدانوں میں اعجاز مطمئن تھے لیکن لکھنا تھا کہ رک نہیں پایا اور روکا بھی نہیں گیا ۔ان گنت موضوعات ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہے۔میں گزشتہ ۳۸ ربرس سے انھیں جانتا تھا، ملتا تھا، گفتگو کرتا تھا۔کئی مشاعرے ساتھ پڑھے تھے۔غزلوں پر، شاعروں پر، شاعری پر، نثر

نگاری کے مختلف اصناف پر بحث ومباحثے بھی ہوئے۔ان کے ساتھ ادب کی پروازوں کو سمجھنے کا ہر کس وناکس کو موقع ملتا تھا۔ہاں! تیاری ضروری تھی۔ورنہ اندھے کے آگے روئے۔۔۔والا معاملہ آن پڑتا تھا۔انھوں نے جو کچھ کہا اپنی دانست میں اچھا ہی تھا۔اعجاز نے اپنے آپ کو کمتر سمجھا ہی نہیں۔برتری کا زعم تو تھا۔انھوں نے اپنے مزاج اور اطمینان کو اس طرح پیش کیا۔

اعجاز محنتوں کا صلہ مل گیا سمجھ
دنیا نے تیرے فن کی ستائش ضرور کی

میں آسمان سے ہو کر زمیں پہ آیا ہوں
یہ چاندنی مرے قدموں کی دھول ہے بھائی

ملاقاتیوں کی بڑی صف جو نہیں جانتی تھی وہ عاجزی اور انکساری کا سمندر اعجاز کے یہاں ملتا ہے۔وہ دوست احباب اور ملاقاتیوں کو حیثیت کے مطابق مرتبہ دیتے تھے۔بہت خلیق رہے ہیں۔بلا ضرورت اور بلا وجہ ان کا قلم کام نہیں کرتا تھا۔ہر چند کہ شاعری کے علاوہ نثر کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے رہے لیکن شاعری خمیر کی عمدگی کے اظہار کا وسیلہ بھی بنی۔وہ اپنی جنگ خود لڑتے رہے لیکن مل جل کر کام کرنے کو فوقیت دیتے تھے۔اظہار ہمدردی اور اپنائیت کے جذبوں سے ہمیشہ سرشار رہے ہیں۔ان کا اظہار خیال ان کے مافی الضمیر کا ترجمان بھی ہے۔

دل میں کوئی روگ ہونا چاہئے
خون کا اپ یوگ ہونا چاہئے
گھر کے آنگن میں اتر سکتا ہے چاند
آپ کا سہیوگ ہونا چاہئے

جہاں اعجاز نے شاعری کے اسٹیج پر داد و تحسین حاصل کی وہیں اللہ نے انھیں تقریر کے فن سے بھی سیراب کر رکھا تھا۔کوئی موضوع ہو بے دریغ بولتے تھے۔سچائی اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی کہ کمزور اذہان چپ سادھ لیتے۔انصاف سر چڑھ کر بولنے لگتا جب لوگوں کو پتہ چلتا کہ شاعری نہیں ہو رہی ہے تو چونک پڑتے تھے اور امید کے مطابق موضوعات پر نئے خیالات کی چنگاریاں دیکھنے سننے کو ملتیں۔بھیڑ میں چند ایک پیشانیوں پر بل پڑ جاتے اور کچھ کے چہرے حقیقت بیانی پر کھل اٹھتے تھے۔بالکل اسی طرح تقریر پر قدرت حاصل تھی۔جس طرح ملک کی آزادی پر جاں نثار کرنے والوں نے عوام کو حق و انصاف کی طرف بلا کر ظالموں کے منہ موڑ دئے تھے۔اس مفہوم کو اعجاز نے اس طرح پیش کیا۔

تھرا اٹھے ہیں شہر کے دیوار و در تمام
تقریر اس کی۔ ولولہ انگیز ہے بہت

درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ رہنے والے اعجاز اپنی فکری سلطنت کو مطالعہ کی گہری وادی میں غوطہ زنی پر آمادہ کرتے ہیں۔ادراک وفہم کی آگ میں بھن کر کندن بن جانے کو وہ استحسان کی نظر سے دیکھتے رہے۔ کچے لوگوں کو ناپسند فرمایا۔نئی جہت کو حالات کے بدلنے کا محور سمجھتے تھے اور اعتراف بھی کرتے کہ جہد نو نئے گل کھلائے گی۔اس سے راہ فرار کامیابی کو کافور کر دینے کیلئے کافی ہے۔ان موضوعات کو اپنے تین اشعار میں اعجاز نے اس طرح بیان کیا کہ سمجھدار کو اشارہ کافی ہے۔

ذرا عہد بہار آنے دو خود گھاتوں میں آئے گا
وہ پنچھی ڈال سے اڑ کو میرے ہاتھوں میں آئے گا
ابھی تو ابتدا ہے کہنے سننے کی ضرورت ہے
خموشی کا مزہ اگلی ملاقاتوں میں آئے گا
اگیں گے کھیت میں زہریلے کل پرزے مشینوں کے
بڑے شہروں کا موسم چھوٹے دیہاتوں میں آئے گا

رشتے ناطے اور دوست احباب وغیرہ پر تبصرہ کرنا اعجاز کے یہاں مناسب نہیں ہے۔افراتفری اور دل شکنی کے امکانات برپا ہونے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔دور حاضرہ میں انصاف اور وکالت کے دوران جو تلخ تجربے حاصل ہوئے ان پر بے باکانہ حملے کرنے سے وہ ذرہ برابر بھی ہچکچائے نہیں۔مشاعرے جہاں اردو زبان کو زندہ رکھنے یا تقویت دینے کا سامان فراہم کرتے ہیں وہیں وہ دردسر بھی مہیا کرتے ہیں۔اعجاز نے مشاعروں پر لطیف ساطنز بھی کیا کہ وہ بے آبرو ہونے کے وسیلے بھی ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار ان موضوعات کو بالترتیب بے پردہ کر دیتے ہیں۔

تقسیم کا شعور نہ انصاف کا لحاظ
ان بندروں کے ہاتھ ترازو کہاں سے آئے
ہمارے پیار کے رشتے عجیب رشتے ہیں
نہ بولیے نہ کبھی ان پہ تبصرہ کیجیے
مذاق شعر وسخن کا مظاہرہ کیجیے
پھر اپنے شہر میں کوئی مشاعرہ کیجیے

سچ بولنے کے انجام سے دنیا واقف ہے جس کی بدولت ملنے والی عام سزا سولی پر لٹکانا تھا۔اس کا انجام برا کہا جاتا ہے ہوتا نہیں ۔ہاں ! خود کے بارے میں توصیفی کلمات بزبان خود اچھے نہیں لگتے ۔اعجاز روانی میں یہ بھول گئے کہ ہونٹوں پہ صداقت رکھنے والے وسیلوں کی تلاش کم کرتے ہیں۔اعتماد کو ٹھیس بھی پہنچتی ہے۔سنگلاخ زمین سے پودے اگانے کا ہنر اعجاز کے یہاں دانشوری کا حامل ہے ۔دانشور کبھی دھوکہ کھا ہی نہیں سکتا۔جس طرح غزل کا ہر شعر اپنا ایک الگ مضمون اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے بالکل اسی طرح اعجاز کے یہاں سوچ کے دائرے بھی بدلتے رہتے ہیں جو مناسب نہیں لگے۔ذیل کے اشعار مثبت اور منفی دونوں رخوں کی غمازی کرتے ہیں۔

آج کل خود سے عداوت ہے بہت
میرے ہونٹوں پہ صداقت ہے بہت

اے موج رواں کوئی تحریک سفر بھی دے
مدت سے کنارے پر ٹھہرا ہوا پتھر ہوں

میں دریا پار کرلوں گا یقیں تھا
ہوا کے رخ کا اندازہ نہیں تھا

ڈوبے تو ڈوب جانے میں دانشوری بھی ہو
موج رواں کے نیچے کوئی جل پری بھی ہو

کہتے ہیں ایک اچھا شاعر شعر کی کائنات اجال دیتا ہے۔اگر ایسا ہے تو اردو کے قارئین، ناقدین اور مولفین کیلئے شمس اعجاز کے دو شعر کافی ہو سکتے ہیں۔

گھر باندھنے کی مجھ سے حماقت نہ ہو سکی
ہاں آسمان چھونے کی کوشش ضرور کی

مجھے سمجھانے والے تو بہت تھے
سمجھنے والا کوئی بھی نہیں تھا

غزل سے دور اعجاز نے لوک پال بل گفتگو کی تیاری (پاکستانی پس منظر) کرپشن، آر ایس ایس کا خواب، ماحول، قذافی کی موت، اختلاف، گجرات، فرد جرم، جنگل کا قانون، نئی پود، اخبار، گلی کے کتے ،باسی خبریں، احساس دروں اور انجام کی تفتیش جیسے عنوانات پر ان گنت قطعات کہے ہیں۔مسجد اس عنوان پر ان کا مشہور قطعہ ہے۔

بانگی نے اپنے فن کا نمونہ لگا دیا
پنکھا نیا نکال کے جوتا لگا دیا
چندے میں جو ملا اسے متولی کھا گئے
مسجد کو پیش امام نے چونا لگادیا

اس فانی نظام کو خیر باد کہنا تو ہے۔ نیا کلام، نئی جہد، نئے لوگ، نئے قارئین، ناقدین، ناصحین مقربین تو آتے جاتے رہیں گے لیکن جو چلے گئے ان کے حقوق کے بارے میں ہم اردو والوں کو سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔ ورنہ ہمارا ادبی ورثہ بوریوں میں بندھا رہ جائے گا۔ کچھ عرصہ بعد بھوکی دیمک اسے چاٹ جائے گی۔ شمس اعجاز اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

اک کام رہ گیا ہے وہ کرنا چاہئے
بس جی چکے بہت ہمیں مر جانا چاہئے

☆☆☆☆

اولوالعزم اور سرگرم عمل شاعر — اثرؔ قادری مینانگری

قیوم اثرؔ

مشہور زمانہ شاعر حضرت ادیب مالیگانوی نے ۱۹۷۰ء میں اثر قادری مینانگری کی تخلیق 'چاک سحر' پر اپنی طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ اولوالعزم اور سرگرم عمل شاعر ہیں۔ ترقی پسند اور جدید شاعری کے احساسات کو اپنے زیر قلم لاتے ہوئے آپ (ادیب صاحب) نے یہ بھی کہا کہ 'چاکِ سحر' میں 'سورج کو چونچ میں لیے مرغے کا کھڑا رہنا' جیسے مفاہیم نہیں ملتے یعنی اثر قادری کی شاعری میں وہ ترقی پسندانہ خیالات اور جدیدیت کی بو باس نہیں ملتی جس کو آج کا دور دلچسپی کا ہی نہیں بلکہ شعر و سخن کا ایک اہم اور ناقابل فراموش حصہ گردانتا ہے۔

'چاک سحر' پر محبوب الحق ارمان برہانپوری یوں رقمطراز ہوئے:

جذبات و کیفیات ہیں تصنیف سے عیاں
چاکِ سحر تمہارا ہے اک شاہکار اثرؔ

یہ بھی سچ ہے کہ کسی کا کلام یا نثر بغرض اظہار خیال کسی کے ہاتھوں پڑے تو موصوف اپنی قدر و منزلت کا بھی خیال رکھتا ہے۔ آسمان کے قلابے بھی ملائے جا سکتے ہیں۔ یہاں یکطرفہ اظہار کسی فنکار کو فن کی تکمیل کے سیدھے راستے فراہم نہیں کرتا۔ عام طور پر اس بات کو بھولا جا رہا ہے۔

دور حاضر میں نعت گوئی کا فن بھی ترقی کے آسمان چھونے لگا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نعت کے لغوی معنٰی سے کافی دور بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن لفظوں اور تراکیب کے استعمال پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے والے اثر قادری نے ایسا نہیں کیا وہ بہت سمجھ بوجھ کے ساتھ گویا ہوئے۔

جس پہ صدیوں سے ستاروں کی لگی تھیں نظریں
اے اندھیروں کے خداؤ! وہ سحر تو دیکھو
سارے عالم کو دیا درس محبت جس نے
ایک 'اُمّی' کا یہ عرفانِ نظر تو دیکھو

کربلا کے واقعے کو مختلف دور میں الگ الگ انداز سے پیش کیا۔ہاں یہ واقعہ ضرور ہے کہ مفہوم کو تبدیل نہیں ہونے دیا۔شہادتِ امام حسینؓ کو اثر قادری نے اپنے انداز میں بیان کر کے زبان کی سلاست اور روانی کو بھی اچھی طرح پیش کیا ہے۔'شہید اعظم' اس نظم سے یہ شعر ملاحظہ ہو۔

زمینِ کربلا کو تاج رفعت اس پہنایا
فلک کو سرنگوں کر کے بساطِ خاک پر لایا

اللہ کی حمد وثناء اور اظہار تشکر کا انداز بھی اثر قادری کے یہاں کم مایہ نہیں ہے۔وہ پوری طرح 'التحیات' کی طرح بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہو جاتے ہیں۔جہاں روحانیت اور مادیت دونوں کا امتزاج تخلیق کاری میں قابل قدر بن کر سامنے آجاتا ہے۔اثر قادری کا یہ اعتراف ہے کہ؛

ذہن و فکر رسا دیا تونے
دل کو غم آشنا کیا تونے
تیرا احسان ہے میرے معبود
مجھ کو شاعر بنا دیا تونے

جیسا منصور کے ساتھ ہوا۔ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں حق پرستوں اور انقلاب کی آواز بلند کرنے والوں کو مصلوب کر دیا گیا۔ظلم وستم کی انتہائی تاریک داستانیں رقم ہوئیں۔اسی کے پیش نظر قادری پھر رقم طراز ہوئے۔

فسردہ چہرے ،تپیدہ جگر ،نگاہیں گم
قدم قدم پہ مصائب ہیں بے شمار ہنوز
ہے جرم ،اہل صداقت کا سانس لینا بھی
وہی زمانے میں باقی ہیں انتشار ہنوز

اثر قادری نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔نظم ،نعت ،حمد ،منقبت ،غزل ،مرثیہ وغیرہ وغیرہ میں وہ اپنے تخلص کے زیر اثر رہے ہیں۔وہ بزرگان دین کی خدمات کو بھی زیور فکر سے آراستہ کرتے رہے ہیں۔ان میں وہ بلا تفریق مسلک اپنی فکر کو صفحہ قرطاس پر لاتے رہے ہیں۔جوان کی تحریر کا خاصہ بھی کہلایا۔جیسا کہ 'چاکِ سحر' داؤدی بوہرہ طبقے سے تعلق رکھنے والے سیدنا حکیم الدین ولائی جن کا مزار برہانپور میں ہے پر ایک منقبت لکھ کر اپنی فکری جہت کو بھی آشکار کیا ہے لیکن منقبت کا بلاشعر اعتراض کی نظر سے بری نہیں لگتا۔

مرے آقا ،مرے یاور حکیم الدین مولائی
خدا کے دین کے رہبر حکیم الدین مولائی

اشہ قادری غزل میں نئے مضمون کی تلاش ضرور کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ شعر کی تکمیل کے بعد یہ بات بھول جانے لگے کہ ایسے مفاہیم انیک جگہوں پر برتے گئے ہیں۔روانی میں یہ ہوتا بھی ہے۔

اے دوست عنایت ہے کچھ گردش دوراں کی
کچھ تیرا ارادہ بھی شامل نظر آیا
ہم ہیں کہ وفاؤں کی رکھتے ہیں امید اس سے
وہ ہے کہ جفاؤں پر مائل نظر آیا

بہر حال ان کا مجموعہ قابل صد ستائش ہے۔اگر قارئین دلچسپی کا مظاہرہ کریں!!

☆☆☆☆

خاندیش میں نظم ونثر کا نادر المثال شہنشاہ ۔ ناظرؔ انصاری

مضمون نگار	:	معین الدین عثمانی
تاریخ پیدائش	:	یکم جون ۱۹۵۴ء جلگاؤں
تعلیم	:	ایم اے بی ایڈ
مطبوعات	:	متحرک منظر کی فریم، نجات، ادبی معاصرین کا مطالعہ
پتا	:	۲۶۴ر شاہو نگر، جلگاؤں 9420390562

سرزمین خاندیش ادب کے معاملہ میں شروع ہی سے بڑی زرخیز رہی ہے۔ اس کی ادبی تاریخ کی ہر دہائی نے ایک نئے فنکار سے متعارف کرایا ہے۔ یہاں کی ادبی دستاویز کے اہم ستونوں میں جہاں اطہرؔ جلگانوی اور ایمانؔ بیاولی کا نام لیا جاتا ہے وہیں نثری میدان کا تذکرہ بھی صد احترام مرحوم غلام محمد ناظرؔ انصاری کے بغیر کسی صورت مکمل نہیں ہوسکتا۔ ناظر انصاری ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف تاریخ داں اور محقق تو دوسری طرف صحافی اور مترجم کے علاوہ ایک بہترین شاعر و افسانہ کی خوبیوں سے بھی آپ کی شخصیت مالامال تھی۔

ناظر انصاری کا تعلق تہذیب و ثقافت کے مرکز شہر نصیر آباد سے تھا۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں اردو نارمل اسکول سے آپ نے ٹیچرز ٹریننگ کا کورس مکمل کیا۔ کچھ عرصہ تک کھنڈوا (مدھیہ پردیش) میں مدرس کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔ بعد ازاں وہاں سے مستعفی ہوکر ۱۹۳۰ء میں جلگاؤں میونسپل میں ملازمت اختیار کرلی اور آخری ایام تک اسی سے وابستہ رہے۔ شاعری کا ذوق چونکہ بچپن ہی سے تھا اسی لیے طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ ابتدائی کلام نے بھی دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ انداز کا پیارا پن بھی ملاحظہ کیجئے۔

کسی کے حسن کی رنگینیوں کا پوچھنا کیا ہے
اودھ کی شام دیکھی اور بنارس کی سحر میں نے

جب علامہ محوی صدیقی سے وابستہ ہوئے تو آپ کے شہ پاروں میں مزید نکھار آیا۔ مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آپ نے محض شاعری پر ہی اکتفانہ کیا اسی کے ساتھ نثری میدان میں بھی وہ پیش رفت فرمائی کہ جس کی نظر خاندیش کی تاریخ بمشکل ہی پیش کر سکے گی۔ ''آہنگ ادب'' آپ کے نثری شہ پاروں کا ایسا مجموعہ ہے جو اس دور کے قدیم وجدید شعراء کی بصیرت افروز کاوشوں کا نادر المثال نمونہ پیش کرتا ہے۔ پیش لفظ کے طور پر خلیل الرحمن اعظمی یوں رقمطراز ہیں کہ ''ناظر صاحب کی تعلیم و تربیت اگر چہ قدیم انداز میں ہوئی ہے لیکن انھوں نے قدیم وجدید ہر طرح کے شعراء کا بڑے شوق سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے کلام کے اہم خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان سے متعلق رسائل و کتب میں جو معلومات ملتی ہے ان سے حسب دل خواہ استفادہ کیا ہے۔ ان کے مضامین پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ انہوں نے اپنے ذہن کے دریچے کھلے رکھے اور اردو شعر و ادب کے تازہ میلانات سے آشنائی حاصل کرنے میں کسی طرح کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ غزل ان کی پسندیدہ صنف تھی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن سے ان کے عمیق مطالعے اور فکر کی گہرائی کے راز افشاں ہوتے ہیں۔

عشق عظمت مقام ہے اب تک
عقل انساں کی خام ہے اب تک

خواہش دید ہی نہیں ورنہ
جلوۂ یار عام ہے اب تک

رحم آتا ہے ابن آدم پر
خواہشوں کا غلام ہے اب تک

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر انسان کی تحریر اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ناظر انصاری ایک معلم تھے اس لیے ان کے مضامین میں بھی جا بجا فہمائشی انداز کا پایا جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ شعراء کی بھیڑ سے کسی شاعر کا نثر کی طرف مراجعت میرے خیال سے کسی معجزہ سے کم نہیں۔ شعراء کی بہتات شروع ہی سے قائم ہے اور مفکرین کے تجزیہ کے مطابق یہ سہل پسندی کا نتیجہ ہے۔

عبدالقوی دسنوی نے ''آہنگ ادب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ ''اگر غور سے دیکھا جائے تو تحقیق و تنقید کے میدان میں جس قدر کام ہونا چاہئے تھا ابھی اس میں کافی کمی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ میدان کافی دشوار گزار ہے۔ محققین اور ناقدین کو بہت عرق ریزی اور کاوشوں سے کام لینا

پڑتا ہے تب جا کر وہ فنکاروں کی ذہنی سطح سے آگاہ اور ان کے شعور وافکار سے روشناس ہوتا ہے۔ آج کل سہل پسندی کا رجحان پیدا ہوگیا ہے۔ اس لیئے زیادہ تر لوگ ادب کے انھیں میدانوں میں اپنے جوہر دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں کسی قسم کی دشواری، مشکل اور محنت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس لئے وہ لوگ قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ادب کے اس حصے سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا اور مختلف وقتوں میں اردو کے قدیم وجدید شعراء کے کلام کا جائزہ مختلف زاویوں سے لیتے رہے اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے رہے۔

جہاں نثر کے میدان میں معروف کہلائے وہیں نظم کے کینوس پر بھی انفرادیت قائم کی ہے۔ انوکھے موضوعات برتنے میں ناظر انصاری صاحب کو دسترس حاصل تھی۔ مفاہیم کا مثبت پہلو ناظرؔ صاحب نے اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ اپنے فطری احساس سے رہبری کا کام بھی لیا کرتے تھے اور اپنی شاعری کے توسط سے مساوات اور حب الوطنی کے نادر خیالات کا بھی اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اپنی ہستی کا جو ناظر اسے عرفاں ہوجائے
ہے جو اک قطرۂ ناچیز وہ طوفاں ہوجائے
فیضِ ساقی سے نہ محروم کوئی رِند رہے
میکدے میں جو مساوات کا ساماں ہوجائے
لہک اٹھے تری کوشش سے گلستان وطن
پھر ترے خون کے چھینٹوں سے بہاراں ہوجائے

علامہ محوی صدیقی نے خیابان تاریک کے دیباچہ میں یوں فرمایا تھا کہ ناظرؔ نے ایسی صنف کو اپنی شاعری کیلیئے انتخاب کیا ہے جسے اور شعراء نے بہت کم چھوا ہے جو اپنے معنوی لحاظ سے بہت ضروری اور قابل التفات ہے۔ ناظرؔ انصاری نہایت ہی خلیق اور ملنسار طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی ذات سے استفادہ کرنے والا طبقہ آج بھی جلگاؤں میں موجود ہے جو ان کے لگائے ہوئے درخت کے سائے میں اپنا سفر نہایت ہی طمطراق سے پورا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ناظرؔ صاحب کے مزاج کا ظریفانہ پہلو پہلی ہی ملاقات میں ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنالیا کرتا تھا۔ بات میں بات بنانے کا ہنر تو گویا انھیں کا خاصہ تھا۔ اگر دورانِ گفتگو کسی کی دل شکنی کی ہلکی سی جھلک بھی انھیں محسوس ہوجاتی تو وہ خاص طور پر متعلقہ شخص سے رجوع کر کے معاملہ صاف کر دیتے تھے۔

ادب ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا ایسا کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ کیونکہ تا عمر وہ اس کی آبیاری کے لیے کوشاں رہے۔ جو کچھ بھی کمایا وہ سب اس کی نذر کر کے خاندیش کی روایت مستحکم کرنے کی سعی فرمائی۔ حالانکہ مالی اعتبار سے وہ ایسے نہ تھے کہ شب وروز ادب کی محفلیں سجاتے مگر معلمی کی معمولی سی تنخواہ سے جو کچھ پس انداز ہوتا اسی سے یہ سب کچھ بھی کیا کرتے تھے۔

دوسروں کی حوصلہ افزائی ان کا ایک ایسا وصف تھا جو دیگر افراد میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ موصوف نو واردان ادب کے لیے ہمیشہ کوشاں رہا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں کی اصلاح سے لیکر مطالعہ کے لیے کتب کی فراہمی تک کا کام وہ بڑی خندہ پیشانی سے کیا کرتے تھے۔ آج جلگاؤں میں جو کچھ بھی ادبی سرگرمیاں جاری ہیں آپ اگر ذرا غور فرمالیں تو ان کی تہوں میں آپ کو ان ہی کی محنتوں کی بو باس محسوس ہوگی۔

سیاحت کے شوق نے بھی انھیں کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا حالانکہ ان سب کے لیے ان کے معاشی حالات رضامند نہ تھے مگر تیز رو پانی جس طرح اپنا راستہ خود ہی متعین کر لیتا ہے عین اسی طرح وہ بھی سیاحت کے لیے کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ ہی لیا کرتے تھے۔ ''آہنگ ادب'' کی طباعت سے لیکر اس کی نکاسی کے لیے بھوپال اور علی گڑھ کا سفر ہمیشہ ان کے تذکروں میں رہتا تھا۔ وہ پاکستان جانے کے بھی خواہشمند تھے مگر حالات کی ستم ظریفی مانع رہی اور یہ بھی ایک حیران کن معاملہ ہے کہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں ان کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

ایمان بیاولی کی شاعرانہ قدر و قیمت

نام	:	سید عبدالقیوم
قلمی نام	:	قیوم رازؔ
والد	:	سید عبدالغفار (مرحوم)
سن ولادت	:	۱۵ر جولائی ۱۹۵۰ء
تعلیمی لیاقت	:	بی اے بی ایڈ (انگریزی) ایم اے (اردو)
پیشہ	:	سبکدوش سیکنڈری جونیئر کالج لیکچرار
ادبی ذوق	:	شاعری، افسانہ نویسی، تنقید و تبصرہ
پتا	:	مارول، تعلقہ بیاول، ضلع جلگاؤں 09545221496

میں اپنے عزیز دوست شیخ رفیق شیخ محبوب معروف بہ نام آر۔ایم۔شیخ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انھیں کی بیش قیمت ادبی سرگرمی اور فعال محبت ادب کے اور ان کے معاونین و اراکین ابوالکلام آزاد ساروجنک واچنالیہ بیاول کے زیر اہتمام تجدید اشاعت دیوان بیاولی بہ نام 'فروغ جہاں عرف چراغ ایمان' کو دوسری بار حیات نو نصیب ہوئی اور مجھ کم فہم کو اپنے وقت کے استاد شاعر کو پڑھنے، سمجھنے، پرکھنے اور نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ شیخ رفیق کے تعارض مضمون 'خاندیش کے شعری شعور کو ایمان بخشنے والا شاعر۔ایمان بیاولی' سے مجھے معلوم ہوا کہ موصوف کا پورا نام محمد عباس حسین اور ایمان تخلص تھا۔ان کے استاد ادب موسیٰ عرب کلیم تھے۔ایمان کے بیشتر کلام کا میرٹھ سے شائع ہونے والے 'جلوۂ یار' مدیر محمد شریف خان اور 'زبان اردو' جیسے رسائل میں شائع ہونے کا ذکر ہے۔بعد از کوشش بسیار بھی یہ دونوں رسائل کہیں دستیاب نہیں ہوسکے۔رفیق صاحب نے مشاعروں میں شہرت اور کلام میں ندرت و حلاوت کو بھی وجہ شہرت بتایا ہے۔مہاراشٹر سے باہر یو پی میں بھی ان کی قدر افزائی کی بات کی ہے۔ملک کے ہر حصہ میں ایمان کے شاگردوں کی موجودگی کا ذکر بھی موجود ہے۔ایمان کے مجموعۂ

کلام بہ نام 'فروغ جہاں عرف چراغ ایمان' ۱۹۲۶ء میں نورانی پریس میرٹھ سے شائع کیے جانے کی تصدیق کی ہے۔ قیاساً بیشتر اصناف مثلاً نظم، سلام، مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کا ذکر کیا ہے۔

موضوعات شاعری کے لحاظ سے عشق کو بنیاددی موضوع قرار دیا ہے اور ان کی شاعری میں رنگ تصوف کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ عناصر کی بھی نشاندہی کی ہے جو ان کو عام زندگی کا کامیاب مترجم شاعر قرار دیتے ہیں نیز یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ ایمانؔ کا کلام ان کی ذاتی زندگی ہی پر روشنی نہیں ڈالتا بلکہ ان کے دور کے حالات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی وہ رومانی شاعر ہی نہیں تھے بلکہ عصری حسیت آشنا بھی تھے۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے کے مصداق۔ معلوم ہوا کے انداز میں ان کے ایک خورشید نامی طوائف سے گہرے لگاؤ کا ذکر بھی کیا ہے اور وہ بھی یہاں تک کہ عشق میں دیوانگی کے سبب ایمانؔ کے دیدۂ حسرت زدہ کو خورشید کی کھڑکی سے ٹانک دیا ہے اور انتظار دید میں ۱۹۳۶ء میں شہید محبت قرار دیا ہے۔ یہی نہیں خورشید کے عشق کو علامتی عشق قرار دیتے ہوئے اس میں جلوۂ خدا تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس سرسری شخصی وشاعری کے تعارف سے آگے بڑھتے ہوئے میں نے مضمون کے پہلے حصہ میں بھی ان کے کچھ اشعار کی مدد سے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ آیا آج کے دور میں بھی ان کے کچھ اشعار باعث دلچسپی اور بہ لحاظ مضمون آفرینی اور معنی آفرینی، سوانحی رنگ شاعری سے آگے غزل کے عمومی مفاہیم کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں اور یہ کہ وہ ہماری کلاسیکی لوازمات شاعری سے بھی لیس ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ دیوان ایمان میں خورشید کے نام سے بہت سے اشعار منسوب ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

میرے خورشید کے چہرے کے مقابل ایمانؔ
دیکھ لو چرخ پر شرمندہ قمر ہے کہ نہیں

میں نے اس شعر کو خورشید نامی طوائف کے تناظر میں نہیں، ادبی اور عمومی معاشرتی تناظر میں دیکھنے، پرکھنے اور ایمانؔ کی شاعرانہ قدر کے تعین میں بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اس شعر میں 'خورشید' 'ایمان' اور 'دیکھ لو' کا مخاطب کوئی بھی تین اشخاص ہو سکتے ہیں۔ یوں یہ شعر تین اشخاص کے درمیان مکالماتی اور ڈرامائی رنگ لیے ہوئے ہے۔ تلمیحی اشارے کو بروئے کار لائیں تو محبوب ومحب کا رشتہ صحابہ کے جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں حضرت محمدؐ مہتاب رسالت کی تمثیل بھی ہو سکتا ہے۔ غزل اگر عمومیت کی طرف دار شاعری ہے تو یہ شعر آفاقی اہمیت کا حامل قرار پاتا ہے۔ علاوہ ازیں شاعر کی رومانی افتاد طبع کا بھی غماز ہے۔ سوانحی رنگ شاعر بھی نمایاں کرتا ہے۔ ظاہر شواہدں سے آگے متن میں اتر کر دیکھیں تو فنی لحاظ سے

خورشید، چہرہ، قمر، چرغ کے مناسبات لفظی نے معنوی لحاظ سے شعر کے مصرعوں کو باہم مربوط اور رنگا رنگ کر دیا ہے۔ 'دیکھ لو' کے تخاطبی فقرے نے متکلم اور مخاطب اور حاضر تینوں کی یکجائی سے خوبصورت مکالماتی رنگ اختیار کرلیا ہے۔ سوال وجواب اور دعویٰ و دلیل کی صورت حال بھی واضح ہے۔ موضوع عمومی سہی انداز بیاں کی خوبی اور شاعرانہ ہنر مندیوں نے شعر کے حسن اور طاقت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ یوں معمولی مضمون سے پر لطف شعر تعمیر ہو گیا ہے۔

عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف جست، تصوف کی دین ہے۔ بھگتی تحریک نے بھی اسے بڑی قوت عطا کی تھی۔ بے ثباتی دنیا کے مضامین کو انھیں دو تحریکوں کے اثرات سے جلا ملی۔ ایمانؔ کے یہاں بھی بے ثباتی دنیا کے مضمون پر مبنی اشعار ہیں۔ ایک شعر پیش ہے۔

پھول جتنے تھے اڑا کر لے گئی باد اجل
ہائے اک جنگل کی صورت گلشنِ عالم ہوا

صراحتی الفاظ سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ شعر روایتی مگر موثر طریقہ سے برتے گئے اشعاروں اور تشبیہات اور 'ہائے' جیسے اظہار افسوس اور رنج والم ظاہر کرنے والے لفظ کی یکجائی سے دلنشین اور پر اثر ہو گیا ہے۔ پھول، باد اجل، جنگل، گلشن عالم کے مناسبات نے اپنا کام بخوبی انجام دیا ہے۔

تصوف برائے شعر گفتن خوب است کی گونج ہماری شاعری میں فارسی سے داخل ہوئی۔ دور بعید میں میرؔ، دردؔ اور قریب میں اصغر گونڈوی اور کسی حد تک جگر مرادآبادی کے کلام میں صوفیانہ رنگ و بو کا چلن عام رہا ہے۔ اسی روایت کی پاسداری میں ایک اور شعر پیش ہے۔

یاد آتی ہے کلام اللہ کی
دیکھتے ہیں جب ترے رخسار ہم

میرؔ نے اس موضوع کو نہایت شوخ اور رفیع انداز میں بخوبی برتا ہے۔

تیرا رخ مخطط قرآن ہے ہمارا
بوسہ بھی دیں تو کیا ہے ایمان ہے ہمارا

ایمانؔ کا مضمون وخیال بھی ابتذال سے مبرا ہے۔ تخیل کی پرواز بلند ہے۔ کلام اللہ اور رخسار جیسی مرئی اشیائی جنھیں دیکھا، چھوا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھیں ٹھوس اور مادی اشیاء کے ذریعہ جذبہ عشق کا اظہار عمدہ پیرایۂ بیان ہے۔ اسی کو شاید شاعرانہ جادو بیانی کہتے ہیں جس کے نہ ہونے سے شعر محض منظوم بات ہو کر رہ جاتا ہے۔ لفظ 'تیرے' کی عمومیت بھی قابل توجہ ہے۔ رخسار محبوب کے بھی ہو سکتے

ہیں اور کسی معصوم بچے کے بھی۔ کسی بھی ماں کے رخسار اولاد کی نظر میں اس احترام محبت کا حق رکھتے ہیں ۔اس کے علاوہ ہماری نعتیہ شاعری میں والّیل جن کی زلفیں، والشمس جن کی صورت جیسی تشبیہات بھی نبی کریمؐ کے لئے جانی مانی ہیں ۔اگر مشرقی شعریات اور خصوصاً ہماری کلاسیکی اصطلاحات کو تازہ کیا جائے تو اس شعر میں مضمون آفرینی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی ۔کلام اللہ اور رخسار میں کنایے اور استعارے کا حسن بھی نمایاں ہے۔ کفایت لفظی کا یہ عالم ہے کہ شعر میں کوئی لفظ حشو یا زائد نہیں ہے ۔الفاظ کم معنی زیادہ شعر کی بڑی خوبی ہے۔

کیا مرا ایمان چھینے گا وہ بت
مجھ میں جب تک طاقت ایمان ہے

ایمان اور بت کی متضاد مناسبات سے صرف نظر کرتا ہوں ۔لہجہ کی برجستگی اور متکلم و مخاطب کی موجودگی نے شعر میں ڈرامائیت پیدا کر دی ہے ۔ایک واقعہ ایک کہانی ترتیب دی جا سکتی ہے۔ کہتے ہیں شاعر، شعر کہنے کا مالک ہوتا ہے ۔اس نے کہہ دیا تو شعر صرف اس نہیں رہ جاتا سامعین کا بھی ہو جاتا ہے ۔الفاظ کے تانے بانے اور تخیل کے زور سے جو معنی وہ اخذ کر لیں درست قرار پاتے ہیں ۔اس طرح دیکھیں تو شعر میں ایمان بیا ولی کی پارسا عبادت گزار، شوہر پرست کو جب کسی نے آ کے خبر دی کہ ایمانؔ خورشید نامی کسی بت طناز کے شیدائی ہو گئے ہیں تو ایمان کی بیوی نے برجستہ کہہ دیا:

کیا مرا ایمان چھینے گا وہ بت
مجھ میں جب تک طاقت ایمان ہے

اس معنی کے لحاظ سے 'میرا ایمان' کیا خوب فقرہ ہے۔

ایمانؔ کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جو مخصوص سماجی، مذہبی اقدار کے روشنی میں قول زریں ہو گئے ہیں ۔یہ شعر کہاوت کے درجہ کو پہنچ گئے ہیں۔ مقرر اسے جوش بیان میں بلند بانگ لہجہ میں پڑھ کے سامعین کو پر جوش کر سکتا ہے ۔اور جیسا کہ ان دنوں ماحول ہے نعرہ تکبیر کی صدا بلند ہو سکتی ہے ۔فنی وفکری لحاظ سے اس شعر کی سطح زیادہ بلند نہیں ۔مگر کسی شعر کا قول زریں بننا محدود طبقہ ہی کے لئے سہی شاعر کی شہرت کا سبب ضرور بن جاتا ہے ۔یہی اس شعر کی خوبی اور عیب ہے ۔ایسے اشعار ہر اچھے برے شاعر کے یہاں آ جاتے ہیں ۔یہ کوئی عیب بھی نہیں کہ شاعری میں تک بندی اور قافیہ پیمائی آ ہی جاتی ہے ۔یہ بات بھی سچ ہے کہ شاعر ہر وقت آسمان سے تارے توڑ کر نہیں لا سکتا۔

اگر میں کام لوں آہ فغاں سے
وہ آجائے زمیں پر آسماں سے

آہ فغاں خدا کو مظلوم کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہی مضمون شعر ہے۔ جذبہ کی شدت، بندش کی چستی الفاظ کی سلاست اور روانی نے شعر کو پر اثر بنا دیا ہے۔ 'کام لینا' محاورے کا برجستہ استعمال ہوا ہے۔ شعر کی قرأت بلند آہنگ اور خود کلامی کے انداز میں بھی کی جا سکتی ہے۔ مجرد خیال پر شعر کی عمدہ تعمیر ہوتی ہے۔ ٹھوس الفاظ کی غیر موجودگی کے باوجود زاویہ نگاہ چونکانے والا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ شعر اگر تہہ دار نہ ہو، بیانیہ ہو مگر ندرت خیال اور اچھوتا نقطہ نظر ہو تو شعر غیر معمولی ہو سکتا ہے۔

بے ثباتی دنیا کے مضمون پر مزید ایک شعر کا بیان جملہ معترضہ کے طور پر پیش ہے۔

کیا گدا کیا شاہ سب ہیں رنج و غم میں مبتلا
شادماں بیٹھا ہے زیر آسماں کوئی نہیں

پہلا مصرعہ پند و موعظت کا انداز لیے ہوئے ہے۔ رائے زنی نمایاں ہے۔ مگر دوسرا مصرعہ بے ساختہ ہے اور اولی کی دلیل کے بطور خوب ہے۔ غزل کے عمومیت پسند موضوع خیال اور طرز اظہار نے شعر کو آفاقی صورت حال کا ترجمان بنا دیا ہے۔ شاعر دنیا بھر کے دکھی انسانوں کا ترجمان بن گیا ہے۔ اردو شاعری میں آسمان کو ستم ایجاد مانا گیا ہے۔ تمام بلائیں وہیں سے نازل ہوتی ہیں۔ شعر میں یہ روایتی استعارہ بہ خوبی استعمال ہوا ہے۔ معاشرتی قدر کے خانے میں یہ شعر ضرب المثل ہو گیا ہے۔ جسے تحریر و تقریر میں بطور حوالہ استعمال کیے جانے کا شرف حاصل ہے۔ بے ثباتی دنیا اور اس سے وابستہ مضامین، خیالات اور احساسات کا اظہار اردو شاعری کی روایت بھی ہے اور آبروئے غذل بھی۔ غم بیش قیمت سرمایہ حیات ہے۔ دنیا وہ ظلمت کدہ ہے جو غموں کے نور سے پر نور ہے۔ غم پائیدار قدر شاعری ہی نہیں قدر زندگی بھی ہے۔

لاکھ سکّے دل میں داغ غم کے ہیں
قحط سالی میں بھی ہم زردار ہیں

سکوں کے پردے میں داغ غم کا اظہار اور قحط سالی میں زردار ہونے کی تخیلی دلیل نادر انداز بیان ہے۔ دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی۔ مرئی اشیاء کے ذریعہ غیر مرئی خیال کو بہ خوبی منظری اور محسوس سطح پر لایا گیا ہے۔ مایوس کن صورت حال کو گوارہ انداز میں بیان کرنا چہ خوب است۔ مفلسی کا ایسا شوخ اور بیباک اظہار کرنا معمولی شاعری نہیں۔ طنز کی باوقار لہر بھی قابل قدر ہے۔ جذبہ قناعت کی صوفیانہ تعلیم

بھی نمایاں ہے ۔ مایوسی کفر ہے۔ ہر فکر کو دھوئیں میں اڑا کے ہمت سے زندگی گزارنا ضروری ہے۔ بیان کے جادو اور پیرایۂ اظہار کے حسن نے شعر کو پاٹ دار اور کاٹ دار بنا دیا ہے۔ خیال محسوس سطح پر منظر ہو گیا ہے۔

چرچے گھر گھر ہو رہے ہیں تم سدا پردے میں ہو
کھل گیا پردہ کا پردہ واہ کیا پردے میں ہو

پردہ کھلنا محاورہ ہے۔ پردہ کا پردہ کھلنا اور بھی دلکش انداز بیان ہو گیا ہے۔ شعر کے مجازی اور حقیقی معنی کے درمیاں 'واہ' کے لفظ نے طنز کے پہلو کو یا شوخ بیانی کے پہلو کو بہ خوبی ادا کر دیا ہے۔ کون سا راز اور کیسا پردہ کے گرد پھیلے ہوئے اسرار نے شعر کو معنی خیز بنا دیا ہے۔ کون سا راز یا کون سا عیب پردہ دار ظاہر ہوا ہے اس کا بیان بھی اشاروں کنایوں میں ہے۔ زور تخیل کو ہوا دی گئی ہے۔ تعریف اور شوخ طنز کی یکجائی اور پس پردہ معشوق کی جلوہ نمائی رنگ تغزل بھی ہے اور تصوف بھی۔

ان کی محفل سے نکلنے کا تجھے کیوں غم ہوا
شکر کر اے دل کہ حاصل رتبۂ آدم ہوا

غم شعر کا بنیادی لفظ ہے۔ شعر میں حضرت اور انسان کو ایک سطح پر لانا تلمیح کو ذات اور کائنات سے جوڑ دینا خوب بیان ہے۔ عظمت آدم اور عظمت غم کا بیاں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ سے ہوتا ہوا ہم تک آیا ہے۔ یہ گونج ہنوز جاری ہے۔ غالبؔ نے اسی مضمون کو عجب طنطنے سے اپنے خاص انداز میں بغیر وضاحت سوال کی صورت اور طنز میں ڈبو کر بے مثال بنا دیا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مذکورہ بالا قدر فکر انگیز اور آج کے دور میں بھی باعث کشش اشعار کے بعد ایمانؔ کے کلام کے اس اہم اور بنیادی طرز شاعری کو دیکھ لیں جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس ضمن میں ایمانؔ نے اپنے تخلص کو مختلف رنگ شاعری سے خوب رنگ دیا ہے۔ جہاں تک ایمان بیا دولی کے مسلمان یا کافر ہونے کا مسئلہ ہے وہ بھی مذہبی نہیں ہے۔ شاعر عموماً نہ مسلمان ہوتا ہے نہ کافر۔ ایمان نے اردو شاعری کی روایت کی پاسداری میں اپنے تخلص کا بخوبی استعمال کیا ہے اور مضمون آفرینی کی راہ نکالی ہے۔ فصیح بیانی کے ہیرے موتی لٹائے ہیں۔ ایمانؔ نے اپنے تخلص کو روشن شاعری کے تحت برتتے ہوئے مضمون آفرینی کے خوب مواقع پیدا کیے ہیں۔ درج ذیل اشعار پیش ہیں۔

ایمان کیا غضب ہے مسلمان ہو کے تو
اسلام سے بتوں نے ترا دل پھرا دیا

عشق میں آنچ آگئی ایمان کے ایمان پر
کیا غضب کی آگ ہے جس سے کھرا زر جل گیا

دین بگڑے یا رہے ایمان جائے یار ہے
صدق دل سے ایک بت پر میں تو قربان ہو گیا

ایمان ہیں کیوں کا فرو دیندار میں جھگڑے
کعبہ ہے کسی کا ،تو ہے بت خانہ کسی کا

شاد عارفی نے کہا تھا:

دس پانچ برس حضرت حالی کی طرح شاد
مجھکو بھی جنون لب و رخسار رہا ہے

شاد نے تو اپنے عشقیہ مجموعۂ کلام کو نذر آتش کر کے طنز کی راہ آختیار کر لی تھی مگر ایمان بیاولی کا جنون لب ورخسار پانچ دس برس کا نہیں تمام عمر کا وظیفہ شعر و سخن تھا۔ اس روایتی رنگ تغزل کی پرورش اور ترقی بہ حیثیت استاد غزل ان کی ادبی ذمہ داری تھی۔ اس ذمہ داری کو بھی انھوں نے بخوبی عروج تک پہنچایا۔ ان کی شاعری مجموعی طور پر روایتی عشقیہ ،رسومیاتی ،طربیہ زیادہ اور المیہ کم انداز فکر و بیان کی ترجمان ہے۔ چراغ ایمان میں اطہر جلگانوں کی غزل ایمان کے مضامین و اسلوب شاعری کے لیے عمدہ اظہار عقیدت ہے۔ اطہر فرماتے ہیں:

نئے استعارے نئی بندشیں ہیں
زباں صاف و شستہ مزہ کلام

ہے ہر اک غزل درد کی داستاں
ادائے بیاں خنجر بے نیام

جناب منشی غلام محی الدین خان صاحب اختر نے مضمون آفرینی کی تعریف میں یوں کہا ہے:

نہیں اس کو دیوان کہنا بجا
یہ گل ہائے مضموں کا ہے بوستاں

مذکورہ بالا تناظر میں تشبیہ ،استعارہ ،محاورہ ،رعایت لفظی ،اور مضمون آفرینی سے مزین چند اشعار

پیش ہیں، لطف اٹھایئے:

ہٹا لیجے رخ سے زلفِ سیاہ کو　　یہ کافر کو کیوں دینداروں میں رکھا

عاشق ابرو ہوں میں بعد فنا　　قبر کھدوانا مری تلوار سے

کر کے الفت ابروئے خمدار سے　　عمر بھر رگڑا گلا تلوار سے

عشق میں گر مزہ نہیں ہوتا　　کوئی تم پر فدا نہیں ہوتا

''ندا فاضلی نے کہیں لکھا ہے: نوح نے داغ کی فصاحت اور سلاست کو اپنا شعری معیار بنایا اور اسی دائرے میں استادی کا کمال دکھایا۔ ان کی شاعری کا مجموعی مزاج زبان کی صناعی ہے، محاوروں کی رعنائی اور قافیہ و ردیف کی چوکسائی ہے۔ نوح نے داغ کی زبان کو زیادہ سلیس اور بول چال کے قریب کہا۔''

نوح کے تعلق سے کہی گئی جملہ باتیں ایمان بیاولی کی طرز شاعری اور مقصد شاعری پر بھی صادق آتی ہیں۔ دونوں ہم عصر اور اساذ الشعراء تھے۔ ایمان نے داغ کے شوخ اور رنگ اور بلا تکلف لہجے کی بھی خوب آبیاری کی ہے۔ یہی نہیں رعایت لفظی سے کلام کو رنگارنگ کے مضمون آفرینی اور کسی حد تک معنی آفرینی کی عمدہ مثالیں بھی اپنی شاعری میں قائم کی ہیں۔ وہ اس دور میں بھی دلچسپی اور قدر کی نگاہ سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان کو قریب کریں۔ پڑھیں، پرکھیں اور ان شاعرانہ اقدار کا تعین ان کے دور کی فکری اور فنی بنیادوں پر استوار کریں۔ آج کے مقابل ان کی شاعری کو رکھ کے پامال، دوراز کار، لکھنوی چوماچاٹی کی متبذل شاعری کہہ کے رد کرنا مبنی بر انصاف عمل نہیں ہوگا۔ روایت سے بغاوت ہر وقت اور جگہ درست نہیں ہوسکتی۔ روایت وہ بنیادی پتھر ہے جس پر ہر نئی عمارت ادب تعمیر ہوئی ہے۔ یہی نہیں نئی عمارت کی تعمیر و توسیع بھی جاری ہے۔ ہمیں روایت کو بہ نظر احترام نہ صرف دیکھنا بلکہ سمجھنا اور اس سے مستفیض بھی ہونا چاہیے۔ یوں ایمان بیاولی کے دیوان کا مطالعہ ہمارے لیے بامعنی ہوجائے گا اور ہماری روایت کی دریافت نو سے ہمیں اعتماد کے ساتھ اس کی توسیع اور تعمیر کی راہیں تلاش کرنا بھی آسان ہوجائے گا۔ بہ صورت دیگر بقول قیوم راز

نظر انداز کرتا ہے متاعِ علم جو وارث
کتابیں چاٹ کر دیمک برادہ چھوڑ دیتا ہے

☆☆☆☆
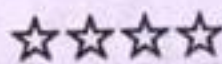
سید ناظر علی حامد علی۔ رفیق مارولی

''وہ جو یادوں میں مسکراتے ہیں'' ماضی کے جھروکوں سے

قیوم راز

سید ناظر علی مرحوم میرے بڑے چچا تھے۔عالم دین تھے۔ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، لمبا کرتا، سر پر بارہ گزی صافہ، گفتار میں نرم، خاندان کے بڑے کرتا دھرتا تھے۔غزل اور نعت گوئی دونوں میں ملکہ حاصل تھا۔میرے بچپن کا زمانہ، مارول کے آسمان ادب میں منور ایک کہکشانی زمانہ تھا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

سردارِ کاروان شعراء، سید عبداللہ میاں امیر علی، عزیز مارولی، گردوں فاروقی، ظفر مارولی، محمد علی کاوش، عزیز علی وصیت علی عزیز، انجم مارولی، ساجد الفاروقی، ممتاز علی ممتاز قلندر علی رضوان، علی محمد عابد، درویش اختر اور ان کے ساتھ ہاتھ پکڑ کر چلنے والے شعراء میں قیوم راز اور کچھ بعد کی نسل، اشفاق نظامی، اخلاق نظامی، نزاکت علی نزاکت، ایک ابھرتی ہوئی مزاحیہ سنجیدہ آواز عزیز احمد عزیز اور کچھ بعد کی نسل، مجید آتش۔ایسی بزرگ قدر بزرگ اور نو مشق شعرا سے سجی ہوئی یہ محفل ادب میں رفیق مارولی بڑے متین، نرم لہجے میں اپنا کلام سناتے اور داد بٹورتے تھے۔محمد علی کاوش، سید برکت علی جناب مرحوم، سید سعید حافظ سر اور ظفر علی ظفر کے مکان باقاعدہ ماہانہ نشستوں کے انعقاد میں نمایاں جگہیں اور نشستوں کی کامیابی کی ضمانت کے ٹھکانے تھے۔میرے والد مرحوم سید عبدالغفار، حکیم حاذق اور شعر و شاعری کے رسیا شاہ جی جناب مرحوم مشاعروں کے انعقاد میں مگن رہنے والے شخص خوب خوب مشاعرے کرواتے۔سامعین کا ایک جم غفیر میلے ٹھیلے کا سماں پیدا کر دیتا تھا۔کیا بڑے کیا بچے، گلی گلی گھر گھر شعر گنگنائے جاتے تھے۔آج بھی مارول کے عام آدمیوں اور بچوں میں ایسے بچے ہیں جنہیں کتنے ہی شعر یاد ہیں اور جو موقع بہ موقع گرہ لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔

رفیق صاحب کے انتقال کے بعد میں نے جیسی کہ امید تھی ان کی ڈائری تلاش کرنا چاہا۔پتہ چلا کہ

ایک لمبا کوٹ کھونٹی میں لٹکا ہوا ہے جس میں وہ اپنے تمام کاغذات رکھتے تھے۔دیکھا تو کاغذات لگدے میں تبدیل تھے۔میلاد خوانی کی بیاض سے دو نعتیں ملیں۔نمونے کے طور پر وہی پیش ہیں۔کاش ان کا کلام محفوظ ہوتا۔مگر کیا کیا جائے مارول کے جملہ بزرگوں کا یہی طرۂ امتیاز تھا۔میرے شکر ے مصداق

تشہیر و تعارف سے دوری میں گزاری ہے　　یہ عیب ہمارا ہے یہ خوبی ہماری ہے

نمونہ کلام نعتیہ ہی دستیاب ہوا ہے۔جو قدر غزلیہ بھی ہے۔

کس کی تصویر مری آنکھوں میں کھنچ آئی ہے
فکر رنگین ہے جذبات میں رعنائی ہے
کون کر سکتا ہے یہ کام محبت کے سوا
گھر میں یعقوب ہیں اور مصر میں بینائی ہے
گم ہوئے کوچۂ جاناں میں رفیق ہم جا کر
دامن یار میں کیا چین کی نیند آئی ہے

طاؤس حرم بن کر جب روح پھرے میری
مٹی میری طیبہ کی مٹی میں ملا دینا
اللہ کا دیا سب ہے پھر بھی یہ تمنا ہے
کچھ اپنی طرف سے بھی محبوب خدا دینا
اچھے ہو رفیق اچھے گر اب بھی سنبھل جاؤ
جو کچھ بھی ہوا گزرا، سب دل سے بھلا دینا

گردے سرِ رسوائی وقفِ درِ جاناں تا
چل سوئے مدینہ چل اب اے دلِ دیوانہ
دوڑا ہوا آپہنچا مداحِ نبی کہہ کر
رضواں نے رفیق ہم کو جب دور سے پہچانا
اے ساقیٔ بطحہ تم سیراب اسے کردو
ہے شیشۂ دل میرا چھلکا ہوا پیمانہ

(یوم پیدائش: یکم جنوری ۱۹۱۸ء/متوفی: ۲۸/اپریل ۲۰۱۰ء)

دعاؤں میں اثر کا طالب:
سید کرامت علی عرفان علی مارولی

قیوم رازؔ

بڑے شریف النفس، سادہ طبیعت، ملنسار بزرگ تھے۔ تعلیم یوں ہی سی تھی مگر تربیت اخلاص اعلیٰ تھی۔ ان کی ضخیم ڈائری تلاش کی گئی۔ اوراق کٹے پھٹے، بوسیدہ، سیاہی جگہ جگہ اڑی ہوئی یا اتنی پھیکی کہ پڑھنا ناممکن۔ اسی لیے مختصر نمونہ کلام پیش ہے۔ یہ کارِ بے مایہ ممکن ہے آخرت میں کار پر مایہ ثابت ہو۔ اسی امید کے ساتھ۔

نعت پاک

اے عرب کے چاند بتلا کونسی منزل میں ہے
عرش کے ہے بام پر یا فرش کی محفل میں ہے
ڈوب جاتا ہوں میں تیرے عشق کے سیلاب میں
ڈوبنے والے کا دل بھی حسرتِ ساحل میں ہے
عمر بھر کا ہو یہاں پھر بھی نہ کم ہوں خوبیاں
وہ صفت ہے آپ میں جو کب کسی کامل میں ہے
دیکھا جب مجھکو تو اس دم اہل محفل نے کہا
ہے یہ مداحِ نبی اب نہ کسی شاغل میں ہے
اب زمانے میں نظر آتی نہیں خوبی حضورؐ
ہے اگر خوبی تو بس قرآن کے عامل میں ہے
ڈھونڈا بیتابی میں بھی حضرت کونی اے نفیسؔ
وہ نظر آتے نہیں اور یاد انکی دل میں ہے

قطعہ

زباں میں میری ہو جائے اگر اتنا اثر پیدا
بیان شام میں چاہوں تو کردوں پھر سحر پیدا
میری گفتار پر آنسو زمانہ کیوں بہاتا ہے
خدا چاہے تو اشکوں سے بھی کرتا ہے گوہر پیدا

غزل

کہیں ہے تذکرہ غم کا کہیں دکھ کا فسانہ ہے
مگر تیر نظر کی زد پہ میرا آشیانہ ہے
کیا حیران گردوں تیری گردش نے زمانے کو
نشیمن پر میرے کیا اب تجھے بجلی گرانا ہے

قطعہ

کسے دیکھا بلندی پر کسے دیکھا ہوں پستی میں
سبق کافر بھی پھر لینے لگے مومن کی بستی میں
تیرا ہی نام لینے سے ملی توقیر ہستی میں
جبین شوق جھکتی ہے میری وحدت پرستی میں

دعا

دعاؤں میں اپنی اثر مانگتا ہوں
خدا سے محمد کا در مانگتا ہوں
مقدر کی تاریکی مٹ جائے یارب
کہاں کوئی شمس و قمر مانگتا ہوں
جو جلوؤں کو تیرے بھی دیکھے الٰہی
وہی تجھ سے میں چشم تر مانگتا ہوں
طلبگار ہوں دام و درہم کا نہیں ہوں
نہ میں کوئی لال و گہر مانگتا ہوں
زمانے کو پابند اسلام کردے
دعا تجھ سے شام و سحر مانگتا ہوں
خبردار ہے تو ہی سارے جہاں سے

تجھ ہی سے میں اے باخبر مانگتا ہوں
جب دنیا عقبیٰ میں پہنچے گی ہر دم
نفیس ان سے ایسی نظر مانگتا ہوں

مظالم مسلم

قومِ مسلم کا لہو اور اتنی ارزانی کے ساتھ
تم نے بھی دیکھا اسے بہتے ہوئے پانی کے ساتھ
ہر طرف ظلم و فساد و سازشوں کی دھوم ہے
کیا یہی سوجھی ہے نادانوں کو نادانی کے ساتھ
حق پرستوں کا لہو تو رنگ لائے گا ضرور
مل ہی جائیگا یہ بدلہ ان کو آسانی کے ساتھ
اس جہاں والے جہاں پر ناز ہی کرتے رہیں
میں نے تکیہ کردیا ہے فضل ربانی کے ساتھ
صبر کا پیمانہ بھی لبریز شاید ہوگیا
ظلم کی حد چکی ہے نوع انسانی کے ساتھ
رات دن فتنے پہ فتنے ہی اٹھاتا جائے ہے
کارِ انساں کا علاقہ کار شیطانی کے ساتھ
چھیڑنا خدا والوں کو بھی اچھا نہیں
ان کی ٹھوکر کھیلتی ہے تاج سلطانی کے ساتھ
آگیا ان کا ہی کچھ اقبال گردش میں نفیسؔ
ٹھوکریں کھاتے پھریں گے وہ پریشانی کے ساتھ

(پیدائش: ۱۸؍جنوری ۱۹۲۲ء　　وفات: ۱۵؍دسمبر ۲۰۰۶ء　　تخلص: نفیس مارولی)

☆☆☆☆
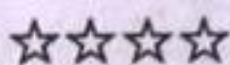
”ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے“
ساجد الفاروقی

قیوم راز

برادر تحال حمید الدین چھوٹے صاحب، ادبی نام ساجد الفاروقی۔ ہر کسی کی رحلت پر جون ایلیا مجھے اپنا شعر پڑھتے سنائی دیتے ہیں ؎

یہ مجھے چین کیوں نہیں ملتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

زندگی عناصر میں ظہور ترتیب ہے جسے موت کی بے رحم آندھی آ کے پریشان کرتی رہتی ہے۔

عجب دستِ اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے پھول چننا اور ویرانے میں رکھ دینا

موت سے کسی کو رستگاری نہیں کیا بادشاہ، کیا فقیر، کیا ظالم، کیا مظلوم سب اس کے آگے بے بس ہیں۔
جانے والے چلے گئے مگر ان حضرات کی یادیں اور ان کے کلام کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی محفل میں آج بھی گنگنائے جاتے ہیں۔ انسان مرجاتا ہے لفظ زندہ رہ جاتے ہیں۔ اتنے جانے والوں ہی کا غم کیا کم تھا کہ ۴/اگست ۲۰۱۶ء بروز جمعرات، شام چار بجے، ہنستے، بولتے حمید الدین چھوٹے صاحب نے بھی اہلِ کاروان کو داغ مفارقت دے ہی دیا۔ اِناللہِ واِنا اِلیہِ راجعون۔
ساجد الفاروقی، مجموعۂ کلام ”بوئے گل“ کے خالق، کہنہ مشق شاعر، مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول ،فیضپور کے سابق پرنسپل، طلباء وطالبات کے ہر دلعزیز استاذ، مدرسہ اُمّ المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے بانی نگراں ومہتمم، بزم ارتقائے سخن مارول کے صدر اور عظیم مبلغ دین تھے۔
اب مارول کی گلی کوچے اس پاٹ دار آواز کو کبھی نہیں سنیں گے جو ہاتھ میں ٹک ٹک کرتی لاٹھی لیے ،خمیدہ کمر، کشادہ پیشانی، زندگی سے بھرپور بڑی بڑی کٹورا آنکھیں، سر پر سفید براق ٹوپی، اور ڈھیلے

ڈھالے ملائی لباس، سفید لباس کے ساتھ راستے سے گزرتی ہوئی کسی اسکولی لڑکی کو گلے میں دوپٹہ لپیٹے دیکھتی تو فوراً ادب سے روکتی اور کہتی ''میری پیاری بیٹی اوڑھنی سر پر اوڑھنے کے لئے ہوتی ہے گلے کو پھانسی دینے کے لئے نہیں۔'' کسی نوجوان کو صفاچٹ دیکھتی تو مسکراتے ہوئے کہتی ''ماشاء اللہ! بڑے خوبصورت ہو، داڑھی رکھ لیتے اور زیادہ خوبصورت ہو جاتے۔'' محفلِ شعر و سخن میں کبھی کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش آجایا کرتا تھا۔ آج کے نوجوان ہی نہیں بچے بھی منہ پھٹ ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی نہ کوئی ساجد الفاروقی کی نصیحت کا ترکی بہ ترکی جواب دے دیتا تھا۔ ایسے موقع پر ساجد الفاروقی کی بزرگانہ ،حکیمانہ روش آج سب کے لیے قابل تقلید ہے۔ آپ سامھے والے کی بے نقط سنائی گئی کو سر جھکائے ادب کے ساتھ سن لیتے اور خموشی کے ساتھ یا زیر لب مسکراتے ہوئے دھیرے سے آگے بڑھ جاتے ۔ نہ آنکھوں میں خفگی نہ چہرے پر غصہ۔ یہ بزرگانہ بلند کرداری ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی ۔ اللہ جسے چاہے بخش دے۔ خوش مزاجی، ظرافت، نرم دلی، رواداری اور بردباری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر کسی سے بے تکلف ہو کے ملتے۔ حال احوال پوچھتے۔ ہر کسی کو اس کے صحیح اور مکمل نام سے پکارتے۔ اس عربی ادبی طرزِ تخاطب سے ناواقفیت کی بنا پر مخاطبین ناراض بھی ہو جایا کرتے۔ بے نقط بھی سنا دیتے مگر آپ قطعی برا نہ مانتے۔ قطع تعلق کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ شاعرانہ نشستوں میں جب چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ رہے تو اپنے بیٹوں یا خود نوجوان شعرا کا سہارا لے کر بزم میں حاضر ہو جاتے۔ نوجوان اور نومشق شعرا کی دل کھول کر پذیرائی کرتے۔ مجھ سے بے حد قریب تھے۔ ضخیم بیاضِ شعر (جس میں ۳رسو غزلیں، کئی نظمیں، گیت اور نعوت تھیں) کے گم ہو جانے کا ذکر بڑے درد کے ساتھ کرتے تھے۔ یادداشت کے سہارے کئی برسوں میں گمشدہ کلام کے کچھ حصہ کی بازیافت ہوئی جو ''بوئے گل'' کی صورت میں اپریل ۲۰۱۲ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ کاشیہ مجموعہ کمپوزنگ کے اغلاط کی نذر نہ ہوتا!!!

خاکہ نگاری سے صرف نظر کرتا ہوں۔ ساجد الفاروقی کی ادبی قدر کا تعین بھی ہونا چاہیے۔ مارول کے ادب فہم حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ آپ مارول ہی میں نہیں ضلع جالگاؤں میں بھی اردو شاعری اور اردو تہذیب کا عمدہ نمونہ تھے۔ غزل، نظم، گیت جیسی اصناف پر بامحاورہ دسترس رکھتے تھے۔ علمی فکری وقار کے ساتھ احساس کی شدت اور شگفتہ انداز تحریر ان کی خاص خوبی ہے۔ فرد اور معاشرے میں ہم آہنگی کا خواب دیکھتے رہنے کی وجہ سے طنز کی شمولیت نے بھی ان کے کلام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ ہندو موعظت کے ساتھ اجزائے دل کی شمولیت نے ان کے کلام کو دل آویز بنا دی ہے۔ مارول میں ان کی

طرح شعر و سخن سے دلی لگاؤ رکھنے والا کوئی دوسرا شاعر شاید موجود نہیں۔ آپ علامہ اقبال کے شعر کے مصداق تھے ؂

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جتنے چاؤ سے ڈوب کر شاعری کرتے تھے اتنے ہی چاؤ سے پڑھتے بھی تھے۔ کتنی ہی معذور کر دینے والی بیماریوں کا شکار ہونے کے باوجود ہمت کے دھنی تھے۔ بیماری بٹھا دیتی تو وہ یا اللہ کہہ کر کھڑے ہو جاتے بلکہ چلنا بھی شروع کر دیتے۔ شاعری ہو یا تقدیر تا گفتگو موقع اور مطلب کی زبان اختراع کر لیتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی، مراٹھی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ کاش وقت بہ وقت ادب کے بدلتے دھاروں پر بھی نظر رکھتے اور فنی معاملات کی باریکیوں پر بھی غور کرتے تو اردو ادب کی تاریخ میں اپنا نام ضرور درج کرواتے۔ مگر جس مقام پر ہیں وہ بھی خوش نصیبوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اقدار کی پامالی، خود غرضی، لوٹ مار کا بازار گرم ہو تو، اشاریت، رمزیت اور سرگوشی کی جگہ بلند آہنگی، خطیبانہ انداز اور ہر ینہ گوئی ادب کی نہ کہی وقت کی ضرورت بن ہی جاتی ہے۔ ادب زندگی کا مظہر ہے اور خطیبانہ اندازِ تکلم بھی ادب ہی کا ایک رنگ ہے۔ یوں ساجد الفاروقی کی شاعری بلا راست اور بالراست دونوں طرز ہائے سخن کو نمایاں کرتے ہوئے اپنے مقام معتبر پر متمکن ہو گئی ہے۔

بزم شعرا میں سراپا محترم اور ذی وقار
تیرے جیسا دوسرا کوئی کہاں سے لائیں گے

نذرانہ عقیدت بہ رنگ خاکہ نگاری پیش کر کے رخصت چاہوں گا۔

☆☆☆☆
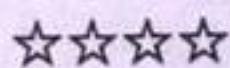
بڑی داستانیں رکھنے والا شاعر: محشرؔ مصطفیٰ آبادی

مضمون نگار	:	پروفیسر انصاری محمد عمران
قلمی نام	:	عمران انصاری
تاریخ پیدائش	:	یکم جون ۱۹۵۴ء
تعلیم	:	ایم اے
پیشہ	:	سبکدوش (درس وتدریس)
پتا	:	چنار گلی، چوپڑا، ضلع جلگاؤں 9890856619

ادب اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ان کے زیر اثر اٹھنے اور چلنے والی تحریکات سے منہ موڑ کر کوئی بھی ادب زندہ نہیں رہ سکتا۔ اردو ادب بھی اپنے زمانے کے حالات سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ اردو غزل ہمیشہ سے ان تحریکات کی آئینہ دار رہی ہے۔ اردو کی ادبی تحریکات بھی اپنے زمانے کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کے زیر اثر پروان چڑھی ہیں اور انہوں نے ادب کو متاثر کیا ہے۔ لیکن برصغیر کی ادبی تاریخ اس بات کی بھی گواہی دیتی ہے کہ اس میں کچھ تحریکیں وہ بھی ہیں جو سراسر مغرب سے مستعار تھیں اور انھیں ہمارے ادب پر کبھی عقلیت پسندی کے نام پر تو کبھی تقلید پسندی کے مرغوب ذہنی رویے کے تحت ہوادی گئی تو کبھی کھلی ادبی دہشت گردی کے نتیجے میں انہیں تھوپنے کی شعوری کوششیں کی گئی ہیں۔ لیکن اردو ادب کا یہ بھی ایک روشن پہلو ہے کہ بہت شعراء اور ادبا ان تحریکوں سے اور ان کے آغاز وارتقاء سے ایک زمانے تک یا تو اس سے نابلد ہوتے ہیں یا ان پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دیتے اور جب انہیں ہوش آتا ہے تو وہ تحریک اپنے انجام کے بہت قریب پہنچ چکی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا ایک بہت بڑا حصہ ان قدیم روایات کی پاسداری کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے جو زمانہ قدیم سے رائج ہیں اور ہمارے شعراء وادبا کو ورثے میں ملتی چلی آئی ہیں۔

اردو میں ترقی پسند تحریک کے بعد جدیدیت کی تحریک سب سے زیادہ توانا اور دوررس اثرات مرتب کرنے والی تحریک تھی۔ترقی پسند تحریک نے اردو غزل کو قابل گردن زدنی صنف قرار دے کر ایوان ادب سے خروج کا اعلان کر دیا تھا۔لیکن بعد میں غزل کی سخت جانی کا اسے بھی اعتراف کرنا ہی پڑا۔جدیدیت نے جہاں ادب کی دوسری اصناف کو متاثر کیا اور ادب کو عوام کے درمیان سے نکال اسے خواص کی مجلسوں کا ہمنشیں بنا دیا وہاں تنگنائے غزل سکڑنے کی بجائے پھیلتا ہی رہا اور جدیدیت کی اندھی اور تدبر سے عاری تقلید کے نام پر لایعنی اصطلاحوں، وحشتناک حد تک جذبات سے عاری اور خوفناک حد تک گنجلک ادبی رویئوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے ہتھیار نہیں ڈالے اور عوام کے دلوں کے قریب رہنے کا اپنا قدیم راستہ ڈھونڈ لیا اور اسی پر محو خرام رہی اور ہلکے گہرے نقوش چھوڑتی آگے بڑھتی رہی۔

اردو کا شاعر اس بانکی تیکھی صنف کی زلف کا اسیر رہا ہے۔محشر مصطفی آبادی بھی اسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے اور زندگی بھر اس کی ناز برداری کرتے رہے۔وہ خاندیش کے شہر چوپڑہ کے رہنے والے تھے۔شعر گوئی کا آغاز تو بچپن ہی میں کر دیا تھا۔شروع شروع میں اپنے گھر میں اپنے والد محترم سے اصلاح لیتے رہے لیکن فن پر دسترس کی وجہ سے بہت جلد خود استادی کے مرتبے کو جا پہنچے۔ان کی شاعری پر جوانی اس وقت آئی جب وہ ملازمت کے سلسلے میں بھساول گئے۔یہاں کے ہونے والے آل انڈیا مشاعروں میں شرکت نے ان کے اسپ شہرت کو پر لگا دیئے اور وہ اونچی اور لمبی اڑانیں بھرنے لگے۔

محشر بنیادی طور پر استاد تھے اور ہمیشہ قدروں کی متلاشی اور جویا رہے اور اسی کی سیوا میں لگے رہے۔وہ حیات انسانی میں صالح قدروں کے رچاؤ اور ان کے مقام سے بخوبی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے شاگردوں میں بھی وہی قدریں پروان چڑھیں جن کی خدمت گزاری میں انہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ گزار دیا ہے۔یہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا بھی ہوتا ہے اور دشوار گزار بھی۔اس دشوار گزار راستے پر قدم قدم پر امتحانات ہوتے ہیں۔گھاٹیاں، کھائیاں، چوٹیاں اور دشواریاں راستہ روکتی ہیں تو کہیں آگ کا دریا ہوتا جس میں ڈوبے بغیر پار نہیں اترا جا سکتا۔اس راستے کے رہروان پر کبھی طنز کے تیر برستے ہیں تو کبھی نظر انداز کر دیئے جانے والی بے حسی کے عفریت منہ کھولے ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس راہ کے اکثر مسافر یا تو تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں یا پھر ان کا شکار ہو کر اپنے فن سے توبہ کر لیتے ہیں اور اسطرح اپنا وجود تک کھو بیٹھتے ہیں۔

محشرؔ نے جس زمانے میں شاعری کا آغاز کیا ترقی پسند تحریک بھی عروج پر تھی ۔ساحرؔ، کیفیؔ، جاں نثار اخترؔ ،سردار جعفریؔ، مجازؔ، جوشؔ اور فیضؔ جیسے شعراء کی آوازوں سے اردو کا ایوان گونج رہا تھا۔ ادب عوام کے دلوں پر راج کر رہا تھا۔ مگر دوسری طرف یہی وہ زمانہ بھی ہے جب ایک دوسری بڑی ادبی تحریک اپنے پر پرزے نکال رہی تھی اور اپنے بازو پھیلا رہی تھی ۔ جدیدیت کی لہر تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی اور اچھے اچھے شعراء اس کے دائرہ سحر سے مسحور ہو رہے تھے۔ لیکن یہی وہ زمانہ بھی تھا جس میں فانیؔ ،جگرؔ اور حسرتؔ موہانی کی غزلوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ محشرؔ کی طبیعت موزوں تھی ۔شاعری ورثے میں ملی تھی ۔ان کا ان توانا ادبی آوازوں سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ انہوں نے ان سب کو خوشہ چینی کی ہے لیکن اپنی انفرادی شناخت قائم رکھنے میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں ۔ان کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ان آوازوں میں اپنی آواز کو گم نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی کسی ایک سر سے سر ملانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ان کی غزلوں میں اور ان کے اشعار میں بہت سے ایسے شعر مل جائیں گے جو ان کی اپنی پہچان ہیں اور یہ ایک بڑا کارنامہ ہے ورنہ اکثر شعراء کے یہاں صرف بازگشت ہی سنائی دیتی ہے اور ان کی اپنی آواز سنائی نہیں دیتی۔

محشرؔ غزل کے شاعر تھے اور ان کے اشعار میں موضوعات کی کوئی کمی نہیں تھی ۔انہوں نے بے شمار موضوعات کو اپنے اشعار میں باندھا ہے اور کہیں پر اپنی شاعری اور اپنے فن کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے ۔ان کی غزلوں میں خالص غزل کے اشعار بھی کثرت سے مل جاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار دیکھئے

محفل بھی وہی شمع کے جلوے بھی وہی ہیں
لیکن ہمیں حاصل کہاں پروانہ نگاہی

یہ کس مقام پر اے عشق آگیا ہوں میں
کہ ہر کسی سے پتہ اپنا پوچھتا ہوں میں

مداوا اور پھر زخم جگر کا
توقع اور پھر دست حنا سے

چاند تاروں میں ڈھونڈ محشرؔ کو
کیوں کہ رہتا ہے وہ حسینوں میں

ہوئیں پر نور آنکھیں اور پائی دل نے تابانی

وہ رشک انجم و مہتاب جب بالائے بام آیا

کرتا ہوں تیرے نقش قدم ہی پہ میں سجدے
شرمندۂ صد ہوش مری بے خبری ہے

زمانہ گوش بر آواز ہے اب تک اسی جانب
نہیں معلوم تم نے ہم کو کیا کہہ کر پکارا تھا

اس حسن مجسم کی تعریف ہے نا ممکن
بس اتنا سمجھ لیجے ہے ایک ہزاروں میں

الفاظ و بیاں اس کی تشریح سے سے قاصر ہیں
جو بات وہ کہہ گزرے مبہم سے اشاروں میں

آنکھوں میں تری صورت ہاتھوں میں ترا دامن
کیا گردش دوراں ہے اب میری بلا جانے

ہے جہاں میں یوں تو سب پر غم زندگی کا سایہ
یہاں چاکِ دل ہے کوئی، کوئی چاکِ پیرہن ہے

وہ آئے میرا نظمِ مقدر سنوارنے
جن کی زلف میں ہیں کئی پیچ و خم ابھی

داغِ فراق، دردِ محبت، غمِ حیات
یہ سب نہ دل میں ہوں تو نکل جائے دم ابھی

ان اشعار میں فکر صالح کے رچاؤ، لہجہ کی شیرینی اور خیالات کا فطری بہاؤ، قلب وجگر کی ٹھنڈک اور روحانی تسکین کا سبب بن جاتے ہیں تو کہیں غمِ حیات سے نبرد آزما ہونے کا اٹوٹ عزم اور حوصلہ بھی فراہم کرتے ہیں۔

محشرؔ اسی دنیا کے انسان تھے۔ انہوں نے انسانوں کے درمیان زندگی گزاری ہے۔ ان کی غزل میں عصر حاضر کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں اس دنیا اور خاص طور پر ان کے آس پاس بسنے والے انسانوں کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کا ایک واضح تصور رکھتے ہیں۔ یہ تصور انہیں ان کے تجربات نے عطا کیا ہے۔ موجودہ دنیا میں ہونے والے انسان اور انسانیت سوز واقعات انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ ایسے کسی بھی واقعہ یا حادثہ پر یا صرف اس کی خبر پر بھی تڑپ

کر رہ جاتے ہیں۔انسان کا انسان پر ظلم انہیں ایک روحانی کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔وہ انسان کی اپنے مرتبے سے تنزلی پر افسردہ اور دل برداشتہ بھی ہوتے ہیں۔انسان کی مطلب پرستی،خود غرضی ،دھوکہ دہی،بے راہ روی پر کڑھتے بھی ہیں لیکن امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں جاتا۔وہ آج کے دور کے انسان پر،اس کے قول وفعل کے امتیاز پر طنز کے تیر برساتے ہیں لیکن ضرورت پڑنے پر اس کے زخمی دل پر محبت وانسانیت کا مرہم رکھنے کو بھی تیار رہتے ہیں۔وہ اسے اپنے اونچے مقام سے آگاہ کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے۔جہاں ان کے ان اشعار میں ان کے تجربات کی بازگشت سنائی دیتی ہے وہیں ان میں عصر حاضر کی دنیا بھی بے نقاب نظر آتی ہے۔محشرؔ کے یہاں ایسے اشعار بھی بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں۔مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

پیغمبران امن کے ہاتھوں میں تیغ کیوں
اس مسئلے پر آج کوئی سوچتا نہیں

آج کے دور میں جینا کوئی مشکل تو نہیں
شکل پر ایک نئی شکل سجالی جائے

ہمدرد،مہربان،محبت،وفا،خلوص
وہ کون سی ادا تھی جو قاتل نہیں ملی

دنیا میں عہد نو کی وہ پستی ہے کون سی
معیارِ زندگی میں جو شامل نہیں ملی

ہوا خلاف،جہاں منحرف،فلک دشمن
مگر یہ ہم کہ نشیمن بنائے جاتے ہیں

ڈھونڈ لیتا میں خود اپنی منزل
مجھ کو دھوکہ دیا رہبری نے

اُف!دورِ ترقی میں افلاس کا عالم
بازار میں بک جاتا ہے فنکار کا فن بھی

وہ لوگ جنھیں محشرؔ انسان کہا جائے
اب کون سی بستی میں بستے ہیں خدا جانے

صرف داغِ سجدہ سے کھلتا نہیں چہرے پہ نور
سوزِ دل بھی ہے ضروری بندگی کے واسطے

بستیوں میں آبسے ہیں جنگلوں کے بھیڑیے
آدمی کوئی نہیں اب آدمی کے واسطے

آسماں سے پرے ہیں پروازیں
یوں تو مشت غبار ہیں ہم لوگ

رہبروں کی رہزنوں سے تونہیں ہے ساز باز
قافلے لٹتے چلے ہیں رہبری کے بعد بھی

محشرؔ اور ان کی شاعری کے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر میں یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ خدا نے انہیں فطرت شناس دل عطا کیا تھا۔ وہ خاموشیٔ لالہ وگل سے کلام پیدا کر سکتے تھے اور اس کا ہنر بھی جانتے تھے جیسے ؎

پوشیدہ کیسی آگ ہے فصلِ بہار میں
شمعیں گلوں کی جلنے لگیں لالہ زار میں

بہاریں خود جنوں ساماں ہیں ہر جانب گلستاں میں
مگر الزام رکھا ہے گلِ صد چاک داماں پر

گلستاں پر آگیا ہے جھوم کر ابرِ بہار
دوش پر الجھی ہوئی یہ زلف جانانہ نہیں

مگر ایسا لگتا ہے کہ ان کے مرغِ تخیئل پر ہمیشہ ان کے تجربات ومشاہدات کا اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ان کے حسی وجذباتی تجربات کا کڑا پہرا رہا اور انہیں کبھی ان سے آزاد نہ ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی محبوب صنف غزل کی زلف میں ایسا الجھے کہ پھر کسی اور طرف دیکھنے کی ان کو مہلت نہ ملی۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ ؎

زمانہ ہم کو ابد تک پڑھے گا اے محشرؔ
ہم اپنے ساتھ بڑی داستان رکھتے ہیں

☆☆☆☆

ادیب، صحافی، مترجم، کہانی کار، نباض مقرر، مدرس وماہر تعلیم: اکبر رحمانی

مضمون نگار : محمد مشتاق عبدالکریم

قلمی نام : مشتاق کریمی

آمد : ۱۱ر مارچ ۱۹۶۶ء

نقوش : اپنی مٹی (بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ)، بتائے نہ بنے! (مضامین کا مجموعہ)

مشن : درس وتدریس، صحافت

انعامات : جو لوٹا دیئے ان کا تذکرہ کیا!!

پتا : ۳۴۲ شنی پیٹھ، جلگاؤں 0902822348

کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جن میں صلاحیتوں کی بہتات ہوتی ہے۔ مگر نامساعد حالات ان کے پیروں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ کبھی یہ زنجیر عزم، حوصلہ اور جہد مسلسل کی گرمی سے موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر وہ مختلف شعبہ جات میں ترقی کی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں اور اپنے کارناموں کے ایسے نشانات چھوڑ جاتے ہیں جو تاریخ کا روشن باب بن کر سبھی کو متوجہ کرتے ہیں۔ ایسے ہی افراد میں مرحوم اکبر رحمانی صاحب کا شمار ہوتا ہے۔ جو معروف ادیب بھی تھے ، بیباک صحافی بھی، مشاق مترجم بھی تھے اور نباض مقرر بھی اور ان تمام صفات کے ہمراہ وہ ایک مشفق محنتی اور گنی مدرس بھی تھے۔

اکبر رحمانی سر کا تعلق غزنی کے لودھی پٹھانوں کے قبیلہ سے تھا۔ ان کا خاندانی ریکارڈ اس بات کی غمازی کرتا ہے۔ اس بات کے بھی شواہد ملتے ہیں کہ ان کے جدّ امجد محمد خان لودھی علاقہ غزنی سے ہندوستان تشریف لائے۔ یہ ابراہیم لودھی کے عہد کی بات ہے۔ مگر جنگ وجدل کی ہار جیت عوام کو

ہجرت پر مجبور بھی کر دیتی ہے۔ ابھی اکبر رحمانی کے جدِّ امجد محمد خان لودھی نے ہجرت کے بعد اپنی سانسیں درست ہی کی تھیں کہ بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست سے دوچار کر دیا تو یہ خاندان یہاں وہاں بھٹکتا ہوا راجستھان جا پہنچا۔ یہاں کی گرمی، صحرائی زندگی اور نامساعد حالات نے ایک مرتبہ پھر مجبوریوں کو سامنے لا کھڑا کیا انھیں تو ہجرت کی گاڑی پہ سوار ہونا ہی پڑا۔ دکن سے ہوتے ہوئے گنگاپور ضلع اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں سکونت اختیار کر لی۔

قسمت نے پھر اس خاندان کو گنگاپور سے جلگاؤں تلاش معاش کے سلسلہ میں پہنچا دیا۔ اکبر رحمانی کی پیدائش جلگاؤں میں ۱۷ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو ہوئی۔ ان کے والد رحمان خان ایک غریب مل مزدور تھے مگر تعلیم کی اہمیت سے نابلد بھی نہ تھے۔ انہوں نے ایک طرف پیٹ پر پتھر باندھا تو دوسری طرف اپنے خاندان کے چشم و چراغ کے کندھے پر اسکول کا میلا کچیلا بستہ لاد دیا۔ میونسپل اردو اسکول نمبر ۱۰ر میں ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد انھوں نے مادر علمی اینگلو اردو ہائی اسکول کا رخ کیا اور ۱۹۵۸ء میں ایس ایس سی امتحان کامیاب کیا۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ اکبر رحمانی سنجیدگی سے تعلیم بھی حاصل کرتے تھے اور خالی اوقات میں گلی محلوں میں دودھ تقسیم کر کے کچھ اجرت بھی کما لیتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غربت کی حکومت عام تھی۔ جس کے پاس سائیکل ہوتی وہ مالدار سمجھا جاتا۔ ہر چند کہ اپنے والد کی ایما پر اکبر رحمانی نے سائنس اسٹریم میں داخلہ لیا تھا تا کہ ڈاکٹر بن کر اپنے والد محترم کی خواہش کی تکمیل کر سکے مگر معاشی قافیہ تنگ ہونے کے سبب آرٹ فیکلٹی میں منتقل ہونا پڑا۔ بہر حال ان کے فرزند ندیم اختر نے امتیازی نمبرات سے بی یو ایم ایس کا امتحان کامیاب کر کے اپنے دادا جان کی خواہش کی تکمیل کر دی۔

اپنی تعلیم، خاندان کی کفالت اور علمی ادبی کاز کے لیے اکبر رحمانی سر نے کئی اسفار کیے۔ یہ اسفار مسلسل اور بار بار ہوئے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسفار بھی ان سے بیزار ہو گئے۔ کبھی پونہ، کبھی ممبئی تو کبھی کہیں اور اس پر خاندان کے افراد اور رشتہ داروں کے تقاضوں کا شور۔ اس شور اور محنت نے انھیں سخت جان بنا دیا تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر، ہوٹلوں کا کھانا، جہاں جیسے انتظام ہوا تھکن کے بستر پر سو جانا، پھر صبح تر و تازہ اٹھنا، پھر وہی گردش ایام، پھر وہی پیٹ کی آگ، پھر وہی ایندھن کا انتظام۔

انھوں نے ۱۹۶۲ء میں پونہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ اس سے بہت پہلے وہ اخبارات میں لکھتے لکھتے، جز وقتی نوکری کرتے کرتے اکبر خان سے اکبر رحمانی بھی بن گئے۔ ابتدائی درس و تدریس جی

ایس ہائی اسکول پاچورہ میں کی۔سرکاری وظیفہ پر ۱۹۶۴ء میں ایس ٹی کالج ممبئی سے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا۔ان کے عزیز دوست و ماہر تعلیم محمد حسن فاروقی ان کی کتاب تحقیقات و تاثرات میں اکبر رحمانی سر کی صلاحیتوں کو یوں سلام کرتے ہیں ''ہم بھی طلبہ کو بی ایڈ کا کورس ایک بوجھ معلوم ہوتا تھا لیکن اکبر رحمانی کے لیے وہ ایک کھیل تھا۔ان کے نکالے ہوئے نوٹس سے ہاسٹل کے بیشتر احباب استفادہ کرتے تھے۔کچھ کرنے اور ''کوہ کندن چاہ برآوردن'' کا عزم انھیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔''بی ایڈ کرنے کے بعد جی ایس ہائی اسکول پاچورہ اور پھر وہاں سے ۱۹۶۵ء میں اپنی مادر علمی اینگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔

یوں تو راقم الحروف کی پیدائش سے قبل اکبر رحمانی سر کی صحافتی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔جب ہم نے ہوش سنبھالا تو روزنامہ انقلاب میں ان کی خبریں اور مضامین دیکھے۔اسی طرح جب سید قاسم جلگانوی نے جلگاؤں سے جلگاؤں ٹائمز کا اجراء کیا تو اخبار کی کلیدی ذمہ داری ان کے مضبوط کاندھوں پر ہی ڈالی۔جلگاؤں نے سن ۷۰ کا ہولناک فساد دیکھا۔جس میں شر پسندوں اور فرقہ پرستوں نے ۴۰ سے زیادہ انسانوں کی ہنستی کھیلتی زندگی کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔اس فساد کی تحقیقات کے لیے مادن کمیشن کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ایک ہائی اسکول ٹیچر ہوتے ہوئے فسادات کی رپورٹنگ کرنا اور ظالمانہ کارروائیوں کو منظر عام پر لانا بہت مشکل امر ہوتا ہے۔کبھی یہ خیال بھی ذہن میں سر ابھارتا ہے کہ لاشعوری طور پر بھی اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو مستقل روزی روٹی سے ہاتھ دھونا پڑ سکتا ہے۔مگر اکبر رحمانی سر صرف مدرس ہی نہیں بلکہ ایک بیباک صحافی بھی تھے۔ہر چند کہ اس زمانہ میں ترسیل کے برق رفتار ذرائع موجود نہ تھے مگر اس کے باوجود ان کی بیباک رپورٹنگ دوسرے ہی روز اخبار کی زینت بنتی۔انھوں نے صرف اخبار کی رپورٹنگ تک ہی اپنا کام محدود نہ رکھا بلکہ مادن کمیشن کے سامنے سچے بیانات دینے کے لیے متاثرین کی حوصلہ افزائی بھی کی۔انھوں نے اس وقت یہ قطعی پرواہ نہیں کی کہ ایسا کرنے سے وہ ظالموں اور فرقہ پرستوں کے ٹارگیٹ پر آسکتے ہیں۔بہر حال ایمرجنسی کے ڈرائیکیولا نے انھیں بھی نہ بخشا۔غیروں کی سازش تھی یا اپنوں کی 'نوازش' اللہ جانے ،انھیں چند ماہ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔

جب بات ان کی صحافت کی چل پڑی ہے تو اس واقعہ کو بھی بیان کر ہی دینا چاہیے۔بات سن ۹۴ کی ہے۔جب ٹاڈا (Terrorist And Disruptive Activities) نافذ کر دیا گیا تھا۔اس زمانہ میں ایک معاملہ میں جلگاؤں میں بھی اس قانون کے تحت گرفتاری کی خبریں عام ہوئی

تھیں۔ان خبروں کے سبب مسلمانوں میں خوف وہراس کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ہر کوئی اپنے گھر میں مانو سمٹ کر رہ گیا تھا۔آنجہانی دیپک جوگ اس زمانہ میں ضلع کے ڈی ایس پی تھے۔ان سے قانونی لڑائی جہاں ایک طرف عبدالکریم سالار بڑی حکمت کے ساتھ لڑ رہے تھے وہیں دوسری طرف اکبر رحمانی نے مراٹھی روزنامہ لوک مت کے ادارتی صفحہ پر ٹاڈا کے مضر اثرات پر بڑی بیباکی سے ایک مضمون لکھ مارا۔ہر چند کہ یہ مضمون دیگر انگریزی اخبارات میں ٹاڈا کے منفی پہلوؤں پر ڈالی گئی روشنی کا احاطہ کرتا تھا تاہم اس زمانہ میں یہ بھی قلمی شجاعت کا نمونہ تھا۔اس مضمون کی اشاعت کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ مرجھائے ہوئے چہرے کچھ تروتازہ ہوئے ہیں اور بکھرے ہوئے وجود کچھ سجے سنورے ہیں کیوں کہ اس زمانہ میں ٹاڈا کی ایسی دہشت تھی کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔اس مضمون کی اشاعت پر رحمانی صاحب کو ڈھیر ساری مبارکبادیاں اور بے شمار دعائیں ملیں۔ان کی کتاب 'گفتگو' جس میں مشاہیر کے انٹرویوز شامل ہیں، پر نظر ڈالی جائے تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جہاں انھوں نے مولانا جلال الدین عمری سے گفتگو کا فریضہ بحسن خوبی انجام دیا ہے وہیں شیوسینا چیف بال ٹھاکرے سے بھی نہ صرف انٹرویو کیا بلکہ ان سے چبھتے ہوئے سوالات بھی پوچھے۔

جناب اکبر رحمانی ایک ماہر مترجم بھی تھے۔ان کا کالم 'مراٹھی اخبارات کی جھلکیاں' باقاعدگی سے روزنامہ انقلاب میں شائع ہوا کرتا تھا۔یہ ۱۹۸۶ء کے آس پاس کا دور تھا۔اس کالم کے مخصوص تراجم کا انتخاب انھوں نے ۲۰۰۰ء میں 'مراٹھی نامہ' کے عنوان سے شائع کرایا۔اردو اخبارات میں مراٹھی کے مضامین اور اداریوں کا بامحاورہ ترجمہ کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اردو قارئین مراٹھی اخبارات کی روش ،خیالات اور پالیسی سے واقفیت حاصل کرسکیں۔مرحوم ظ۔انصاری نے ان کے اس کالم کو دو قوموں کے درمیان افہام وتفہیم کا ذریعہ قرار دیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مصروفیات نے انھیں بری طرح سے جکڑ رکھا تھا مگر اس کے باوجود وہ کہانی کے کے لیے وقتاً فوقتاً پتا پانی کرلیا کرتے تھے۔حالانکہ وہ بحیثیت کہانی نویس وہ مقبولیت حاصل نہ کرسکے جو انھیں بحیثیت صحافی اور مترجم ملی تھی۔مگر میں نے محسوس کیا کہ کبھی فرصت کے لمحات میں ان کا جی چاہتا تھا کہ تخلیقیت کا دامن تھام لیں اور اپنے دل کا بوجھ کاغذ کے کاندھوں پر ڈال دیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں تحریر کیں اور کہانیوں کے تراجم بھی کیے۔

اتر پردیش میں علی گڑھ سے دیو بند تک ایک تعلیمی کارواں نکالا گیا۔کارواں کا آغاز ۱۰راپریل ۱۹۹۲ء کو علی گڑھ سے ہوا جبکہ اختتام ۲۱راپریل ۱۹۹۲ء کو دیو بند میں عمل میں آیا۔اس کارواں کی

قیادت کا شرف جہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید حامد، پروفیسر محمد شریف خان وغیرہ کو حاصل رہا وہیں اہلیان خاندیش کے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ اس تعلیمی کارواں کی قیادت اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے پروفیسر اکبر رحمانی کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔ عام طور پر عصبیت کے خول میں لپٹے افراد خاندیش کے فنکاروں اور قلمکاروں کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں مگر جب صلاحیتوں کا بہتر طور پر اظہار ہوتا ہے تو تعصب کا غبار چھٹ جاتا ہے اور ٹیلنٹ اور صلاحیتوں کی موجودگی کا اظہار بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔ پروفیسر اکبر رحمانی نے اس تعلیمی کارواں کی قیادت بھی کی، ہر لمحہ متحرک بھی رہے، اردو کاز کو تقویت پہنچانے کے محرک بھی بنے، اردو اسکولوں کے اجراء کی راہیں بھی ہموار کیں اور اتر پردیش کے مسلمانوں کو اردو کی جانب راغب کرنے کے لیے اپنی بانہیں بھی پسار دیں۔ آپ نے اپنی خطابت کے ذریعہ بھی تعلیمی کارواں کی قیادت کا کامیاب فریضہ ادا کیا۔ جس کی گواہی سید حامد اسطرح دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "وہ (اکبر رحمانی) جب اپنی پاٹ دار آواز اور نپے تلے لہجہ میں تقریر کرنے کے لیے اٹھتے تھے تو ایسا لگتا تھا جیسے بحر ذخار ربع سکوں میں بدل گیا۔ سامعین سمجھتے تھے کہ جو کچھ فاضل مقرر کی زبان سے ادا ہو رہا ہے وہ نہ بیان ہے نہ رائے کا اظہار بلکہ ابدی حقیقتیں ہیں جو سرچشمہ سے جاری وساری ہیں۔ انداز بیاں میں کہیں گو مگو یا اگر مگر کا شائبہ بھی نہ تھا۔ ساری گفتگو ایقان کے سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ صاحب تقریر کا ذہن ریب و اشتباہ، خوف وخطر سے آزاد ہے۔"

خاندیشی لب ولہجہ اکبر رحمانی صاحب کی گھٹی میں تھا۔ یہ لب ولہجہ کھردرا اور سخت و کرخت ضرور ہے مگر اس کی سختی میں بھی ملائمت کی خوشبو کو محسوس کیا جا سکتا ہے اور اس کے کھردرے پن میں اپنائیت کی چکناہٹ سے بھی محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔ عام بول چال، دوستوں، نکڑوں، چوراہوں حتیٰ کہ اپنے گھر میں رحمانی صاحب ٹھیٹ خاندیشی میں گفتگو کرتے مگر جب وہ اسٹیج سے سامعین کو مخاطب کرتے تو خاندیشی لب ولہجہ غائب ہو جاتا اور لکھنوی انداز وارد ہو جاتا۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک اہم وصف تھا۔ جس کے سبب وہ دور دراز تک ادبی محفلوں اور تعلیمی اجلاس میں مدعو کیے جاتے تھے۔

'تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق' نامی کتاب تحریر کر کے پروفیسر اکبر رحمانی نے خود کو بحیثیت مورخ بھی متعارف کرایا۔ اس کتاب کے اوراق جب قاری پلٹتا جاتا ہے تو خاندیش کی وسعت، اس کی صنعت وحرفت، رواداری، مختلف حکمرانوں کے دور حکومت میں پالیسی کی شہ سواری کے مزے لوٹتا ہے۔ ہر چند کہ تاریخ نہ تو کبھی مکمل ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا احاطہ الجبرا یا جیومیٹری کے اصولوں کی طرح

مقید کیا جاسکتا ہے بلکہ ہر نیا مورخ یہاں وہاں کی خاک چھان کر حقیقتوں کے گوہر نایاب جمع کرتا ہے اوراس طرح تاریخ مزید دراز ہوتی جاتی ہے۔خاندیش کی ادبی تاریخ بھی پروفیسر اکبر رحمانی کا ایک اہم کارنامہ ہے جس میں آپ نے خاندیش میں اردو شاعری، مرثیہ نگاری، اردو صحافت، افسانہ نگاری ، ڈرامہ نگاری وغیرہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔اس کے علاوہ نوح ناروی، سیماب اکبر آبادی کے خاندیش سے تعلق کو بھی عیاں کیا ہے۔اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں نایاب تصاویر و قیمتی معلومات درج ہیں۔اتنی مصروفیات کے باوجود رحمانی سر نے کس طرح یہ اثاثہ جمع کیا ہوگا یہ سوچ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

'اردو میں ادبِ اطفال ایک جائزہ' پروفیسر اکبر رحمانی کی تالیف ہے۔جون ۹۱ میں منظر عام پر آئی تھی۔جس میں تعلیمی ماہنامہ آموزگار میں شائع شدہ مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔بچوں کے لیے لکھنے والوں کے لیے یہ ایک بہت معلوماتی اور رہنما کتاب ہے۔جس میں ظ۔انصاری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور میرزا ادیب جیسے بلند پایہ قلمکاروں کے مضامین شامل ہیں۔ہمارے قلمکار اگر ان مضامین کو بغور پڑھیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ پھر بچوں کے لیے لکھنے کو بچوں کا کھیل نہیں سمجھیں گے۔مگر قلیل مدت میں شہرت کے حصول کا جنون اور تعلقات کے زینہ سے اشاعت کی منزل تک پہنچنے کا خبط ایسی کتابوں کے مطالعہ کی کہاں اجازت دیتا ہے!!

اب آیئے' آموزگار' کا تذکرہ بھی کرلیں کہ اس کے تذکرہ کے بغیر اکبر رحمانی سر کے کارناموں پر تبصرہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔' آموزگار' ایک تعلیمی رسالہ تھا۔جس کی ادارت رحمانی صاحب کے کاندھوں پر تھی۔اسی کے ہمراہ اس رسالہ کو مشفق و مخلص ماہر تعلیم محمد حسن فاروقی کا عملی تعاون بھی نصیب ہوا تھا۔' آموزگار' نے ملک بھر میں بلکہ برصغیر میں اپنی شناخت قائم کرلی تھی۔ہمارے یہاں پر عام طور سے رسالوں کا اجراء بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے مگر کچھ ہی قدم چلنے کے بعد سانسیں پھولنے لگتی ہیں اور دم گھٹنے لگتا ہے۔مگر' آموزگار' کے ساتھ ایسا پروفیسر اکبر رحمانی کی حیات میں کبھی نہ ہوا۔اس کی سب سے بڑی وجہ میری نظر میں یہ تھی کہ انہوں نے آموزگار کو اپنے روزگار کا ذریعہ نہیں بنایا تھا بلکہ آموزگار تو ان کی دلی تسکین اور روح کی تدوین کا وسیلہ تھا۔جس کے لیے وہ اپنی جیبِ خاص سے رقم لگانے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ہر چند کہ اس زمانہ میں اساتذہ کی تنخواہیں بہت قلیل تھیں مگر اس کے باوجود آموزگار کی باقاعدگی سے اشاعت موصوف کی اس رسالہ سے بے انتہا محبت کی دلیل تھی۔میں اور میری طرح سیکڑوں افراد کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی انہوں

نے اپنے کسی شاگرد کو آموزگار کا خریدار بننے کے لیے کہا ہو۔ جبکہ ان کے شاگردوں میں امیر ترین گھرانوں کے بندے بھی تھے اور اگر وہ بات رکھتے تو 'آموزگار' کا تنگ معاشی قافیہ کچھ ڈھیلا بھی ہو جاتا ہے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، نہیں کیا۔ آپ کے انتقال کے بعد فرزند سہیل اختر رحمانی نے 'آموزگار' کو زندہ رکھنے کی کوشش ضرور کی مگر اس کوشش میں ان کے والد کی کوششوں جیسا دم خم، یکسوئی اور سنجیدگی نہیں تھی۔ چند برسوں تک آموزگار تعلیمی صحافت کے آسمان پر ڈوبتا ابھرتا رہا اور اب کئی برسوں سے اس کی اشاعت تعطل میں پڑی ہے۔ جاگاؤں کے اردو سے محبت رکھنے والے افراد دیگر علاقوں سے شائع ہونے والے رسالوں کو مالی تعاون فراہم کرتے ہیں۔ اگر منصوبہ بندی کی جائے اور پہلے 'خویش پھر درویش' کے فلسفہ کو اپنایا جائے تو ماہنامہ آموزگار میں نئی روح پھونکی جا سکتی ہے۔

اپنے خاندان کی کفالت کے لیے جس میں آموزگار بھی شامل تھا انہوں نے خود کو کئی خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اردو کی درسی کتابوں کی تیاری کے لیے انھیں اکثر پونہ جانا پڑتا۔ پھر کئی روز تک ان کا وہیں قیام رہتا۔ پھر اچانک اکبر سرا اپنے کندھے پر شبنم تھیلی لٹکائے اینگلو اردو ہائی اسکول کے احاطہ میں نظر آتے۔ آتے ہی وہ اس کلاس پر قبضہ جما لیتے جس کا نصاب پیچھے چل رہا ہوتا۔ ایک ساتھ چار چار پیریڈ لیتے اور نصاب کی تکمیل کر لیتے مگر یہاں یہ تذکرہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ وہ جب درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے سبق کو انھوں نے شربت کی طرح پی رکھا ہے اور روانی کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ وہ ہر شعر، ہر کہانی کی وضاحت بڑے دلنشیں انداز میں کرتے مگر جلد بازی سے ہرگز کام نہ لیتے۔ یعنی خاندیش کے سپوت کو اپنی تدریسی ذمہ داری کا بھی بھرپور احساس تھا۔ چاہتے تو پونہ میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ٹیچر کو اپنی تدریسی ذمہ داری سونپ سکتے تھے مگر اس سے بھی انہوں نے اجتناب برتا اور اپنا کام خود کیا، عمدگی کے ساتھ کیا۔

۱۹۹۴ء میں راقم نے ہفت روزہ اردو بلٹز سے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ جیسے ہی رپورٹنگ ان کی نظروں سے گزری ملاقات پر موصوف نے خوب حوصلہ افزا کلمات ادا کیے۔ ان کے چہرہ کی مسکراہٹ اور ہاتھوں کی گرماہٹ آج بھی میری یادداشت کا حصہ ہے۔ جب میں انقلاب سے منسلک ہوا تب بھی انہوں نے حوصلہ ہی بڑھایا۔ اردو سے آپ کو بے انتہا محبت تھی۔ اسی محبت کے اظہار اور تشنگان اردو کی پکار کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے اسلام پورہ میں راشٹریہ ایکاتمتا پبلک لائبریری کی بنیاد سن ۶۷ میں ڈالی۔ یہ لائبریری آج بھی جاری ہے۔ مجھے ان کے ہمراہ شولاپور کے اولین اردو تاریخی میلہ میں شرکت کا موقع بھی ملا۔ اس میلہ کے روح رواں فاروق سید نے موصوف کے ہمراہ عبدالکریم

سالار صاحب اور ناچیز کو بھی مدعو کیا تھا۔ دوران سفر ان کی رگِ ظرافت پھڑکتی رہتی تھی۔ پھر وہ کار میں زوردار قہقہہ لگاتے اور مسکراتے ہوئے اپنی بائیں آنکھ بھینچ لیتے۔

علامہ اقبال، رابندر ناتھ ٹیگور اور لمعہ حیدر آبادی کے تعلقات پر آپ کی کتاب تحقیقات اور تاثرات ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ جس میں انہوں نے لمعہ حیدر آبادی کے علامہ اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور سے تعلقات کا تذکرہ کیا ہے اور بطور ثبوت اس کتاب میں چند خطوط بھی شامل اشاعت کیے ہیں۔ اسی موضوع پر آپ نے تحقیقی مقالہ بھی لکھا۔ اگر چاہتے تو کسی آسان موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لیتے مگر وہ فرماتے ہیں ''پی ایچ ڈی کے موضوعات کے بارے میں ابتدا ہی سے میرا یہ نظریہ رہا ہے کہ ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہئے جو اچھوتا ہو، جس پر ابھی تک کسی نے کام نہ کیا ہو یا بہت کم کام کیا گیا ہو اور جس پر تحقیقی کام کرنے سے ادب میں واقعی کچھ اضافہ ہو۔ ایک ہی موضوع پر مختلف مقامات پر تحقیقی کام سوائے تکرار، ترتیب و تالیف اور دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کو چبانے کے سوا کچھ نہیں۔'' اکبر رحمانی سر کے تحقیقی مقالہ پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کردی گئی تھی مگر پھر شکایتوں کے پیش نظر یونیورسٹی نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ اس بات کا انھیں بڑا قلق رہا مگر وہ پُر امید تھے کہ تحقیقات کے بعد فیصلہ انہی کے حق میں جائے گا۔ اسی دوران آپ رخصت ہو گئے اور معاملہ التوا میں پڑ گیا۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ پروفیسر اکبر رحمانی کے وجود میں کئی فلسفہ کے ڈاکٹر بستے تھے یعنی ڈگری حاصل کرنا ان کے لیے کوئی مشکل امر نہ تھا کہ روانی کے ساتھ اردو کی حروف تہجی ادا نہ کر پانے والوں کو بھی ڈگریاں مل ہی جاتی ہیں۔

کم و بیش دو درجن کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مرتب پروفیسر اکبر رحمانی میں انکساری کا عنصر بھی غالب تھا۔ اپنی کتاب تحقیقات و تاثرات میں ان کی انکساری یوں کلام کرتی ہے وہ کہتے ہیں ''آج بھی جب ان مضامین پر نظر ڈالتا ہوں تو چیخوف نے اپنے متعلق جو رائے پیش کی تھی اسے اپنے بارے میں بھی صحیح پاتا ہوں۔ چیخوف نے کہا تھا کہ ''میں نے منوں کاغذ سیاہ کر ڈالے اور بے شمار غلطیوں کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔ اکاڈمی کا انعام بھی پایا اور اچانک عظیم شہرت بھی حاصل کر لی۔ اس کے باوجود جہاں تک میرا خیال ہے میں نے ایک سطر بھی ایسی نہیں لکھی جو صحیح معنی میں ادبی اہمیت کی حامل ہو۔''

اردو کے اس سپوت کو ایک دن ذیابیطس نے اپنے شکنجہ میں جکڑ لیا مگر ہر لمحہ رحمانی صاحب مسائل کا زہر پینے والے شکر سے بھلا کیا خوف کھاتے۔ جتنا پرہیز ہو سکتا کرتے اور جب نہ کرنا ہوتا تو بالکل بھی

نہ کرتے۔ایسے میں اللہ کا بلاوا آ گیا۔حج بیت اللہ کو روانہ ہوئے اور اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔وہاں بیمار بھی ہوئے پھر رو بہ صحت بھی ہوئے اس طرح بیماری کی نقاہت اور شفاعت کی لکا چھپی چلتی رہی۔بالآخر ۱۷ر ستمبر ۲۰۰۲ء شام ۶ر بجے خاندیش کا یہ قدآور سپوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔مگر وہ اپنے کارناموں کی صورت درجنوں کتابیں تاریخ کو بطور تحفہ دے گیا ہے۔یہ کتابیں برسوں پڑھی جائیں گی اور حوالوں کے لیے استعمال ہوں گی اور اس طرح اپنی تقاریر، تصانیف، صحافت اور شجاعت کی بدولت وہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

نشاط شہادوی کا شعر ہے ؎

یاد میری سنبھال کر رکھنا
میرا کیا میں رہا رہا نہ رہا

حواشی: ۱) تحقیقات و تاثرات (مؤلف اکبر رحمانی)
۲) اردو میں ادب اطفال ایک جائزہ (مصنف اکبر رحمانی)
۳) علی گڑھ سے دیوبند تک (اکبر رحمانی)

☆☆☆☆

مرزا افسرؔ بھڑ گانوی

اردو کی محبت میں خود کو لٹا دینے والا شاعر

مشتاق کریمی

بھارت کے بطن سے پاکستان کے جنم کے بعد ایک لمبی مدت تک دونوں ممالک میں ایک کہرام سا مچا رہا۔ یہاں سے وہاں ذہین طبقہ منتقل تو ہو گیا مگر مہاجرین کے لقب نے اب تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والی اور وطن عزیز کو انقلاب زندہ باد کا نعرہ دینے والی، انگریز حکومت کی چولیں ہلا کر رکھ دینے والی اردو زبان کے ساتھ محض اسلئے سوتیلا سلوک کیا جانے لگا کہ تنگ نظر افراد نے اپنے طور یہ ضابطہ بنا لیا تھا کہ زمینوں کی تقسیم کے بعد زبان کا محل وقوع بھی متعین ہو گیا ہے مگر وہ اس بات سے بے بہرہ تھے کہ کوئی بھی زبان جغرافیائی حدود کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ اس کی خوشبو دنیا کے کونے کونے میں اس وقت تک مہکتی رہتی ہے جب تک اس کے چاہنے اور بے انتہا محبت کرنے والے زندہ ہوں۔

مشرقی خاندیش میں اردو سے بے انتہا محبت کرنے والے اردو نواز عوامی شاعر مرزا افسرؔ بھڑ گانوی اسی سلسلہ کی ایک کڑی رہے جنھوں نے اردو کاز کو تقویت پہنچانے کے لیے، اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے اور اردو داں طبقہ کو سرکاری نوکریوں میں اس کا حق دلانے کے لیے نہ صرف اپنی مٹھی بھر کوششیں کیں بلکہ اس کم پڑھے لکھے شاعر نے رات کے اندھیرے میں اپنے تخیل کے پرواز کو بلند کر کے گیسوئے اردو کو سنوارنے کی کامیاب کوششیں بھی کیں۔ مرزا افسرؔ بھڑ گانوی کا تعلق ضلع جلگاؤں کے مردم خیز شہر بھڑ گاؤں سے رہا۔ ۲ ردسمبر ۱۹۳۹ء کو انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ انتہائی تنگ دستی کے باوجود انھوں نے جیسے تیسے ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی مگر اس کے آگے وہ اپنا تعلیمی سفر اس لیے جاری نہ رکھ سکے کہ پیٹ کی بھٹی کو بجھانے کے لیے انھیں اب آگے معاشی سفر شروع کرنا تھا۔ بھرا پورا خاندان، گرانی کا دور اور فطرت میں انتہائی انکساری اور کشادہ دلی کے سبب مرزا افسرؔ اپنے اطراف و اکناف میں جلد ہی معروف ہو گئے۔

ان کے والدین تو چاہتے تھے کہ وہ پڑھ لکھ کر کوئی سرکاری نوکری کرلے مگر معاشی قافیہ کا احساس مرزا افسر کو اس لیے بھی اکثر ستاتا رہتا کہ اپنی شاعرانہ فطرت کے سبب وہ ردیف قافیے کی لچک اور نزاکت سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر فوری طور پر اہل خانہ کو معاشی تقویت نہ پہنچائی گئی تو پھر بھک مری کی راہ سے بھی گزرنا پڑسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کار ڈرائیونگ سیکھ لی۔ ان کی زندگی اسفار سے عبارت تھی اور زندگی میں مختلف نوعیت کے بہت سارے سفر انھیں کرنے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فطرت نے انھیں گاڑیاں چلانے میں جلد ہی مہارت دے دی۔ ایسے میں جب انھیں اس بات کا علم ہوا کہ ضلع پریشد جلگاؤں میں ڈرائیوروں کی اسامیاں خالی ہیں تو انھوں نے لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے حصول کے لیے کوشش کی اور پہلی ہی کوشش میں کامیابی بھی حاصل کرلی۔ اب جاکر انھیں تھوڑا سا قرار آیا، معاشی قافیہ ڈھیلا ہوا، ذہن سے جب اہل خانہ کی کفالت کا بوجھ اترا تو ذہن کی گرہیں کھلتی گئیں۔ یوں تو مرزا افسر فطری شاعر تھے۔ ہر چند کہ انھیں غزل کے اوزان اور بحروں کا علم نہیں تھا مگر وہ مسکرا کر اور گنگنا کر اپنے اشعار کے اوزان از خود ٹھیک ٹھاک کر لیا کرتے تھے۔ ویسے ابتدائی ایام میں انھوں نے حضرت ساحر ادیبی سے مشورہ کیا، کبھی عزمی عادل آبادی سے اصلاح لی تو کبھی قیوم اثر نے نوک پلک درست کردی۔ مگر یہ سلسلہ جلد ہی ختم بھی ہو گیا کہ کثرت سے غزلیں سنتے سنتے اور کہتے کہتے وہ اپنے فن میں مشاق ہوتے چلے گئے۔

آؤ مل کر کچھ کام ایسا کریں

اپنے دل کو آئینے جیسا کریں

خدمت انسانیت کے واسطے

جذبۂ انسانیت پیدا کریں

ان کا یہ قطعہ جب وہ مشاعرے کے اسٹیج سے پیش کرتے تو خوب داد بٹورتے۔ ضلع جلگاؤں کا شاید ہی کوئی ایسا قصبہ یا علاقہ ہو جہاں کے مشاعرے میں بحیثیت شاعر مرزا افسر نے شرکت نہ کی ہو۔ اس کی بڑی وجہ ان کی سیدھی سادی شاعری اور مخلص اور سیدھا سادہ رویہ تھا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مقابل کا دل جیت لیتے تھے۔ ان کی سادگی مقابل کو متاثر کرتی اور ان کی میزبانی اس کے دل میں ان کے لیے ایک خاص مقام بنادیتی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ہم عصر جہاں جہاں مشاعرہ بپا کرتے وہاں وہاں مرزا کی موجودگی یقینی ہوتی۔ ہر چند کہ مرزا افسر ضلع پریشد جلگاؤں میں بحیثیت ڈرائیور اپنی خدمات انجام دیتے مگر وہ اتنے مشاق تھے کہ ہر بڑا افسر انھیں اپنا 'ناخدا' بنانا چاہتا۔ مزاج کا سادہ پن، راست گوئی اور

شاعری کے سبب انھوں نے ضلع پریشد کے پورے عملہ میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا تھا۔اس مقام کو انھوں نے کبھی بھی اپنی ذاتی دکان چلانے کے لیے استعمال نہیں کیا لیکن استعمال کیا ضرور ایسے وقت میں جب اردو اساتذہ کے تقرر کے معاملہ میں لوٹ کھسوٹ اور رشوت خوری کی خبریں عام ہوئیں۔ جنھیں سن کر مرزا افسر بے چین ہو اُٹھے۔ پھر انھوں نے اس وقت کے ضلع کلکٹر ایس ایس سندھو اجنبی (جو خود بھی اردو کے شیدائی و شاعر تھے) اور مقامی ڈپٹی کلکٹر ایس این ایم قادری سے ملاقات کی اور صورت حال سے انھیں آگاہ کیا۔اس آگاہی کے بعد سرکاری عملہ اور بھی سنبھل گیا۔سرکاری طور پر مقامی اخبارات میں یہ اعلان چھپوایا گیا کہ کوئی کسی کو بھی نوکری کے عوض ایک دمڑی نہ دے بلکہ اساتذہ کا انتخاب ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوگا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ یہ ۱۹۹۴ء کا واقعہ ہے درجنوں اردو اساتذہ کی تقرری اس زمانہ میں عمل میں نہایت ہی ایماندارانہ طریقہ سے۔اس میں کریڈٹ ان افسران کا تو ہے جنھوں نے امیدواروں کے انٹرویوز لیے مگر در پردہ مرزا کی کاوشوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ضلع پریشد میں ملازم رہتے ہوئے اردو کی شمع کو مشاہدہ کی صورت روشن رکھنے کا ہنر مرزا کو خوب آتا تھا۔ان کے منعقد کردہ مشاعروں میں اعلیٰ افسران بھی شرکت کر کے مسرت محسوس کرتے تھے ۔ان مشاعروں کی آبیاری کے لیے وہ اپنی محنت کا پسینہ بھی لگا دیتے تھے۔مہمان شعراء کی ضیافت کے لیے دستر خوان سجا دیا کرتے تھے۔ان کے قیام و آرام کے لیے بڑی ہوٹلوں میں یا سرکاری آرام گاہوں میں عمدہ انتظامات کروادیا کرتے تھے۔ان تمام امور کو وہ بوجھ نہیں فرض سمجھتے تھے اور بل کی دائیگی کے وقت ان کے ماتھے پہ شکن نہیں بلکہ چہرہ پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔چونکہ وہ اردو کے سپاہی تھے اور ان کی کاوشوں کے سبب ضلع پریشد جلگاؤں میں اردو کا ڈنکا بجتا تھا یہی وجہ ہے کہ تنگ نظر افراد ان کے خلاف سازشیں بھی کیا کرتے تھے مگر جب ان سازشوں کی بو مرزا تک پہنچتی تو وہ زیر لب مسکرا دیتے پھر ان کی شعری رگ پھڑکتی اور صفحہ قرطاس پر یہ شعر نمودار ہوتا۔

نوازش پر نوازش ہورہی ہے
یقیناً کوئی سازش ہورہی ہے

مرزا افسر سادہ مزاج تو تھے مگر ایسے بھی سادہ نہ تھے کہ کوئی ان کو آسانی سے شکست دے سکے ۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لمبی مدت تک ڈرائیوروں کی اسوسی ایشن کی صدارت بحسن خوبی سنبھالی اور ان کے مسائل کے حل کے لیے ہر ممکن کوششیں کیں۔خوش مزاج مرزا پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یوں لگا جیسے قسمت ان سے روٹھ گئی ہے۔دشمنوں کا وار بھاری پڑنے لگا اور ان کے بچھائے ہوئے جال میں

ایک دن مرزا پھنس گئے۔ یکا یک مالی بحران پیدا ہو گیا، تقاضوں کی بارش ہونے لگی مگر وہ گھبرائے نہیں بلکہ انھوں نے صراط مستقیم کا سفر جاری رکھا اور اللہ کی راہ میں تبلیغ کے لیے نکل پڑے۔ پھر اچانک ایک دن جب اردو داں طبقہ کو یہ خبر ملی کہ ایک مسجد میں بیان دیتے ہوئے مرزا افسر کا برین ہیمبرج ہو گیا ہے تو اس خبر نے سب کو سکتہ میں ڈال دیا۔ انھیں بغرض علاج اورنگ آباد منتقل کیا گیا۔ علاج و معالجہ میں کوئی کثر نہ چھوڑی گئی مگر اب بلاوا آ گیا تھا، مرزا کا دانا پانی اٹھ گیا تھا اور مرزا افسر ۹/اپریل ۱۹۹۶ء کے دن اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے جلوس جنازہ میں ہزاروں چاہنے والوں کی شرکت ان کے مقناطیسی تعلقات اور مقبولیت کا اشارہ دے رہی تھیں۔ ان کے جنازہ میں چلتے ہوئے ان کا یہ شعر بار بار ذہن میں کوندر ہا تھا۔

وہ میری شب کی عبادت کا آخری سجدہ
قبول کر لے، بھلے ہی سحر نہ دے مجھ کو

نمونہءکلام

(طرحی نشست مورخہ ۲۱/اکتوبر ۱۹۸۴ء)

غزل

یہ نکہتیں اسی کوچہ میں اے صبا لے جا
تجھے پتہ نہ ہو معلوم تو پتا لے جا

خرام ناز کا علام ہے کتنا ہوش رُبا
رقیب کہہ اٹھا قدموں میں دل مرا لے جا

رہِ شباب میں ہر ہر قدم پہ خطرہ ہے
کمندِ عشق سے اپنے کو تو بچا لے جا

ہے میرے دین کا مسلک معاف کر دینا
علاجِ بغض کو کاری ہے یہ دوا لے جا

کسی کے حسن و نفاست کو دیکھ کر افسرؔ
سنبھال خود کو نہ جذبات میں بہا لے جا

☆☆☆☆
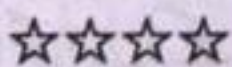
میر اصغر علی جامعی: صحافت میں آزادی کے حامی

مضمون نگار : میر ساجد علی قادری

پیدائش : ۲۲ر مئی ۱۹۳۸ء

تعلیم : ایم اے

تصنیف : متاعِ سفر (شعری مجموعہ)

انقلاب کے سابق مدیر مرحوم میر اصغر علی جامعی کے بھتیجے، مجاہد آزادی میر شکر اللہ کے پوتے۔ جوہو، ممبئی میں اقامت پذیر ہیں۔

۱۹۳۹ء میں برطانوی جہازراں کمپنی مغل لائن لمیٹیڈ سے وابستہ ہوئے۔ برطانوی کمپنی میں ملازمت میں ہوتے ہوئے ۱۹۴۲ء کی خفیہ تحریک آزادی کے خفیہ معاون رہے۔ شری ایس۔ایم۔جوشی کی قیادت میں اس خفیہ تحریک کی بیشتر سرگرمیاں میر اصغر علی جامعی کے مکان Tardeo "Forjet Terrace" Forjet Hill Road تاردیو بمبئی میں ہوا کرتی تھیں۔تحریک کے بعض کارکنان کا قیام بھی ہوتا تھا۔Shri S.M.Joshi نے اپنے خط میں، شریمتی سنیتا دیش پانڈے نے اپنی سوانح حیات اور ڈاکٹر رام بھاؤ بھوگے نے اپنی کتاب میں تفصیلات کا ذکر کیا ہے۔

مغل لائن میں ملازمت کے دوران برطانوی کمپنی کو معلوم ہوا کہ میر اصغر علی جامعی روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی کا اداریہ لکھتے ہیں۔ جب میر صاحب سے پوچھا گیا تو انھوں نے تسلیم کیا کہ ان کو صحافت سے دلچسپی ہے لیکن بہتر ہوگا اگر انگریزی ادب کے بارے میں پوچھا جائے۔ میر صاحب نے انگریزی ادب خصوصاً ناول، افسانہ اور کہانی نگاروں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی تو کمپنی کے ڈائریکٹرس Directors اور افسران نے بہت خوش ہو کر کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہماری کمپنی میں ایسی شخصیت بھی ہے جس کا انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ ہے۔ کمپنی نے اجازت دی کہ روزنامہ ''انقلاب'' کا اداریہ لکھتے رہیے لیکن کمپنی کے مفاد کا بھی خیال رکھیے۔

میر اصغر علی جامعی نے مشہور مراٹھی ڈرامہ نگار اور اسٹیج اداکار شری پی۔ایل۔دیشپانڈے کی ہندی فلم ''سندیش'' کے مکالمے بھی لکھے ہیں۔

میر اصغر علی جامعی کی پہلی شادی جلگاؤں میں اپنے رشتہ داری میں قمر النساء بنت گلشیر خان سے ہوئی لیکن ٹی۔بی (T.B.) کی بیماری سے چند ہی برس بعد ان کا انتقال ہوگیا۔مرحومہ جلگاؤں میں مدفون ہے۔میر صاحب کی دوسری شادی زینت النساء بیگم بنت غلام محی الدین مکّی (بسین) سے ہوئی ۔زینت النساء کا انتقال ۸۳ رسال کی عمر میں ۱۰ راکتوبر ۲۰۰۸ کو ہوا۔وہ اِرلا قبرستان جوہو میں مدفون ہیں۔پس ماندگان میں دو بیٹیاں فرحانہ اور فرزانہ اور فرزند میر منیر ہیں۔

میر اصغر علی جامعی کے بارے میں:

میر اصغر علی جامعی نے خاندان کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔والد میر شکر اللہ صاحب کے انتقال کے بعد فکر معاش کے سلسلہ میں مہاتما گاندھی سے بھی خط و کتابت رہی۔بمبئی میں تحریک آزادی اور تحریک خلافت کے رہنما جناب سید عبد اللہ بریلوی مدیر انگریزی روزنامہ ''بامبے کرانیکل'' کے توسط سے روزنامہ ''اجمل'' بمبئی میں ترجمہ کے کام سے ابتداء کی۔

مشہور انقلابی شوکت عثمانی، ظ۔انصاری، اعجاز صدیقی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سردار جعفری ،نیاز فتحپوری ،مولانا زاہد شوکت علی ،مولانا حامد انصاری غازی ،مولانا عبد الواحد صدیقی ،مولانا عزیز الرحمن لدھیانوی، عبد الرزاق ملیح آبادی اور دیگر کئی علمی، ادبی اور صحافتی شخصیات سے میر صاحب کے قریبی تعلقات تھے۔کبھی شوکت عثمانی صاحب تو کبھی ظ۔انصاری مع اہل خانہ کے مہینے دو مہینے میں ایک اتوار صبح سے بسین میں میر صاحب کے بنگلہ ''دلآرام'' آتے ۔دن بھر خوب باتیں ہوتیں اور رات کے کھانے کے بعد واپسی ہوتی تھی۔

میر اصغر علی جامعی کی تعلیم و تربیت ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) کی نگرانی میں ہوئی تھی۔انہوں نے اپنے دور میں چند یادگار کہانیاں لکھیں جو مختلف جرائد میں شائع ہوئیں۔وہ روزنامہ انقلاب ممبئی سے بطور مدیر اعلیٰ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء تک وابستہ رہے۔ان کی افسانہ نگاری کا ایک خاص اسلوب تھا۔میر اصغر علی جامعی نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور نہ ان پر اب تک کچھ لکھا گیا۔ان کی شخصیت اور فن پر تفصیل سے کام ہونا ابھی باقی ہے۔

☆☆☆☆

عبدالجبار خان خمارؔ املنیری: شخصیت اور شاعری

مضمون نگار : ڈاکٹر ساجد علی قادری

پیدائش : ۱۵ر نومبر ۱۹۷۰ء

تعلیم : بی ایس سی، ایم اے بی ایڈ، پی ایچ ڈی

پیشہ : صدر شعبۂ اردو۔ ایس پی ڈی ایم کالج، شیر پور، دھولیہ

پتا : ۵۷ر گنیش کالونی، شیر پور، ضلع دھولیہ 08275591666

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بیسویں صدی تضادات کی صدی کہلاتی ہے۔ اس صدی میں ایک طرف تو انسان نے مادی طور پر بے پناہ ترقی کی، ایسی ترقی جو تاریخ انسانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور دوسری طرف روحانی اور اخلاقی زوال کو بھی آخری حد تک پہنچا دیا۔ آج صارفیت کے معاشرے میں ہر قدر، ہر اصول اور ہر رشتے کو جنسی بازار بنا دیا گیا ہے۔ تمام مقدس رشتے بیت الضعفاء کی زینت بنا دیئے گئے، بیت الضعفاء کی خوبصورت اور بلند و بالا عمارتیں انسانی رشتوں اور محبتوں کے ایسے کباڑ خانے بنادی گئیں جنہیں دیکھ کر حساس انسان کا دل ہی نہیں روح تک کانپ اٹھتی ہے۔ ایسے ماحول میں جب کوئی باشعور فنکار ایک جہاں دیدہ، ادب نواز پورے خلوص اور دردمندی کے ساتھ کھوئے ہوئے رشتوں کی بازیابی کا بیڑہ اٹھاتے ہوئے قلم چلاتا ہے تو حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی کہ

؎ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

دنیائے آب وگل میں یہ روز روز نہیں ہوتا کہ کسی خاص طبقہ میں ایسی شخصیات بار بار جنم لیتی ہوں جن کی وجہ سے زمانے کے دھاروں کا رُخ بدل جاتا ہے۔ جن کی زبان وقلم سے نکلنے والا ہر لفظ جس میں تقدس و پاکیزگی ہی پاکیزگی ہو، جن کے تدبر سے ذہن، فکر و ادب جس میں خصوصاً شاعری کی پر

واز کوئی بلندیاں مل جاتی ہوں، جن کے عزائم اور حوصلوں کے آگے دشت وصحرا بے معنی ہو جاتے ہوں، ایسی کئی صفات وشاعری کا بے کمال بادشاہ عبدالجبار خان خمارؔ املنیر ی صاحب ہیں۔

۱۹۳۶ء کا روشن وتابناک سال تھا۔ جب ورن گاؤں۔ ضلع جلگاؤں میں نہایت غربت کا شکار گھرانہ جہاں آہوں اور سسکیوں سے پُر فضا ہر سمت آہوں کا دھواں، نہ روشنی کی چمک نہ زندگی کی رمق! تازہ ہوا کا کوئی جھونکا نہیں، ہر سمت مایوسی ہی مایوسی ایسے ماحول میں محترم قلندر خان صاحب کے یہاں ایک خوبصورت بچے نے جنم لیا۔ جسے دنیائے اردو ادب اور شاعری کے گیسو سنوار نے تھے۔ جس کا نام عبدالجبار خان رکھا جاتا ہے۔ جو اپنے والدین کی غربت وتربیت کے زیرِ سایہ پرورش پاتا ہے۔ اور پروان چڑھتا ہے۔ اسی کم عمری میں ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں ڈال دی جاتی ہیں۔ اور جب وہ ولیوں کی سر زمین املنیر پہنچتا ہے تو خمارؔ املنیر ی کے نام سے مشہور ہوتا ہے۔ پھر اردو کو جس نے پالا اور مختلف ادوار سے نکل کر اپنی غربت کو لیکر بھیونڈی پہنچنا۔۔۔ انھیں یہ سفر طے کرنا تھا، شاید اسی لئے قدرت نے بھی ایسی تخلیق کی تھی کہ کشادہ پیشانی اور سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں یا تنگ دہل اعلان کر رہی تھیں کہ یہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو وہ شخصیت ہے جس نے اپنی ۵۴ رسالہ زندگی میں ادب کے مختلف اصناف خصوصاً شاعری کی ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرنی تھی۔

وہ شعروادب کے محقق تو تھے ہی ثقافت اور تہذیب بھی ان کے مطالعہ کا ایک رُخ ہے۔ ان کے کلام میں تحقیقی روش میں رائے زنی کم اور حقائق کا اظہار بیش از بیش دکھائی دیتا ہے۔

خمارؔ صاحب نے شاعری میں بہت جلد اپنا ایک مقام بنالیا تھا۔ اسی لئے جب وہ روزگار کی تلاش میں بھیونڈی پہنچے وہاں اس زمانے کے شعراء نے آپ کی قدر کی اور مشاعرہ کی دنیا میں آپ نے قدم رکھا۔ اسے زمانے اور وقت کی ستم ظرفی کہیے کہ جن کا سارے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔ ایسے شاعرانہ ماحول میں خمارؔ نے بھی بہت جلد اپنی شاعری کا لوہا منوالیا۔ اور خمارؔ املنیر ی کے نام سے پہچانے جانے لگے۔ غربت نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ آپ پرانے کپڑے لاکر بیچا کرتے تھے۔ شریکِ حیات اور وفا شعار بیوی آپ کے کاموں میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ جب ہمیں ان کے چند اشعار ملے جو بھیونڈی سے شائع ہونے والے رسالہ کی زینت بنے تھے اور خلیق الزماں نے اپنی تحقیق کے حوالے سے اپنی کتاب شعراء مہاراشٹر میں ان کا نام بڑے ادب سے لیا ہے۔ ان کے چند اشعار قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ جس

سے ان کی ذہنی فکر کی بلندی کا پتا چلتا ہے۔

ان کے کلام کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خمارؔ صاحب نے شاعری کی کوئی صنف ایسی نہیں چھوڑی۔ حمد، مناجات، نعت پاک، سلام، منقبت، نظم، غزل، رباعی، قطعات، تضمین، سبھی کچھ آپ کے کلام میں شامل ہیں۔ زود گوئی کا یہ عالم کہ۔۔ اگر آپ کا مجموعہ کلام شائع ہوجاتا تو یقیناً اردو شاعری کا ایک قیمتی سرمایہ ہوتا۔

ان کے اشعار ہی کچھ ایسے ہیں جو جگمگاتے ہوئے مجموعے کی نشاندہی کرتے دکھائی دیتے ہیں جو میدانِ شاعری میں اپنا لوہا منوا لیتے۔ اس باکمال شاعر کا جب ایک شعر ہم دیکھتے ہیں جس میں ایک مضمون کو باندھنے کی بجائے بیسیوں رنگ سے باندھا ہے اور اس سلیقے سے پیش کیا ہے کہ قارئین عش عش کرنے لگ جائینگے۔۔۔ خمارؔ صاحب جب سنجیدہ ہوتے تھے تو خود بھی روتے اور اپنے پڑھنے والوں کو بھی رُلاتے۔ ہاں مگر جب وہ غزل سے باتیں کرتے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ غزل خود ہم کلام ہو۔ پیش خدمت ہے ان کا یہ شعر

میں حقیقت ہوں مگر سمجھے وہ افسانہ مجھے
آخرش کہنا پڑا ان کو بھی دیوانہ مجھے

جب حمد باری تعالیٰ کے رنگ میں ان کا قلم گویا ہوتا ہے تو نوکِ قلم اپنی عاجزی اور بے چارگی کا اظہار کرتی ہے۔ اس شعر کو پڑھتے ہی سورۂ ق کی طرف ذہن و دل منتقل ہوجاتا ہے، جس میں بار بار یہی فرمایا گیا کہ وَنحنُ اقربُ اِلَیہِ من حبلِ الورید۔ دیکھئے اس شعر کو

نفس نفس میں سمایا حبیب لگتا ہے
وہ دور ہو کے بھی مجھ کو قریب لگتا ہے

ذرا ملاحظہ تو کیجئے ان کا وہ شعر، ایک جگہ بڑے والہانہ انداز میں اپنے خدا سے شکوہ بھی کرتے ہے اور اپنی ناکام آرزو کی تمناء بھی۔۔ ان کا یہ شعر دیکھئے جو زندگی کی تلخ حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ اللہ اللہ !! کیا درد دکھائی دیتا ہے !!! کاش! پوری غزل مل جاتی۔۔۔ جسے پڑھتے ہی پتھر دل انسان کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوجاتا۔ رات کے پچھلے پہر جب میں ان کا وہ شعر پڑھ رہا تھا کہ

ہے آرزو کہ میں بھی ہوا میں اُڑا کروں
لیکن مرے خدا نے مجھے پر نہیں دیے

یہ ایسے اشعار ہیں جنھیں پڑھکر یقیناایک مسلمان کا دل بھر آتا ہے۔اور وہ ہمیں دعوتِ فکر وعمل دیتے ہے۔خمارؔ کے کلام میں شگفتگی ہی نہیں شیفتگی اور شائستگی بھی ہے۔ان کے اس شعر کو دیکھئے جو براہ راست قاری کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ تو میرے ہی دل کی آواز ہے۔خمارؔ صاحب یقینا جدید لب ولہجہ کے شاعر تھے لیکن تغزل کی روایات کو بھی انھوں نے ہاتھوں سے چھوٹنے نہیں دیا۔ان کا یہ شعر

بنایا تھا جنہوں نے کانچ کا گھر
انھیں ہاتھوں میں پتھر دیکھتا ہوں

آپ کے کس کس پر شعر داد دی جائے۔اپنے وطنِ عزیز سے کسے محبت نہیں ہوتی لیکن تلاش معاش نے وطن عزیز سے دور بھیونڈی پہنچادیا اسی کا گلا کرتا ہوا خمارؔ صاحب کا یہ شعر کتنا خوبصورت پہلو اجاگر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ملاحظہ ہو۔

وہاں پہ لایا ہے مجھ کو مرا نصیب خمارؔ
جہاں کسی کو بھی جینے کا فن نصیب نہیں

خمارؔ صاحب اردو شاعری، زبان وادب کے ایسے محققوں، نقادوں اور دانشواروں کی صف میں شمار کیے جاسکتے تھے جن کی فکر ونظر کی بدولت اردو ادب کے متعدد تاریک گوشے روشن ہو سکے تھے مگر زمانہ اور وقت کے بے رحم ہاتھوں نے وفانہ کی۔

بھیونڈی اور اطراف کی ادبی نشستوں میں بلا ناغہ شرکت کرتے تھے۔بھیونڈی سے ہفتہ وار مخدوم بھی نکلا لاتھا۔جو ادبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔'مخدوم' میں ادبی بحثیں خوب ہوا کرتی تھیں۔کتنے ہی اختلاف رہے لیکن خمار نے ادبی محفلوں میں شرکت سے گریز نہیں کیا۔اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔عمیق مطالعہ اور گہری فکر کی وجہ سے ان کی شاعری کافی پسند کی جاتی تھی۔

'شعر' ہر طرح سے سمجھتے، کہتے اور اس پر مدلل بحث بھی کرتے تھے۔یہی تو وجہ تھی کہ انا پسندی نے ان کی بات نہ ماننے والوں کو پسند ہی نہیں کیا۔ادبی سوجھ بوجھ والا مزاج رکھتے تھے۔بھیونڈی میں 'بزم اردو' کے سربراہ رہے۔اس کے زیر اہتمام اکثر 'آل انڈیا مشاعرے' منعقد کئے جاتے تھے۔ادب کے لئے بہت کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جیب سے خرچ کرتے ہیں، انھیں میں خمار کا بھی شمار ہے۔زبان وادب کا یہ چاہنے والا اتنی کسمپرسی کے عالم میں بھی کتابیں خرید کر پڑھتا۔اسی لے تو ایک جگہ کہتے ہیں۔

خمارؔ دل کا یقیناً امیر وہ ہوگا

وہ آدمی جو بہت ہی غریب لگتا ہے

اب اس مٹی کے پتلے کی بساط ہی کیا کہ وہ اس عمدہ کلام کی اپنے لفظوں میں تشریح کرے۔فصاحت اور بلاغت کے ساتھ ساتھ سلاست بھی ہو تو شعر کا حسن کس قدر بڑھ جاتا ہے۔ پیشہ پرانے کپڑے لانا اور انھیں فروخت کر کے اپنے خاندان کا پیٹ پالنا۔لیکن انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہیں کیا۔اس سے ان کی خوداری کا پتا چلتا ہے۔

زندگی بڑی دشوار گذر رہی تھی کہ اچانک گلے کو کینسر جیسے مہلک عارضہ نے آدبوچا۔ادب کی آبیاری کرنے والا یہ قلم کار ۱۹۹۰ء میں اپنے خانوادے اور چاہنے والوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت خمارؔ صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں مراتبِ عالی سے نوازے (آمین)

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔۔۔۔ آمین۔

☆☆☆☆
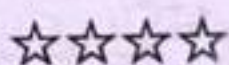
(Millenium 2000)

دوہزارہ کا لکھ پتی شاعر: مقیم اثرؔ بیاولی

مضمون نگار : مرحوم سید صابر علی سید مظفر علی

قلمی نام : صابر زاہدؔ

تاریخ پیدائش : یکم مارچ ۱۹۴۶ء جلگاؤں مہاراشٹر (ہندوستان)

تاریخ وفات : ۲۰/اگست ۲۰۱۲ء (یکم شوال عید الفطر)

تعلیم : ایس ایس سی

پتا : تنزیلہ پارک، بلی رام پیٹھ جلگاؤں 7276064415

کہاوت ہے کہ ''سر بڑا سردار کا'' سر اتنا بڑا جسمیں پچاسوں دیوانوں کا سودا سما جائے۔ سر پر شجر سایہ دار آسا گھنے لمبے بال، بالوں میں چھپے حساس کان جو قریب و دور کی شنیدہ، دیدہ نادیدہ ہر آہٹ کو چشم سماعت سے دیکھ سن لینے پر قادر، ناک (جو خاندیس کی محاورتاً نہیں حقیقتاً ناک ہے) آزاد غزل کی طرح کچھ سکڑی کچھ پھیلی سی۔ قوت شامہ اسقدر تیز کہ سونگھ کر ہی مخاطب کی باطنی کیفیت و نیت کا کچا چٹا کھول دے۔ آنکھیں پلنگ آسا روشن چمکدار۔ ایک آنکھ میں آندھی اور دوسری میں طوفان بے پناہ۔ اس پر مستزاد عقابی تیز نظر۔ جو فرازِ کوہ سے اتر کر تہہ نشیں خزف ریزوں اور گہر پاروں کے فرق کو دریا کی گہرائی و گیرائی میں اتر کر آسانی سے پرکھ لے۔ زبان مادر زاد برہنہ منافقین کے لئے۔ کاٹ دار شعلے اگلتی شمشیر بے نیام۔ اور موافقین کے حق میں شاخ ثمردار۔ چوڑا چکلا سینہ سینے میں بنام دل دریا کے دو کناروں کو جوڑتا ہر آن اٹھتا جوار بھاٹا۔ ہاتھ جام واژگوں جو دینا جانتے ہیں لینا نہیں۔ ایک ہاتھ میں خامہ اور دوسرے میں نیزہ (ابوجہل و ابولہب کی سرکوبی کے لئے) پاؤں۔ بیشتر صداقت، خیر اور حسن کی جانب رواں دواں۔ ہمہ وقت سوچتا کسرتی گٹھیلا بدن۔ حواس خمسہ ظاہری سے زیادہ حواس

خمسہ باطنی زیادہ حساس و بیدار۔

؎ نظر میں برق لہو میں دھنک نَفَس میں شرار

یہ کون شخص ہے ہم خود سروں سے آگے بھی (صابر زاہدؔ)

جی ہاں! یہ شخصی خاکہ اس مردِ قلندر کا ہے جسے خاندان کے بزرگ مرد و خواتین پیار سے مکیا۔ ہم پیشہ مدرسین مقیم الدین ماسٹر اور ادبی حلقہ مقیم اثر بیاولی کے نام سے جانتا ہے۔ گندمی رنگ قد ساڑھے پانچ فٹ جو سرو قداں کو جھکا دے۔

مقیم اثر بیاولی نے مالیگاؤں کے ادبی حلقوں کی جانب سے ان پر کئے گئے لسانی، تہذیبی، علمی اور ادبی (کردار کُش) چومکھی حملوں کی تاب نہ لا کر کبھی قبولیت کے لمحوں میں اپنے پروردگار سے یہ دعا مانگی تھی۔

؎ ہر ایک چیز تو اپنی پسند کی رکھنا

مرے مزاج کا بس ایک آدمی دینا

اور پھر یوں ہوا کہ مالک جبر و اختیار نے مظلوم کی دعا کو شرفِ باریابی عطا فرماتے ہوئے اس خاکسار کو 1987 میں مالیگاؤں بھیج دیا کسی نے سرگوشیانہ انداز میں طنزاً کہا تھا لو صاحب ''یک نہ شد دو شد'' وہ دن اور آج کا دن دو مثبت انائیں ایک دوسرے کو پہلو یائے بیٹھی ہیں۔ کہتے ہیں خیالات میں ہم آہنگی اور مزاج میں مطابقت جب تک نہ ہو دوستی کی مستحکم بنیاد نہیں پڑتی بقول شخصے

؎ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز۔ ''ہنسا پائے مان سرور تال تلیاں کیوں کھوجے''

ضلع جلگاؤں میں ست پُڑا کے دامن اور تاپتی کے قلب میں ایک گاؤں بیاول (یاول) ہے۔ یہاں کے باشندوں کا خاص پیشہ کاشت کاری اور باغبانی ہے۔ سخن بانی کا بیج اس سنگلاخ زمین میں استاذ الاساتذہ حضرت ایمان بیاولی نے بویا تھا۔ ایمان بیاولی کا ایک مجموعۂ کلام چراغِ ایمان ہے، جو فی زمانہ ایمان کی طرح نایاب ہے۔ غالباً ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے کہ بھساول میں ایک کل ہند انعامی طرحی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا تھا جسمیں صف اول کے مشاہیر شعراء نے شرکت کی تھی۔ طبع آزمائی کے لئے مصرع دیا گیا تھا۔

؎ دھوم سے میرے دلِ مرحوم کا ماتم ہوا۔ حضرت ایمان نے بھی اپنے شاگردوں کے کلام کے ساتھ بہ نفسِ نفیس اس انعامی طرحی مشاعرہ میں حصہ لیا تھا جوں نے گھر کی مرغی ساگ برابر جان کر ایمانؔ بیاولی کو انعام سے محروم رکھا تھا اور جانشین داغؔ حضرت نوح ناروی کی غزل کو پہلے انعام کا

حقدار قرار دیا تھا۔ مگر نوحؔ نے بذاتِ خود جلسہء تقسیم انعامات سے خطاب فرماتے ہوئے کہا تھا کہ ایمان کی بات یہ ہے کہ اس انعام کا حقدار میں نہیں بلکہ ایمان بیاولی ہیں اور انعام یافتہ چاندی کا تمغہ ایمانؔ بیاولی کو سونپ کر اپنے عظیم ہونے کا لوہا منوالیا تھا۔ یہ خاندیس کی ایک تاریخی حقیقت ہے۔

مقیم اثرؔ کا شاعرانہ خمیر بھی اسی خاک سے اٹھا ہے۔ چراغ ایمان کی روشنی نصف صدی کا سفر طے کرتی کراتی مقیم اثرؔ کے حصے میں بھی آئی ہے۔ اور آج مقیم اثرؔ کی بدولت بیاول کی مٹی سونے کی طرح چمک دمک اور مہک رہی ہے۔ تبریزی گدی کا وارث ہونے کے ناطے مقیم اثرؔ کرمکان شب تاب کی طرح پچھلے پہر کے شاعر نہیں ہیں بلکہ یہ مہر آہنگ سخنور آفتاب کو ذہن کے آفتاب میں پگھلا کر شعر کہنے کا عادی ہے۔ وھالی بال کے مایہء ناز کھلاڑی اور انصار یہ کلب کے کیپٹن ہونے کی وجہ سے انمیں اسپورٹس مین اسپرٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ شاید و باید ہی اس کھلاڑی شاعر نے سنگل رن جوڑا ہو جب بھی اسٹروک لگایا ہے چوکا اور چھکا ہی مارا ہے چھکا انھیں زیادہ عزیز ہے۔ ایک سخن ناشناس پر اپنی برہمی کا اظہار کیا خوب کیا ہے۔

؎ غزل تو خاک سمجھتا مگر ادا وہ تھی
کھلاڑی جیسے ملا ہو کسی کھلاڑی سے

انھیں تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس دونوں نے اُس گھاٹ پر پیاسا مارا ہے جہاں علم و ادب کا ایک دریائے ناپیدا کنار آج بھی بہہ رہا ہے۔ یہ انکی تشنگی ہی ہے جس نے شعلہ جُو الہ بلکہ جوالا مکھی کا روپ دھارا ہے ورنہ پچاس ہزار شعر کہنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ مقیم اثرؔ کو مالیگاؤں کے ادبی حلقوں کا شکر گذار ہونا چاہیے جنکے چومکھی حملوں نے ان کے فن کو تپا تپا کر سونے سے کندن بنا دیا ہے۔

پچاسوں دیوانوں کے اس دیوانے شاعر کا ایک اور محیر العقل کارنامہ یہ بھی ہے کہ موصوف نے انتہائی قلیل مدت میں یعنی صرف ۱۷ دنوں میں ۸۰ غزلوں کا ایک دیوان مکمل کر کے اپنی قادر الکلامی کا سخنوروں سے لوہا لیا ہے۔ ملحوظ رہے کہ انکی ہر غزل ۹ شعروں پر مشتمل ہوتی ہے۔

اس حساب سے (۹×۸۰)= کل ۷۲۰ اشعار ہوتے ہیں۔ موصوف کی اس بیاض شعر میں بطور اسِتناد مرحوم احمد نسیم مینا نگری اور راقم کی آراء بھی شامل ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ بد دماغی، سنک اور شعلہ مزاجی کے اعتبار سے یہ میرؔ سے بھی آگے کی چیز ہیں۔ بقول رومیؒ انانیت دراصل انکساری و خاکساری کی معراجی شکل ہے۔ اور پھر کیوں نہ ہو شاعر نے ایک تحقیقی جائزے کے مطابق میرؔ کے کچے پکے تقریباً ۱۷۰۰۰ میل کے پتھروں سے آگے اپنی کوہ پیا

ہمالیائی انفرادیت کا ایک ایسا پتھر نصب کیا ہے جس کی زیارت آتی نسلیں کئی صدیوں تک کرتی رہیں گی ۔اگر میرا یہ صداقت پر مبنی بیان لوگوں کو غلو لگے تو مجھے کہنے دیجئے کہ غلو بھی ظرفی علو کا متقاضی ہوتا ہے۔

اس آتش سوار، سیماب پا شاعر کی ہوا مزاجی بلکہ انانیت کی حدوں کو چھوتی آتش فشانی کے باوجود معاملاتِ صلہ رحمی کا یہ عالم ہے کہ کسی بھی حاجت مند کی نوک مژہ سے قطرۂ ناب ڈھلکنے سے قبل ہی اسے سلک گہر بنا دینا اور ضرورت مند کے دامن مراد کو موتیوں سے بھر دینا انکی فطرت ثانیہ ہے۔سنت ابراہیمی کے اس قدر قائل ہیں کہ ان کے دستر خوان کی وسعت و درازی کی دعائیں شیراز و بایزید کی روحیں بھی مانگتی ہیں۔کوئی رت ہو ان کا دستر خوان سبزہ زار نظر آتا ہے۔انھیں کسی نے بھی آج تک کوچہء دلدار سے فرازِ دار تک، گھر سے بازار تک تنہا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔قسام ازل نے ان کے ہاتھ کی لکیروں میں بجائے قسمت دریائے سخاوت رکھ دیا ہے۔یار لوگوں نے محض انکی سخت گیری دیکھی ہے جہاں گیری نہیں۔موصوف کا یہ شعر جو زبان زدِ عوام وخواص کی سند حاصل کر چکا ہے۔

ے ایک روٹی اسے میں کیسے اکیلا کھاؤں
میرے حصے میں کسی اور کا حصہ لکھ دے

بے شک انکے فقیرانہ و مستغنی مزاج کی ماورائے سخن روشن دلیل ہے۔اپنی ذات سے انجمن ہونا یہ محاورہ کافی پرانا ہو گیا ہے۔مقیم اثرؔ ایک شخص کا نہیں ایک ادارے کا نام ہے جو کام ایک ادارہ برسوں میں نہیں کر سکتا اسے یہ بلا شرکت غیرے آج کل پرسوں میں آنکھ کی جھپکی میں انجام دہی کا بوتا رکھتے ہیں۔میں یہاں قصداً مثالوں سے گریز کر رہا ہوں ورنہ کئی نامی گرامی جودھاؤں کی حقیقت برہنہ ہو جائیگی۔شہر کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی انجمنوں کی سربرآوردہ قیادتیں مقیم اثرؔ کا طواف کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔اس تجربے کی روشنی میں موصوف کا یہ شعر دیکھیے۔

ے اک محترم کے ساتھ رہے ہم بھی شہر میں
قد اُنکا لیکن اپنی بھی عزت بدل گئی

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شاعر ایک صحافی بھی ہیں۔یہ بیک وقت کئی اخبارات کے مدیر ہیں انکے اخبارات کی سنسنی خیز بلکہ لرزہ خیز خبریں شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آن واحد میں پہنچ جاتی ہیں۔یہ روزانہ ایک نیاز بانی اخبار جاری کرتے ہیں جس سے انکے حریفوں کے خیموں کی طنابیں اکھڑ جاتی ہیں بایں سبب سارا شہر ملکر بھی ان کا اک بال بھی بیکا نہ کر سکا۔بقول ناظر خیامی

ے میرے اشعار کا اک بال بھی بیکا نہ ہوا

اُسترا ہاتھ میں تھامے رہے حجام غزل

مردم شناسی کا جوہر ہونے کے باوصف محض تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے یہ قصداً فریب کھاتے ہیں اور تنہائی میں جھانسہ دینے والے کی سادگی اور بھولپن کا مذاق اڑا کر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں یہ وہ کافر عشق ہے جو اپنے آپ کو ایک ہی سانپ سے کئی کئی بار ڈسوا کر وش پرش کی طرح مست و سرشار رہتا ہے۔ یہ شعر ان کی تجربہ پسندی پر دال ہے۔

؎ عشق جوگی سانپ کی آنکھوں میں بھی آسن جمائے
جس کو منتر یاد ہو وہ سانپ سے آگے چلے

بے شک موصوف کو زہر کو تریاق اور تریاق کو زہر بنا دینے کا ہنر بھی خوب آتا ہے۔ مقیم اثر شاعر مہر آہنگ ہونے کے ناطے انکی شاعری خدیدی کم اور حدیدی زیادہ ہے۔ انکے یہاں جمال سے زیادہ جلال کی کرشمہ زائیاں ہیں جو ماورائے کمال ونوال ہیں۔ (ماخوذ از نظام صدیقی) شاعر نے شاعری کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر فن کو معراج بندگی عطا کی ہے۔ ''لاتقنطوا''، ''نغمۂ سنگ''، ''بدن نژاد قبا'' کی رونمائی اور شکست آواز کے بعد شاعر نے اپنے غیر مطبوعہ مجموعہ ہائے کلام کو اس قدر معنوی خوش آہنگی اور لفظی ارتباط بخشا ہے کہ اگر دو منفرد مجموعوں کو باہم دیگر جوڑ کر قرات کے ساتھ پڑھا جائے تو جہان معانی کے نئے نئے در وا ہونے لگتے ہیں۔ جیسے جرس گل کو رقص شرر سے، زنجیر صبا کو پیراہن خاک سے، جلوۂ سراب کو برقِ نظر سے، وحشتِ در کو غزالِ شوق سے، سرودِ شام کو شعاعِ درد سے، طاؤس رنگ کو نگارِ دشت سے، تبسم اشک کو طوافِ نور سے، شعورِ زخم کو زخمِ جنوں سے، رمِ غزل کو لمسِ ماورا سے، موج بے زنجیر کو لوحِ صحرا سے، آسمان بے زمین کو شعلہ زارِ حرف سے، تیغ خود نگر کو آگ لگائیں برف کے پر سے، خاک خاک موج کو ورق ورق گلاب سے، قطرۂ بحر کُشا کو کعبۂ گل سے، آئینۂ محوِ تخلیقیت کو حیرتِ آئینہ سے، بہشتِ ذات کو شفق زارِ نظر سے، ریت ریت پیام کو سنگِ آئینہ نما سے، نکہتِ صد رنگ کو آئینہ بدن خاک سے، آب آب سلگتے دائرے کو آبجوئے شعلہ خو سے، جہت سفر افروز کو مد و جزرِ خواب سے، گلدستۂ نگاہ کو سرحدِ امکاں سے، لہو بھی ایک معجزہ' ہے نمِ آتش خیز کا کہ صدائے شہرِ اجنبی میں شاعر گذشتہ چالیس برسوں سے عالم وارفتگی کا شکار صحرائے سخن کی خاک چھاننے میں اسقدر منہمک ہے کہ اسے اپنے پاؤں کے آبلوں کی گل کاریوں کا پتہ بھی نہیں چلا اور یوں صحرا کی وسعتیں پاؤں کے آبلوں سے گزر کر گل و گلزار ہوگئیں۔ یہ لہو کی معجز نمائی نہیں تو اور کیا ہے؟ بے شک ایسے جنوں پیوست لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں کو محیط ہو جاتے ہیں

۔مقیم اثر ان میں سے ایک ہیں۔ان کی شاعری پر ہزار ہا ہزار صفحات بھی لکھے جائیں تو کم ہیں۔جب یہ آفاق گیر نابغہ، روزگار کارنامہ عشوہ طراز و ہزار شیوہ ضعیف العمر زلیخائے غزل نے دیکھا تو اس یوسف ثانی کے بے پناہ فنکارانہ حسن کے زرنگار جلوؤں کی تاب نہ لاسکی اور دل و جان سے اپنی تمام تر انگڑائیوں، رعنائیوں اور برنائیوں سمیت اس پر فریفتہ ہوگئی۔اتنا ہی نہیں بلکہ پروردگار ادب سے دوبارہ جوانی کی دعا بھی مانگی اور پھر یوں ہوا کہ یوسف ثانی مقیم اثر کی خاطر زلیخائے غزل کو دوبارہ جوانی عطا کی گئی جب یہ حقیقت عزیز عصر (مصر نہیں) پر روز روشن کی طرح عیاں ہوئی تو اس نے اپنی اور سب کی چہیتی زلیخائے غزل کا دامن یوسف ثانی کے گریبان تار تار سے ہمیشہ کے لئے باندھ دیا۔وہ دن اور آج کا دن غزل برابر مقیم اثر کی ریڑھ کی ہڈی میں اسرایت کئے ہوئے شاعر کے ابلتے خون سے رس جس اور مس حاصل کر رہی ہے اور مقیم اثر بھی غزل کو اپنا خون دل پلا پلا کر اسکی جوانی اور سر مستی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔بقول نظام صدیقی ''شاعری اور تنقید بھی عورت کی طرح مکمل مرد چاہتی ہے'' مقیم اثر کی مردانگی کا اعتراف نہ صرف نظام صدیقی نے کیا ہے بلکہ ایمر جنسی کے دور سیاہ میں ایک انقلاب آفریں نظم پڑھنے کی پاداش میں جب شاعر کو حوالات میں ڈال دیا گیا تھا تو رہائی کے بعد مقیم اثر کے اعزاز میں منعقدہ ایک جلسہء عام سے خطاب کرتے ہوئے مالیگاؤں کے سابق وزیر روزگار اور اپوزیشن لیڈر نہال احمد نے اہل مالیگاؤں کو للکارتے ہوئے یہ بانگِ دُہل یہ کہا تھا کہ مالیگاؤں کی پانچ لاکھ آبادی میں ایک ہی مرد ہے اور وہ ہے ''مقیم اثر بیاولی'' یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ایک کھلی تاریخی حقیقت ہے۔

مقیم اثر کے پاس اس قدر وقیع و وسیع کام ہے کہ موصوف کی شاعری کا دیانتدارانہ تجزیہ واحاطہ کرنے کے لئے مروج تنقیدی مفروضوں سے ہٹ کر کوزہ گرانِ نقد و نظر کو نئے تنقیدی ضابطے اور پیمانے ڈھالنے پڑیں گے یا پھر خود شاعر کو فراق و غالب کی طرح برہان قاطع اور قاطع برہان بن کر پہلے ارتکاب کفر کرنا پڑے گا اور بعد میں ردّ کفر کا فتویٰ خود ہی صادر کرنا پڑے گا یا پھر سرمائی شاعر محمد علوی کی طرح راتوں رات مشہور ہوجانے کے لئے کوئی ادبی چکر چلانا پڑے گا۔یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ محمد علوی نے دلی کے ایک عالیشان ہوٹل میں ہمارے عصر کے چندے ماہ تاب چندے آفتاب چند قدآور جنوں کو اسکاچ کی بوتلوں میں اتار کر خود الہ دین بن کر ان سے اپنی بڑھائی کے توصیف نامے لکھوائے بعد میں ان مضامین کو کتابی شکل میں چھاپ کر راتوں رات صاحب اسلوب فنکار بن بیٹھے۔میں مقیم اثر کو اس قدر گھناونا مشورہ ہرگز ہرگز نہیں دے سکتا ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اب

ہمارے ادب کو کمرشیئل نقادوں کی ضرورت نہیں جنھوں نے رائی کو پہاڑ اور پہاڑ کو رائی کی طرح پھونک مار کر ہوا میں اڑا دیا ہے۔ کتنے ہی بانی آج بھی دلی کے کناٹ پیلیس میں اپنی ناقدری کا انتقام لینے کے لئے جیب میں چاقو رکھے انھیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ کتنے شکیب جلالی اپنا ادبی استحصال ہوتے دیکھ کر خودکشی کے دہانے پر کھڑے ہوئے کمرشیئل نقادوں کو گھور رہے ہیں۔ آج ہمارے عہد کو ان کمرشیئل نقادوں کی نہیں بلکہ قاری اساس تنقید کی اشد ضرورت ہے۔

کنیز عصر ہے تنقید شہ کی پروردہ
غزل کے شعر پڑھو تبصروں سے آگے بھی (صابر زاہدؔ)

مقیم اثرؔ جتنے اچھے سخنور ہیں اتنے ہی اچھے ایک نکتہ رس سخن سنج اور سلیقہ مند ناقد و نثار بھی ہیں ۔ احترام بزرگاں میں سراپا بچھ جاتے ہیں۔ منفی انا گزیدہ کھوکھلے فنکاروں کے لئے نیزہ بکف ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھوں کی مجال نہیں کہ انھیں غزل سنائیں اس خاک نشیں کی بارگاہ میں آسمان تابی سر بہ سجود ہو جاتی ہے۔ بہتوں کے تخلیقی حمل بھی ساقط ہو جاتے ہیں۔ مقیم اثرؔ کو ہمیشہ کی طرح میں غزل سنا رہا ہوں وہ ہمہ تن ہوش ہو کر بلکہ چشم گوش ہو کر شعروں کو دیکھ سن رہے ہیں حسب عادت اس شعر پر چونکے۔

جو ہو سکے تو لہو کے بھنور میں ڈھونڈ اُسے
شبیہہ لمس کہاں آئینہ سے آئے گی

اثرؔ کا اعتراض یہ تھا کہ میاں ترکیب غلط ہو گئی ہے۔ شبیہہ مرئی شے کا عکسی روپ ہے جبکہ لمس غیر مرئی شے ہے پھر لمس کی شبیہہ چہ معنی دارد؟ اعتراض سن کر ابھی میں گومگوں کے عالم ہی میں تھا جواز ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ موصوف نے قدرے تامل کے بعد خود ہی کہا کہ ترکیب نہ صرف درست ہے بلکہ تراکیب شعریات میں اضافہ کی بھی حامل ہے دلیل یہ دی گئی کہ آئینہ دل کا استعارہ ہے اور دل لہو کا منبع ومخرج ہے آئینہ میں شبیہہ اترتے ہی لہو کے بھنور میں مدغم ہو گئی ہے مگر عاشق اپنی باطنی آنکھ سے لمسیاتی کیفیت کو چھو کر دیکھ رہا ہے اس تناظر میں شبیہہ لمس سراپا مرئی پیکر میں ڈھل گئی ہے اور میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا کے مصداق میں مقیم اثرؔ کی اس خوبی کا قائل ہو گیا اور آج بھی ہوں کے وہ صحیح شعر کو غلط اور غلط کو صحیح ثابت کر دکھانے پر غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں۔

ایک اور واقعہ:

استاد شاعر حضرت ادیبؔ مالیگانوی کے پہلے اور آخری دیوان ''تبسم'' کے پہلے ہی صفحہ پر تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہے۔

اے دوست میرے چہرۂ بے رنگ پر نہ جا

سو آفتاب ہوں تہہ داماں لیے ہوئے

مقیم اثر اپنے ایک دیرینہ بزرگ دوست اور محسن انصاری شمس الضحیٰ عرف بدرو بھائی [بدرو بھائی اگر اثر کی رہنمائی نہ فرماتے انھیں سنبھالا نہ دیتے تو یقیناً شہر نکیرین میں اثر حقیقی معنوں میں باولا جاتے اور اپنے آپ کو کاٹنے لگتے] کے ہمراہ حضرت ادیب کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض گذارتے ہوئے کہا کہ قبلہ گستاخی معاف آپ کا کلیدی شعر ہی غلط ہو گیا ہے۔ شعر میں رنگ کا نہیں نور کا محل ہے۔ استاد نے غلط ہونے کی توجیہہ طلب کی ذرا غور فرمائیں بھلا بے رنگی سے آفتاب کا کیا علاقہ؟ آفتاب سراپا نور ہے۔ تلازمہ غلط قائم کیا گیا ہے۔ ابھی حضرت ادیب اثر کے اثر سے نکل بھی نہیں پائے تھے کہ اثر نے خود ہی اپنی دلیل کو معکوس کرتے ہوئے کہا کہ قبلہ آپ تردّد نہ فرمائیں شعر اپنی جگہ درست ہے۔ شعر میں بے رنگ مجازِ مرسل کے طور پر آیا ہے۔ رنگ سے بھی نور پھوٹتا ہے اور نور بھی سراپا رنگ ہے اور تصوف کی اصطلاح میں دراصل بے رنگی یا یک رنگی ہی ہمہ رنگی ہے ان معنوں میں تلازمہ غلط ہوتے ہوئے بھی درست ہو گیا ہے۔ میں نے یوں ہی شرارتاً اعتراض اٹھایا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ اثر کی زبانی یہ دلیل سنتے ہی حضرت ادیب کا بے رنگ چہرہ پُر نور ہو گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہاں کسی کی توصیف یا تضحیک کرنا راقم کا مقصد و منشا نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مقیم اثر میں سخنوری کے ساتھ ساتھ ناقدانہ صلاحیت بھی بدرجہء اتم موجود ہے۔ ذہن نشین رہے کہ آج مالیگاؤں کا جو وزن و وقار اور ادبی قامت وقد ہے وہ حضرت ادیب مالیگانوی کا مرہون ہے۔ خود مقیم اثر دل سے مرحوم کی شاعرانہ و استادانہ صلاحیتوں کے قائل و معترف ہیں۔ مذکورہ واقعہ جس راوی سے مروی ہے یہاں اس کا نام دانستہ صیغہء راز میں رکھا گیا ہے تا کہ کوئی غلط فہمی راہ نہ پا سکے؟

غالبؔ، میرؔ اور اقبالؔ اردو شاعری کے تین بڑے فکری دھارے ہیں۔ جو رنگ و آہنگ و روانی کے اعتبار سے جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں۔ مقیم اثر کے یہاں غالبؔ کا تعقل اور معاشرتی عرفان، میر کی انانیت اور شور انگیزیت، اقبالؔ کا فلسفہء خودی اور مشرق پرستیت کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ مقیم اثر ان تین دریاؤں کے فکری دھاروں کو کاٹتے ہوئے اپنے لیے ایک فکری راہ بنا لینے میں کامیاب ہیں۔ میری ناقص رائے میں مقیم اثر کی شاعری بیسویں یا اکیسویں صدی کی شاعری نہیں ہے بلکہ Millenium2000 کو محیط ہے کہ آج بھی انکے فکری سوتے جاری و ساری ہیں۔ ورنہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو تین اور بس خاندانی منصوبہ بندی کی طرح ہمعصر فنکاروں میں سے بہتوں کے

فکری سوتے ''سوتے کے سوتے'' رہ جاتے ہیں یا پھر وہ اپنے آپکو یا اپنے ہمعصروں کو دہرانے لگتے ہیں۔انکی شاعری جمود و خمود کا شکار ہو کر تاریخ ادب کے سرد خانوں کا حصہ ہو جاتی ہے۔مگر آج بھی یہ پچاس ہزار یہ بلکہ قطب مینار یہ شاعر سفر مدام سفر کے مصداق نہ صرف نئی منزلوں کی طرف رواں دواں ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک جہت سفر افروز کا تابندہ اشاریہ بھی ہے۔

''مقیم اثر شخصیت اور فن'' ریسرچ اسکالرز کے لئے ایک ہمہ جہت ریڈی میڈ موضوعی مصالحہ ہے۔پی ایچ ڈی کے خواہشمند اگر یہ موضوع منتخب کریں تو انھیں ہزار دو ہزار صفحات پر مشتمل Thesis لکھنے میں زیادہ تحقیق و محنت اور دوڑ دھوپ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مقیم اثر کے مہم جو یانہ مزاج سخن کے پیش نظر میں انھیں ادب کا سند باد کہتا ہوں انکے کلام کا معتد بہ حصہ انکی شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔جیسے

۱) ؎ کرچیوں سے الجھتے ہوئے عصر میں سورجوں کو جھکانے کا فن جانتا کون تھا
ایک وہ ہی تھا جس نے راتوں میں روشن رکھیں دل جلا کر سخن کی لویں

۲) ؎ کس مد میں اسے صرف کروں سوچ رہا ہوں
اک بوند جو باقی ہے ابھی دل میں لہو کی

۳) ؎ میرے لہو سے کیسے سنورتی نہ پھر غزل
معنی تراش حرف کا پھیلاؤ مجھ میں تھا

۴) ؎ بلند ہوگا تو یہ سر رہے گا نیزے پر
اگر جھکا تو بجھا دے گا پیاس خنجر کی

۵) ؎ جس کو چنتی ہے مشیت کسی مقصد کے لئے
اس کا انداز ہی ہم سب سے جدا ہوتا ہے

لاتقنطوا۔نغمۂ سنگ۔بدن نژاد قبا کے بعد ''سرحد لفظ نہیں''۔نابغہء شعریات کمپیوٹری شاعر مقیم اثر بیاولی کی چوتھی اہم جست ہے۔مقیم اثر بیک وقت نظم و غزل (بشمول آزاد غزل) پر فنکارانہ،خلاقانہ، عارفانہ،حکیمانہ و حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔اس شہسوارِ غزل کے پاس فی نفسیہ 90 دواوین کا وقیع سرمایہ ہے جو اس حقیقت پر دال ہے کہ عہد میر سے ہمعصر زندگی تک اتنا بڑا شعری اثاثہ اردو شاعری خصوصاً غزل کے ذخائر میں برصغیر میں کسی کے پاس نہ کل تھا نہ آج ہے۔ہمارے اس تشہیر پسند عہد میں مقیم اثر نے نام سے زیادہ کام پر اپنا شاعرانہ انہماک و اعتماد اور زورِ قلم صرف کیا ہے جو بجائے خود

ایک عظیم کارنامہ ہے۔

نشانِ خاطر رہے کہ ایک لاکھ خالص غزلیہ اشعار ہیں۔نظموں کے اشعار کی تعداد ہنوز (Uncounted) ہے۔مقیم اثر نہ مشاعروں کے شاعر ہیں نہ رسائل و جرائد میں چھپتے ہیں بقول ظفر اقبال

؎وہ دفینہ ہوں جو مستور ہے سب سے ابتک
توڑتا ہی نہیں آکر کوئی دیوار مری

ظفر اقبال کی دریافت کا سہرا فاروقی کے سر جاتا ہے۔مقیم اثرؔ کو دنیائے ادب میں متعارف کروانے کا credit مشہور مابعد جدید نقاد نظام صدیقی کو جاتا ہے ورنہ اس گوہر آبدار و نایاب سے بازار ادب محروم رہ جاتا۔نظام صدیقی نے مقیم اثرؔ کو دریافت کر کے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔

؎کون یہ اوندھا گیا لات و منات ِ نقد کو
بتکدے کا بت کدہ مائل بہ سجدہ ہو گیا (صابر زاہدؔ)

مقیم اثر کا خامہ ءخونچکاں ہنوز پیاسا ہے خدا کرے موصوف کے قلم کی پیاس کبھی نہ بجھے۔(آمین)

اِقرا بِاسمِ ربِّكَ الَّذِی خَلَق (۱) خَلَقَ الاِنسانَ مِن عَلَق (۲) اِقرا وَ رَبُّكَ الا كرمُ (۳) اَلَّذِی عَلَّمَه بِالقَلَمِ (۴) عَلَّمَ الاِنسانَ مَالَم يَعلَم (۰)

ترجمہ: پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کیساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی پڑھو اور تمھارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا۔

نوٹ: زیر نظر مضمون معروف شاعر صابر زاہدؔ نے مقیم اثرؔ بیاولی پر ایک خاص رسالہ کے خاص نمبر کیلئے تحریر کیا تھا۔صابر زاہدؔ چند برس قبل اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور مقیم اثرؔ بیاولی ۲۷/اپریل ۲۰۱۶ء کو اس دنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆☆

عصری آگہی کا شاعر: رفیق عادل

مضمون نگار : محمد رفیق شیخ محبوب

قلمی نام : ایم۔رفیق

پیدائش : یکم جون ۱۹۵۴ء

تعلیم : ایم اے (انگریزی) ایم اے (پولیٹیکل سائنس) بی ایڈ

پیشہ : وظیفہ یاب نائب مدرس

رہائش : نظام ہاؤس، ڈانگ پورہ، یاول، ضلع جلگاؤں 09970206785

بڑی عجیب بات ہے کہ شعروادب کے معاملے میں خاندیش کو بنجر علاقہ کہا اور سمجھا جاتا رہا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ماضی بعید سے ہی اس علاقہ میں شعروادب اور علم وثقافت کا کام انتہائی اچھے صاف ستھرے اور معیاری سطح پر ہوتا رہا ہے۔خاندیش کے ادبی وتہذیبی پس منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں بے حد حیرت کن مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ یہاں ادبی وثقافتی کام ہوتے رہے ہیں۔شعرو ادب کی محفلوں کا انعقاد نیز سماج میں خوش تبدیلیاں لانے والے ثقافتی کام اس علاقہ کے جیالوں نے کیے ہیں۔خاندیش کے بیشتر مقامات کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ریاستی نہیں بلکہ ملک گیر شہرت یافتہ شعراء یہاں کے لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ کر چکے ہیں۔

گزشتہ دنوں میں اس علاقہ میں بیشتر شعراء ہمیں ایسے ملتے ہیں جنھوں نے اپنے کلام سے صرف اپنے علاقہ میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں دھوم مچائی۔ان میں کچھ شعراء صاحب دیوان بھی تھے ۔شعروادب کی یہ روایت ضلع جلگاؤں کے تاریخی شہر فیض پور میں بھی ملتی ہے۔یہاں کے مشہور و معروف وصوفی ذہن کے مالک مرحوم ابوالحسن صاحب کی کوششوں اودعاؤں کے طفیل آنے والی نسلوں

میں بھی ادبی شعور جنم لیتا رہا۔اس کی زندہ مثال ،ملک گیر شہرت یافتہ افسانہ نگارو شاعر جناب احمد کلیم فیض پوری صاحب کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ہر چند کہ وہ ایک طویل عرصہ سے بھساول میں قیام پذیر ہیں لیکن انھوں نے اپنے نام کے ساتھ وطن عزیز کو جوڑے رکھا۔ان کے بعد کی نسلوں میں رفیق عادل کا نام آتا ہے جنھوں نے بہت کم عرصہ میں شعروادب میں اپنا سکہ جمالیا تھا۔

رفیق عادل کا جنم ۵ رمئی ۱۹۵۲ء کو فیض پور کے ایک علمی گھرانہ میں ہوا۔ان کے والد بزرگوار مرحوم قاضی محمد شفیع صاحب کو علامہ اقبال ،سعدی شیرازی اور مولانا روم کا فارسی کلام ازبر تھا۔ جب وہ اپنے ذہن بے دندان سے لہک لہک کر فارسی کلام خوش گلوئی کے ساتھ سناتے تو ہم جیسے بچے جو صرف فارسی کی ابتدائی گردان سے واقف تھے۔کلام کے معنیٰ نہ سمجھتے ہوئے بھی جھوم جھوم جاتے ۔پدر محترم کی اس قابلیت نے رفیق عادل کے شعری شعور کو جگایا۔ان کی ابتدائی تعلیم مولانا آزاد ہائی اسکول فیض پور میں ہوئی۔محنتی اساتذہ کی محنتوں اور قابلیتوں کا اثر طلبہ پر تو ہونا ہی تھا۔پس دہم جماعت میں زیر تعلیم ہوتے ہوئے ان میں شعر گوئی و نثر لکھنے کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

ان کا یہ شوق جاری رہا اور اپنے وقت کے ماہر عروض جناب ذاکر عثمانی صاحب کی اصلاح نے ان کے شعری شعور میں جلا پیدا کردی۔رفیق عادل زمینی آدمی تھا اور زمینی حقائق سے دوچار ہوتے ہوئے اس نے اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے لئے نظم و نثر دونوں کا سہارا لیا۔اسکی غزلوں کا مجموعہ اعتراف ۱۹۹۲ء میں اس کی حیات میں ہی شائع ہوگیا تھا۔اسکی تخلیقات ملک گیر اخبارات ورسائل میں شائع ہوئیں اور بقول احمد کلیم فیض پوری صاحب ''اپنی منزل کی پہلی سیڑھی پر ہی رفیق عادل کو وہ کامیابی ملی جو اپنے ابتدائی دور میں کم ہی کسی قلم کار کو نصیب ہوتی ہے۔اس طرح انھوں نے اپنا قد اپنے سائے سے بلند رکھنے کا کمال دکھایا۔میں نے اپنے پرانے مضمون میں رفیق عادل کی کاوشوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا'' رفیق عادل اپنے جیسے کروڑوں انسانوں کی طرح زمین پر رینگتے ہوئے زمین کی ہی بات کرتا ہے۔اس نے زندگی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس کی حرماں نصیبی کے سامنے کبھی شکست قبول نہیں کی۔وہ نہ سپنے دیکھتا ہے نہ سپنے دکھاتا ہے۔وہ ایک ایماندار شاعر کی طرح اپنی ذات میں ڈوب کر اپنے آپ کو گناہ گار بتا کر خود میں شر ڈھونڈ کر لوگوں کو ٹھنڈے پانیوں کے تلے سرسراتے سانپوں کا احساس دلاتا ہے۔''

اپنے احساسات و جذبات کو پیش کرنے کے لئے عادل رفیق نے ہمیشہ صاف ستھری سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا تاکہ عام قاری ان کی بات کو سمجھے اور محظوظ ہوسکے۔

تو اگر ہو بہو سلامت ہے

موسم رنگ و بو سلامت ہے

کم از کم اس قابل سمجھو

اپنے دکھ میں شامل سمجھو

عادل رفیق نے عصری تقاضوں کو برتتے ہوئے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کی۔

ہم نے بھی دروازہ سے تختی ہٹالی نام کی

دل کو ہے ڈھارس کہ اب ہرگز نہ پتھر آئیگا

اپنی غزلوں میں اس نے کسی بھی دھوم دھڑاکے کا استعمال نہیں کیا۔ اسکے یہاں انسان کے گرد وہ تمام پہلو جو انسانی زندگی کو متاثر کرتے ہیں انہی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مثلاً

دل کے زخموں کو چہرہ سے پڑھ لیں گے

تم نے کن لوگوں میں شامل جان لیا

بستی میں تو اپنا دشمن کوئی نہیں

کون ہے پھر یہ مد مقابل جان لیا

حساس طبیعت کی بنا پر وہ امراض قلب کا شکار ہوئے۔ پہلی اوپن ہارٹ سرجری کے بعد وہ کافی دن زندہ رہے لیکن دوسری اوپن ہارٹ سرجری کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے اور ۲۰۰۱ء کو وہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

ترا وقار، تری خود نوشت کے باعث

میں نیک نام ہوں اپنی سرشت کے باعث

دے گیا وہ میرؔ کا دیوان مجھ کو تحفتاً

اس طرح چپکے سے عادلؔ دے گیا وہ مات پھر

امن کا کیا ذکر لب پر آگیا

سنسناتا ایک پتھر آگیا

طوفان کی نذر ہو گئیں سب نیکیاں میری

عادلؔ! گناہ گار ہی اس پار آئے گا

ایک اک سانس داؤ پر ہے یہاں
یہ تماشا نگر نگر ہے یہاں

لوگ کہتے ہیں رفیق عادل مجھے
تو دبستان الم کا نام دے

تجھ سے کس نے کہا ہے کہ سمندر پہ برس
اے گھٹا جا کسی جلتے ہوئے منظر پہ برس

احساس دل کی راکھ ہی سے سر اٹھائے گا
ہر درد سوکھے گھاؤ کا صحرا کھلائے گا

زخموں سے چور چور بدن چل کسی طرح
رکتا نہیں ہے وقت کا بادل کسی طرح

بس اک خیال کہ امکان ہے گزرنے کا
بدن میں خوف دھڑکنے لگا بکھرنے کا

میں سوچتا ہوں کہیں بے حسی نہ چھو جائے
کبھی کبھی مرے اپنے ہی دل دکھاتے رہیں

☆☆☆☆

نصرتؔ راویری: معنی آفرینی ونشتریت کا شاعر

نام	:	شیخ محمد شکیل
قلمی نام	:	ڈاکٹر ایس ایم شکیل
ولدیت	:	شیخ محمود
ولادت	:	۱رجنوری ۱۹۷۳ء
تعلیمی لیاقت	:	ایم۔اے(اردو)، پی ایچ ڈی
پیشہ	:	درس وتدریس
پتہ	:	میٹھے مولا، آزادنگر، برہانپور (ایم پی)

9425086923,07694086923

علاقہ ٔخاندیش کی اردو شاعری کا سلسلہ ریختہ کے موجد شیخ سعدی دکنی برہانپوری اور صوفی شاعر حضرت بہاؤالدین باجنؒ سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت باجنؔ صاحب تصیف بھی تھے جو فارسی زبان میں 'خزانہ ٔرحمت' کے نام سے مشہور تھے۔ جس میں انکا گجری کلام بھی موجود ہے۔ ان حضرات کے بعد سرزمین خاندیش پر کئی صوفی شعراء گزرے جنھوں نے یہاں کی اردو شاعری کو عروج بخشا۔ ایسے شعراء میں شیخ علی متقیؒ برہانپوری، شاہ سعد اللہ گلشن (ولیؔ کے استاد)، شاہ عیسیٰ جند اللہ، شاہ منصورؔ شاہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد اس سلسلہ کو آگے بڑھانے والوں میں شاہ قاسمؔ، ضیاء خاندیشی، عاصیؔ، عاشقؔ، متینؔ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ خاندیش میں ان شعراء کی شعری روایت کو برقرار رکھنے والوں میں اطہر جلگانوی، حافظؔ دھولیوی، غریبؔ دھولیوی، ایمان بیاولی، ناظرؔ انصاری، حامدؔ جلگانوی، سلطانؔ نقشبندی ، رہبر جلگانوی، نشاطؔ شہادوی، قمر بھساولی، سیفؔ بھساولی، محسنؔ جلگانوی، مقیم اثرؔ بیاولی، راشدؔ ادیبی جامنیری، نصرتؔ راویری وغیرہ کے اسمائے گرامی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

ست پڑا کی وادیوں میں واقع راویر تحصیل میں شیخ اسحاق صاحب کے غریب خاندان میں ایک لڑکے نے ۱۴رجنوری ۱۹۳۰ء میں آنکھیں کھولیں۔ والدین نے بڑے پیار سے اس کا نام شیخ نصیر رکھا ۔مگر انھیں کہاں پتہ تھا کہ شیخ نصیر آگے چل کر دنیائے شعروادب میں نصرتؔ کے نام سے پہچانا جائے گا ۔نصرتؔ کو شعر گوئی سے دلچسپی پیدا ہوئی تو مشہور شاعر اور عروض داں مولانا ابراحسنی گنوری کے دامن سے

وابستہ ہو گئے۔استاد کی نظر کرم، تربیت اور اپنی محنت سے بہت ہی جلد نصرتؔ کا شمار مولانا ابر احسنی کے ممتاز شاگردوں میں ہونے لگا۔ مفلسی میں دن گزارنے کے باوجود پورے شاعرانہ خلوص اور صداقت کے ساتھ اپنی کشت فکر آبیاری میں لگے رہے۔نہایت مخلص اور سنجیدہ طبیعت کے مالک نصرتؔ شہرت اور نام کی پرواہ کئے بغیر اردو زبان کی حسین صنف غزل کے گیسو سنوارتے رہے۔بعد ازاں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی تخلیقات کے وسیلے سے آپ نے ادبی حلقوں میں اپنی الگ پہچان بنائی ۔نصرتؔ کسی دبستان کے پیرو ہیں اور نہ کسی تحریک سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ان کے ذوق شعر گوئی اور وجدان وفکر نے انھیں شہرت اور صلہ وستائش کی تمنا سے بے نیاز رکھا۔انھوں نے کبھی اپنے یوسف سخن کو بازار مصر میں نہ نیلامی پہ چڑھایا اور نہ ہی اپنی زلیخا (غزل) کو نظریاتی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔

۱۹۸۴ء میں نصرتؔ کا پہلا مجموعہ کلام 'بوند بوند لہو' کے نام سے منظر عام پر آیا۔جسے انکے فرزند اور شاعر ساحرؔ نصرت نے ترتیب دیا تھا۔اس کے بعد دوسرا مجموعہ 'گنبد کی صدائیں' ان کے انتقال کے ۲۰۰۲ء میں ساحرؔ نصرت کی ہی کاوشوں سے اشاعت کی منزل طے کر پایا۔نصرتؔ کے دونوں مجموعوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شعر کی تخلیق کرتے ہوئے اپنے ذہن وتخیل، اپنی فکر ونظر اور اپنے قرطاس وقلم کو کسی مخصوص نظریے یا رجحان سے وابستہ نہیں کیا بلکہ حقیقت اور سچائی پر مبنی اشعار تخلیق کئے۔انھوں نے اپنی شاعری کے موضوعات اپنے گرد وپیش، اپنی گلی محلے، اپنے شہر گاؤں ، اپنے ملک و دنیا کے مسائل سے منتخب کئے ہیں۔جیسے

اپنا ہی زہر بن گیا ہے موت کا سبب
ہر شخص اپنے آپ ہی کا ہے ڈسا ہوا

گھر جلائے ہیں ہمارے روشنی کے نام پر
ہم کو مٹی کا کھلونا جان کر توڑا گیا

اپنے بچوں کے لئے ہوں میں کھلونے کی طرح
میرا حال جو بھی ہو وہ بہل جاتے ہیں

بچپن میں ایک ساتھ جہاں کھیلتے تھے ہم
دالان اب وہ دیکھیے، کمروں میں بٹ گئے

نصرت نے اپنے غزلیہ اشعار میں کلاسیکی اور روایتی رنگ وآہنگ کے ساتھ عصری حالات اور مسائل، سماجی اور ذہنی وفکری کشمکش، زمانے کی نیرنگیاں، عشق ومحبت، حسن وجمال کے ابدی خیال وفکر

کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

ہواؤں میں بسی ہے تیری خوشبو — دھنک بھی تیرا پیکر ہوگئی ہے
میری سانسوں میں بس گئی خوشبو — جب بھی لہرائے صندلی سائے
بن کے قوس قزاح ابھر آئے — تیری زلفوں کے ریشمی سائے

نصرتؔ کے کلام میں معنی آفرینی کے ساتھ نشتریت بھی ہے اور عصریت بھی، ساتھ ہی زندگی کے بدلتے تیور کے اتھ نئے امکانات اور اشارات بھی، انکا شعری طنز اپنی ذات، معاشرہ اور زندگی کا سنجیدہ، مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ کا عطیہ ہے۔ جوان کی کھلی آنکھوں نے دیکھا، محسوس کیا اسے انھوں نے اپنے احساسات اور جذبات کے ساتھ اشعار کے حسین پیکر میں ڈھال دیا۔

زہر پھیلا رہا ہے چمن در چمن
آدمی سانپ کی کینچلی اوڑھ کر

خون میں ڈوبی ہوئی ہر سطر ہے
آج کا اخبار اٹھا کر دیکھئے

شہر سارا جل رہا ہے آج کل
سو رہے ہیں آپ لمبی تان کر

دوستوں کے ساتھ جو اکثر چلا
اپنے سائے سے بھی وہ بچ کر چلا

یہ انقلاب زمانہ بھی خوب ہے نصرتؔ
نظر ملانے لگے گدھ بھی اب عقابوں سے

بہرحال!

تڑپتا ہوں میں اپنے جسم کے ملبے میں برسوں
کسی بھی وقت یہ اجڑا ہوا گھر چھوڑ جاؤں گا
میں اپنے وارثوں میں کچھ کتابیں، ایک چشمہ اور
یہ چھپر پھوس کا، بوسیدہ بستر چھوڑ جاؤں گا

جیسے اشعار کہتے ہوئے نصرتؔ ۲۶ ر دسمبر ۱۹۹۳ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے روٹھ گئے۔

☆☆☆☆

ایسے تھے ہمارے یوسف کمالؔ صاحب!

مضمون نگار	:	جاوید انصاری
تاریخ پیدائش	:	۱۷؍جولائی ۱۹۶۲ء
وطن	:	مالیگاؤں (ناسک)
تعلیم	:	بی اے (انگریزی)، بی لب اینڈ آئی ایس سی
ملازمت	:	آکاش وانی جلگاؤں (ریڈیو پر اردو پروگرام کی پیشکش)

شہرۂ آفاق مزاحیہ اداکار چارلی چپلن نے اپنی سوانح میں ایک جگہ لکھا ہے کہ" جب آپ غمزدہ ہوتے ہیں تو دنیا آپ پر ہنستی ہے، پھر جب آپ ہنستے ہیں تو دنیا آپ کے ساتھ ہنستی ہے لیکن اگر آپ دوسروں کو ہنساتے ہیں تو دنیا آپ کو سیلوٹ کرتی ہے۔"

ایک دور تھا جب اردو مشاعروں کی فہرست مرحوم یوسف کمالؔ کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی تھی۔ کمال مرحوم علاقۂ خاندیش کے وہ واحد شاعر تھے جنھوں نے خاندیشی لب ولہجہ کو اپنا اسلوب بنایا اور پورے ہندوستان میں یکساں طور پر مقبول ہوئے۔ ایک تو طنز و مزاح کے شاعر دوسرے ان کی زبان اور لہجے میں بلا کی روانی تھی۔ دراصل شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شعر کی تلاش میں نکلتے ہیں اور دوسرے وہ جن پر شاعری کی دیوی از خود مہربان ہو جاتی ہے۔ مرحومِ یوسف کمالؔ دوسرے قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں نے کتنے مشاعرے لوٹے
اور کتنے تو ہاتھ سے چھوٹے
پٹ کر آیا نہیں کبھی بھی میں
پڑھنے تیار ہوں ابھی بھی میں
کس سے ملتا نہیں جدا ہوں میں
شاعرِ آل انڈیا ہوں میں

اچھے اچھے سلام کرتے ہیں

سب مرا احترام کرتے ہیں

مرحوم یوسف کمالؔ کے احترام کی سب سے بڑی وجہ ان کا بے ساختہ پن، ان کے لہجے کی برجستگی اور سب سے جدا اسلوب تھا۔ یوں تو وہ طنز و مزاح کے شاعر تھے لیکن غزل کے عمدہ اشعار کہنے پر بھی انھیں قدرت تھی۔ مشاعرے کے اسٹیج پر ان کی شخصیت کوئی بہت متاثر کن تو نہیں تھی۔ پہلی نظر میں ناظرین انھیں دوسرے یا تیسرے درجے کا شاعر سمجھتے لیکن جب کمالؔ مرحوم مائک کے روبرو ہوتے تو مشاعروں کو وہ بلندی عطا کرتے جہاں مشاعرے کا بڑے سے بڑا شاعر بھی ان کے بعد اپنا کلام پیش کرنے سے گریز کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا تھا۔

مرحوم یوسف کمالؔ کا آبائی وطن کھیروڑ نامی ایک دیہات تھا۔ یہ قریہ ضلع جلگاؤں کی تحصیل راویر میں آتا ہے۔ یوسف کمالؔ بچپن سے ہی ذہین تھے۔ ان کے والد کریم شاہ کھیروڑ کی مسجد میں امامت کے ساتھ ساتھ دینی مدرسہ بھی چلاتے تھے۔ کمالؔ صاحب کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسے میں ہوئی۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ یوسف کمالؔ بھی انہیں کی راہ چلیں اور کسی بڑے مدرسے سے فارغ ہو کر عالم و فاضل بنیں۔ مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اوائل عمری میں ہی یوسف کمالؔ گھریلو معاشی تنگی کے باعث روزگار کے سلسلے میں مالیگاؤں آبسے۔ مالیگاؤں میں پاورلوم چلانے کی مشقت کے ساتھ مشق سخن کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہیں ان کی ملاقات کہنہ مشق شاعر رزاق عادلؔ سے ہوئی۔ عادلؔ کے فکری رجحان اور شعر گوئی کے سلیقے سے یوسف کمالؔ بہت متاثر ہوئے۔ رزاق عادلؔ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

پھر یوں ہوا کسی نے بٹھایا نہ پاس میں

پیوند لگ چکے تھے ہمارے لباس میں

رزاق عادلؔ کے مشورے نے ہی یوسف کمالؔ کو سنجیدہ شاعر سے طنز و مزاح کا شاعر بنا دیا۔

غالباً یہ سن ستر کی دہائی تھی، مالیگاؤں کی صنعتِ پارچہ بافی پر غضب کی مندی چھائی ہوئی تھی۔ بیشتر پاورلوم مزدوروں پر فاقہ کشی کی نوبت آن پڑی تھی۔ مالیگاؤں چھوڑ کر جانے والے مزدوروں کی اکثریت کا رخ ممبئی اور بھیونڈی تھا جبکہ کچھ لوگ سورت کوچ کر گئے۔ مرحوم یوسف کمالؔ نے بھی ہجرت کا فیصلہ کیا اور سورت کی راہ لی لیکن اس کے بعد انھوں نے کوئی دوسری ہجرت نہیں کی اور پھر ہمیشہ کیلئے سورت ہی کے ہو کر رہ گئے۔ سورت میں یوسف کمالؔ پاورلوم سے منسلک ہو گئے۔ لوم سے دل اچٹ گیا تو سبزی ترکاری کا کاروبار شروع کر دیا اور ایک ریڑھے پر سبزیاں فروخت کرنے لگے

۔ساتھ ہی ساتھ سورت اور اطراف کی نشستوں اور مشاعروں میں شرکت فرمانے لگے۔ یہاں ان کی شاعری کا ڈنکا بجا اور خوب بجا۔ یہیں سے ان کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ انھیں پورے ہندوستان میں اپنے طنز و مزاح کے جوہر دکھانے ہیں۔

یوں لگا یا ہم نے کس اب کے برس
ہو گئے وہ ڈھلے ڈھس اب کے برس
چار چھ غزلیں اُبس اب کے برس
شاعروں کی صف میں ٹھس اب کے برس

کمالؔ صاحب کہیں بن بلائے مشاعروں میں ٹھسنے کی کوشش کرتے تو کہیں کچھ منتظمین انھیں مشاعروں میں بصد شوق ٹھونسنا چاہتے تو دل مسوس کر رہ جاتے کیونکہ یوسف کمالؔ سے رابطہ کرنا بھی کارِ دارد تھا۔ ان کی طبیعت میں صحرا نوردی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ منتظمین کو بعد میں پتہ چلتا کہ وہ تو فلاں شہر کے مشاعرے میں شریک تھے اور اب وہاں سے کہیں اور کسی اور مشاعرے میں شرکت کی غرض سے چلے گئے ہیں۔ زندگی بھر کمالؔ صاحب کو اپنی مارکیٹنگ جم نہیں سکی۔ مشاہرے سے بے نیاز رہتے۔ منتظمین مشاعرہ جو کچھ بھی دیتے خاموشی سے قبول کر لیتے۔

سورت میں گھر کی ذمہ داریاں اب ان کی شریک حیات عینو ربی نے اس امید پر نبھانی شروع کی کہ کمالؔ صاحب کو مشاعروں سے خوب آمدنی ہوگی اور ان کے دن پھر جائیں گے۔ کمالؔ صاحب کا خاندان پانچ بیٹیوں اور تین بیٹوں پر مشتمل تھا۔ بیٹوں کے سروں پر سہرہ تو جیسے تیسے باندھا گیا لیکن بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے انھیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے وہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ ویسے یہ بھی ان کی زندگی کا ایک المیہ ہی ہے کہ ایک بیٹا مظفر شاہ عین عالم شباب میں داغِ مفارقت دے گیا۔ دوسرا بیٹا زبیر شاہ سورت میں ہی کسی بزاز کے یہاں ملازم ہے۔ جب کہ الطاف شاہ جلگاؤں میں ایک مشاق آٹو مینک کے طور پر کام کر رہا ہے۔

مشاعروں میں شرکت کے چکر میں ان کا گھرانہ مستقل پریشانیوں میں مبتلا رہا لیکن ان کی شان بے نیازی میں کوئی فرق نہ آتا۔ بقول جان ایلیاؔ

میں بھی عجیب ہوں اتنا عجیب کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

یوسف کمالؔ سے جب بھی ملاقات ہوئی وہ زندگی سے بھرپور انسان نظر آئے۔ مسلسل سفر میں

رہتے لیکن سفر کی تھکن کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ خلوص و محبت کے پیکر تھے۔ کمال صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات سن ۱۹۹۷ء میں میرے ایک دیرینہ دوست شبیر شیخ نے کروائی۔ بعد میں صابر شاہ کے گجرات آٹو میں اکثر ان سے ملاقاتیں رہیں۔ صابر شاہ انھیں شاعروں کے ناکارہ پن کے لطیفے سناتے تو وہ صابر شاہ پر برہم ہوجاتے اور کہتے کہ کیا تم مجھے آلتو فالتو شاعر سمجھتے ہو۔ اچھے اچھے منت سماجت کرتے ہیں تب بھی میں ان کے مشاعروں میں نہیں جاتا۔ کسی بڑے مشاعرے میں شرکت کرو تو سمجھ میں آجائے گا کہ یوسف کمال کیا چیز ہے۔

واقعی یوسف کمال مزاح کے مقبول ترین شاعر تھے۔ جس مشاعرے میں شرکت کرتے ان سے ان کی شاہکار نظم ''موت کا فرشتہ اور شاعر'' سننے کی فرمائش ضرور کی جاتی تھی۔ مشاعرے میں ان کا اندازِ پیشکش بھی کمال کا ہوتا۔ پورا مجمع لوٹ پوٹ ہوجاتا۔ یہاں پوری نظم تو پیش کرنا ممکن نہیں لیکن دیکھئے یوسف کمال کس خوبصورتی سے نظم کا آغاز کرتے ہیں۔ جب موت کا فرشتہ شاعر کی روح قبض کرنے کیلئے حاضر ہوتا ہے تو شاعر یوں سوال کرتا ہے۔

گھر کا دروازہ بند تم اندر — کوئی آہٹ نہ دستکیں در پر
میں اس طرح کبھی نہیں جاگا — نیم شب اور اتنا سناٹا
جلد بولو جہاں سے آئے ہو — کون ہو تم، کہاں سے آئے ہو
وعظ فرما کے جی نہ کھولانا — شکل سے لگ رہے ہو مولانا
معاف کرنا اگر فقیر ہو تم — اپنے پیشے میں بے نظیر ہو تم

اسی طرح ''ایک جاہل پیر کی نقاب کشائی'' اور ''میں جس بستی میں رہتا ہوں'' اردو کی مزاحیہ شاعری کی کامیاب ترین چند نظموں میں سے ایک کہی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں کی بھی مشاعروں میں خوب فرمائشیں ہوتیں۔ یوسف کمال کی شاعری بالخصوص ان کی نظمیں اور قطعات مزاحیہ شاعری کا نیا انوکھا منظر نامہ مرتب کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے قطعات میں جہاں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے نشتر ہیں وہیں معاشرے کے زخموں پر مرہم رکھنے کا بھی کام کرتے ہیں مثلاً۔

مجھ کو ہی کیا ہو سارے زمانے کو اچنبھا
ہو ختم یہ خونریز فسادوں کا تنتبا
بس ایک ہی تک میں اٹھے نفرت کا جنازہ
تیار کرو ایسا محبت کا گڑمبا

چاندی ہوگی نہ تیرے ہاتھ میں سونا ہوگا
ریشمی گادی ، گلیچے نہ بچھونا ہوگا
موت لے جائے گی جب تجھ کو سوئے ملک عدم
ساتھ میں ایک بھی چمچہ نہ بگونہ ہوگا

موت کی رسی سے کس دیں گے تجھے
چند مٹھی خاک بس دیں گے تجھے
یہ ترے احباب رشتے دار سارے ایک دن
قبر کے اندر کھپس دیں گے تجھے

شنید ہے کہ مرحوم یوسف کمالؔ نے اپنا آخری مشاعرہ بھساول شہر میں پڑھا تھا۔مشاعرے کے دوسرے روز وہ سورت روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن ریلوے اسٹیشن پر پہنچتے ہی ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔یوسف کمالؔ وہیں گر پڑے۔انھیں کچھ لوگ میونسپل اسپتال میں داخل کرنے کی غرض سے آٹو میں ڈال ہی رہے تھے کہ اچانک چند وقفے کیلئے انھیں ہوش آیا اور اپنی شناخت بتائی۔ان کے فرزند الطاف شاہ اور بہو شکیلہ فوراً بھساول پہنچے۔انھیں جلگاؤں شفٹ کیا گیا۔اس عالم میں بمشکل ایک رات اور ان کی سانسیں چلتی رہیں کہ ۱۶/اپریل ۲۰۰۶ء کو صبح کوئی آٹھ بجے طنز و مزاح کا یہ باکمال شاعر سب کو اپنے پیچھے روتا بلکتا چھوڑ کر سوئے ملک عدم روانہ ہو گیا۔تدفین جلگاؤں کے قبرستان میں عمل میں آئی لیکن ان کے رشتے داروں کے مطابق یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ وہ جوان کا کلام سننے کے دیوانے ہوا کرتے تھے اور وہ منتظمین مشاعرہ جو انھیں اپنے مشاعرے میں بلانا اور انھیں شریک کرنا اپنے لئے طرۂ افتخار تصور کرتے تھے،ان کے جنازے میں کوئی بھی شریک نہ ہو سکا۔

کسی شاعر نے سچ کہا ہے کہ ؎

رئیسِ شہر کو جھک جھک کے لوگ ملتے ہیں
غریبِ شہر کو لیکن سلام کون کرے

☆☆☆☆

عبدالرسول کمتر: ایک عمدہ سخنور

نام : سید ذاکر حسین صابر علی

قلمی نام : سید ذاکر حسین

کتاب : افسانوی مجموعہ ''راستے بند ہیں'' (مارچ ۲۰۱۳ء) میں شائع ہوا۔

پتا : صابر منزل، سید محلہ، ارنڈول، ضلع جلگاؤں 425109

موبائیل : 09421512831

ہمارا ملک تہذیب وتمدن اور لسانی اعتبار سے گلدستہ کی مانند ہے۔ جہاں مختلف مذاہب، تہذیبوں اور زبانوں کے باوجود ہندوستانی اتحاد واتفاق کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہندوستانیوں کو متحد رکھنے میں اردو زبان نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ منتشر علاقوں اور مختلف زبانوں کے درمیان عوام الناس کو ایکدوسرے کے قریب لانے اور سمجھنے کا سب سے پہلا کام اردو زبان نے ہی کیا ہے۔ گویا اردو ہندوستانیوں کے درمیان رابطے کی زبان کا کام انجام دیتی رہی ہے۔ آج بھی ملک کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں اردو بولی اور سمجھی نہ جاتی ہو۔

تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ خاندیش میں اردو علاؤالدین خلجی کے عہد میں پہنچی۔ 1310ء تا 1370ء تک یہ علاقہ براہ راست دلی کے زیر اثر رہا۔ کہا جاتا ہے کہ علاؤالدین خلجی اور ان کے سپہ سالار ملک کافور کا ارنڈول میں بہت عرصہ قیام رہا۔ انھوں نے ایک مسجد تعمیر کروائی تھی جہاں فوجی چھاؤنی کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ یہیں سے دیوگری قلعہ پر حملہ کے لیے وہ روانہ ہوئے تھے۔ 1370ء میں فیروز شاہ تغلق نے ایک بروقت امداد کے صلے میں یہ علاقہ ملک ناصر فاروقی کو بطور جاگیر دیا تھا۔ آٹھ دس سال بعد ناصر فاروقی نے باقاعدہ خودمختاری کا اعلان کر دیا اور خاندیش سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ خاندیش میں یہ حکومت دوسو سال سے زائد عرصہ تک جاری رہی۔ 1601ء میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے دکن فتح کیا تو یہ علاقہ بھی مغلوں کے قبضہ میں آگیا اور برسوں انھیں کے تابع رہا۔ مسلسل چارسو سال تک مسلمانوں کی نگرانی میں رہنے کی وجہ سے اس علاقہ میں اسلامی تہذیب کے ساتھ اردو زبان وادب کو بھی فروغ ملا۔ جس کے دیرینہ نقوش آج بھی خاندیش میں نمایاں ہیں۔ ان

تمام تاریخی پس منظر میں ارنڈول کو مرکزی اہمیت حاصل تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اہل علم ،فن وہنر ،علماء ادباء وشعراء کی آمد ہوئی ۔ جن میں ایک بہت ہی نیک وصالح بزرگ حضرت خواجہ خرم قتالؒ (جو حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے) نے مذہب اسلام کے فروغ واشاعت کے لیے ارنڈول کو منتخب کیا اور یہاں اسلام کی شمع روشن کی جو کہ خاندیش میں اسلام کے پہلے داعی کہلاتے ہیں ۔ان سے فیض عارفانہ حاصل کرنے اطراف واکناف سے مریدین ارنڈول کا رخ اختیار کرنے لگے ۔

احمد آباد (گجرات) کی روحانی ہستی حضرت سید شاہ وجیہہ الدینؒ نے اپنے پوتے حضرت سید شریف اللہ صاحب کو ارنڈول روانہ کیا ۔جنہیں حضرت خواجہ خرم قتالؒ کے وصال کے بعد ان کا پیغام عوام تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی ۔ یہ فرض انھوں نے بخوبی نبھایا بلکہ انکے بعد بھی اس خاندان کے ہر فرد نے اسے اپنا فرض سمجھا ۔اسی نسب سے سید فخر الدین عرف بارشاہ میاں (1799ء تا 1876ء) نے جانباز ارنڈولوی اس نام سے شعری روایت کا آغاز کیا ۔حضرت کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کیلئے انھوں نے شاعری کو وسیلہ بنایا ۔درگاہ حضرت خواجہ خرم قتالؒ کا وسیع وعریض میدان روحانیت کا مرکز بن گیا جہاں قرآن خوانی ،خطبات ،نعت گوئی کی محفلیں سجنے لگی ۔اس وقت سے یہاں شعر وسخن کا ماحول پروان چڑھنے لگا ۔

جانبازؔ ارنڈولی نے ایک بزرگ ہستی حضرت حیات شاہ ولیؒ (ارنڈول) کے تعلق سے لکھی انکی منقبت تو اتنی مقبول ہوئی کی گلی کوچوں میں کیا بڑے کیا بچے سبھی کی زبان پر ترنم ریز تھی ۔

تعریف اس مکان کی تو بے شمار ہے — سایہ تو اس مکاں پر پروردگار ہے
ہر ایک کے دل کو دیکھنے کا انتظار ہے — میری زباں پر یہ سخن بار بار ہے

جا دیکھ ارنڈول میں کیا گل عذار ہے
سائیں حیات شاہ کا مکاں پر بہار ہے

جانبازؔ ارنڈولی کے چھوٹے بھائی سید مرتضیٰ عرف قاضی بچو میاں صاحب (1803-1889) عالم دین ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے ۔لاہور سے شائع 'لغات سروری' اس کتاب میں حوالہ کے طور پر انکے قطعات شامل کئے گئے تھے ۔وہ کاتب قرآن بھی تھے ۔اپنے ہاتھوں سے قرآن مجید لکھا کرتے تھے اور انھوں نے قرآن کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا ۔انکے درسی قرآن سے دعائے ختم القرآن کا منظوم ترجمہ سے چند اشعار پیش خدمت ہے ۔

بہ تحقیق جانو یہ رب کا کلام — سبھی سانچہ ہے گا بہ قرآں تمام
بزرگی اسی کو سزاوار ہے — کہ اس سانچہ اوپر سدا پیار ہے

محمدؐ نبی خاتم الانبیاء انھوں نے سندیسہ بھی سانچہ دیا
ہمیں بھی جو کچھ رب ہمارا کہا کہ اوپا لنہار سہارا سدا

اسی روایت کو آگے بڑھانے کے لئے قاضی بچو میاں صاحب کے فرزند عبد الرسول کمترؔ (1846-1919) نے قدم بڑھایا۔ بچپن سے ہی انھیں شعروادب میں دلچسپی تھی۔ یہ اردو کی ترقی کا ارتقائی دور تھا۔ جسمیں انھوں نے اہم کردار نبھایا۔ اردو پڑھانے کے لئے انھوں نے اردو مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور خود نئی نسل کو اردو سے روشناس کرایا۔ ارنڈول کا یہ پہلا اردو اسکول تھا جسے حکومت کی جانب سے تسلیم کیا گیا۔ دن بہ دن طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اردو سے رغبت پیدا کرنے کے لئے انھوں نے بے حد محنت کی ،ان کا لگایا پودا آج تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ انھیں شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ 1878ء میں انھوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر لایا۔ انکے گھر ہی کتابت کا کام ہوتا تھا لہٰذا مجموعہ کی بہت سی کاپیاں تیار کی گئی۔ آج 2015ء میں بھی ہم اس شعری مجموعہ کو با آسانی پڑھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے یہ خاندیش کا اولین شعری مجموعہ ہو۔

عبد الرسول کمترؔ استاد شاعر تھے۔ ضلع میں بہت سے شاگر دان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جسمیں مقبول علی اخترؔ، عبد اللہ احمد ثاقیؔ وغیرہ قابل ذکر نام ہیں۔ جانباز ارنڈولوی، عبد الرسول کمترؔ، ان حضرات نے ارنڈول میں جو ادبی روایات قائم کی ان روایات کو قائم ودائم رکھنے کے لئے بہت سے نوجوانوں نے پیش قدمی کی۔ محرم میں شہدائے کربلا کی یاد میں جگہ جگہ مجلس مسالمہ منعقد کی جاتی۔ جسمیں ارنڈول کے علاوہ اطراف سے بھی شعراء شرکت کرنے لگے۔ ہر جمعہ کی رات درگاہ کے میدان اور ہر اتوار کی شب سید محلہ کی مسجد ہاشمیہ کے احاطہ میں شعری محفلیں سجنے لگیں۔ جس کا اہتمام عبد الرسول کمترؔ کے بھتیجے قاضی منظر علی صاحب کیا کرتے تھے۔

نمونۂ کلام

تو ہے مالک میرا اور تو ہی ہے مختار یا اللہ
رکھ ہردم اور ہمیشہ سب کے اوپر پیار یا اللہ

سدا دنیا کی آفت سے بچانا اور نگاہ رکھنا
دے عزت ہر جگہ مجھ کو، نہ کرنا خوار یا اللہ

قیامت جس گھڑی ہووے شفیع واں مصطفیٰ کو کر
کہ وہ شافع محشر اور ہیں سردار یا اللہ

نہ تلخی مرگ میں آوے نہ سختی قبر میں پاوے
منور اور روشن گور ہو گلزار یا اللہ

غرض کمترؔ کو دوزخ سے بچا کر خلد میں داخل
تو کرنا اور ہو اس کو تیرا دیدار یا اللہ

(آمد: ۱۸۴۶ء رخصت: ۱۹۱۹ء)

اردو نثر و شاعری کا عالی مرتبت نام
قاضی مشاہد علی (عرف فیروز ہاشمی)

سید ذاکر حسین

مشرقی خاندیش کی اُردو نثر نگاری میں جہاں نادر المثال نام ملتے ہیں وہیں قاضی مشاہد علی عرف فیروز ہاشمی کا نام بڑے احترام اور عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ خاندیش کی نثر ان کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔ بے شمار افسانے، ناول اور مجموعے ان کی حیات ہی میں شائع ہو چکے تھے۔ مرحوم عبد الرسول کمترؔ کے بھتیجے قاضی منظر علی صاحب بڑے ادب نواز تھے۔ معاشرہ میں اعلیٰ مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ مسلسل تیس سال میونسپل کونسلر کے عہدہ پر منتخب ہوتے رہے۔ صدر بلدیہ و نائب صدر کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ قاضی منظر علی کے صاحبزادے قاضی میر چاہت علی اور قاضی مشاہد علی نے بھی اردو ادب میں کافی دلچسپی لی۔ قاضی مشاہد علی نے فیروز ہاشمی تخلص اختیار کیا اور شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھا۔ ان کا سفر منزل در منزل ترقی کرتا رہا۔ انھوں نے کبھی پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ انکے ہمراہ ارنڈول کے کافی احباب ادب کے میدان میں آئے۔ جن میں عزت علی قمرؔ، اخترؔ، تراب علی نثارؔ، منصف علی منصفؔ، محبت علی شاگر، حشمت علی اطہرؔ وغیرہ شامل ہوئے۔

فیروز ہاشمیؔ (1915-1986) نے اس وقت ایم اے کی ڈگری حاصل کی جو اس زمانہ کا بہت بڑا اعزاز تھا۔ محکمہ عدلیہ میں انھیں ملازمت مل گئی اور نندور بار کورٹ میں بطور ناظر ذمہ داری سنبھالی مگر یہ کام انکے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ انکے ذہن میں ادب، شعر و سخن کی دھن سوار تھی۔ انکے افسانے دلّی سے شائع ہونے والے رسالہ 'آواز نسواں' میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ اسلئے انھیں خاندیس کے اولین افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آواز نسواں کے ایڈیٹر راجہ احمد غلام صاحب سے انکے خط و کتابت جاری تھے۔ انھوں نے خط میں ایڈیٹر صاحب سے اس بات کا ذکر کیا کہ اس وقت نندور بار کورٹ میں ملازمت کر رہا ہوں مگر دل بالکل نہیں لگتا۔ اس پر راجہ احمد غلام نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اچھے قلمکار ہے۔ ملازمت سے استعفیٰ دے کر

لی چلے آوَ۔اگلی ذمہ داری انکی رہے گی۔انھیں یہ بات پسند آئی انھوں نے کسی کو بتائے بنا
ملازمت سے استعفٰی دیا اور راجہ احمد غلام کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔وہ بہت خوش ہوگئے اور
رسالہ 'آوازنسواں' کے سب ایڈیٹر کا قلمدان انکے سپرد کردیا۔

جب اہل خانہ کو یہ خبر ملی تو سب ان پر غصہ ہونے لگے۔دہلی میں انھوں نے مزید کوششیں
کیں اور گورنمنٹ آف انڈیا کی شاخ سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن دہلی میں ملازمت حاصل
کرنے میں کامیاب ہوئے۔یہ خبر سن کر گھر والوں نے اطمینان کی سانس لی۔اس ادارہ میں ان
کے آفیسر مشہور شاعر حفیظ جالندھری صاحب تھے۔اس ادارہ کے تحت ادب کی خدمت کی جاتی
تھی۔اردو، ہندی، پنجابی اور ہریانوی ان زبانوں میں گیت ریکارڈ کئے جاتے تھے۔حکومت
کی جانب سے ادب کے فروغ کے لئے یہاں کام ہوتا تھا جو کہ ان کے مزاج کے عین مطابق تھا
۔اس ادارہ کے ڈائریکٹر تھے موسیقار ماسٹر لچھی رام، ماسٹر دھن رام جبکہ فنکاروں میں ملکہ
پکھراج زینت، منور سلطانہ، شمشاد بیگم، زہرہ جاں، خالد کاشمیری، مظہر الحق من باسی، سعادت
حسن منٹو۔اس ادارہ کے رابطہ میں ہونے سے فیروز ہاشمی کے ان تمام سے اچھے مراسم ہوگئے
۔یہاں کام کرتے ہوئے ان کا حوصلہ بلند ہوا۔دلی، لاہور، لکھنؤ، حیدرآباد سے شائع ہونے
والے رسائل میں ان کے افسانے، غزلیں، شائع ہونے لگے۔آوازنسواں کے ساتھ رسالہ
'صنعت' میں بھی نائب مدیر کی حیثیت سے وہ کام کرنے لگے۔خاتون مشرق، جمالستان
، بیسویں صدی، مسافر، ادب لطیف ان رسائل سے بھی ان کے تعلقات قائم ہوئے۔

سانگ آرگنائزیشن میں حفیظ جالندھری کے ساتھ کام کرتے ہوئے ان سے بہت ہی قریبی مراسم
ہوگئے۔حفیظ صاحب نے اپنے مکان کی بغل میں انھیں مکان دیا جہاں فیمیلی سمیت وہ منتقل ہوگئے۔حفیظ
صاحب کے ہمراہ بہت سے شاعروں میں بھی ان کی موجودگی اور ان کے کلام سامعین کی توجہ کا مرکز بنے۔

ارنڈول کے بہت سے شعراء کو انھوں نے دلی مدعو کیا۔وہاں کے مشاعروں میں ان کی شرکت
کرائی۔حشمت علی اطہر ارنڈولی نے بہت سے مشاعروں میں کلام پیش کئے اور دادو تحسین حاصل کی
۔ان کا شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ناجانے برق کو کیوں ضد ہے میرے چار تنکوں سے
کہ جب چمکی قریب آشیاں معلوم ہوتی ہے

اور فرماتے ہیں ؎

جلنا بجھنا اگر میرے مقدر میں نہیں

آگ دوزخ میں نہیں ، پانی سمندر میں نہیں

سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے تحت فیروز ہاشمی کی غزلوں کا البم گرامون ریکارڈ پر نشر کیا گیا۔غزلوں کو ملکہ پکھراج اور زہرہ جاں کی سریلی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔

خاندیش میں کتابت وطباعت کی سہولتیں مہیا نہ تھی۔اس کمی کو انھوں نے شدت سے محسوس کیا اور نومبر ۱۹۳۴ء میں سہ ماہی رسالہ 'کہکشاں' کا اجراء کیا۔جس کے مدیر وہ خود تھے اور فخر خاندیس جناب غلام مصطفی خاں عرف رستم خاں اطہر جلگانوی کی سرپرستی حاصل تھی۔کہکشاں کا دفتر متصل جامع مسجد جلگاؤں (مشرقی خاندیش) تھا جبکہ رسالہ رفاہ عام پریس، ہنگ کی منڈی آگرہ میں چھپ کر جلگاؤں سے شائع ہوا کرتا تھا۔اس رسالے میں خاندیش کے قلمکاروں کی تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔اس وقت میرے سامنے نومبر ۱۹۳۴ء اور جنوری ۱۹۳۵ء (عید نمبر) رسالے موجود ہیں۔جن حضرات کی تخلیقات اس میں شامل ہیں ان کے اسمائے گرامی اسطرح۔مولانا سید منظور بخاری، قاضی میر چاہت علی، طالب ارنڈولی، نشتر جلگانوی، غلام مصطفی خاں اطہر جلگانوی، عبدالقادر قادر، مولانا عبداللہ احمد ثانی محمد تراب علی مضطر جلگانوی، بسم اللہ خاں منیر جلگانوی، قادر ڈرائیور جلگانوی، سکندر صاحب نوری انوری، ایم آر درویشی جلگانوی، غازی عبدالرحیم، فرحت نصیر آبادی، قمرالدین (سیشن کورٹ جلگاؤں)، شاکر جلگانوی، عزیز بھساولی وغیرہ شامل ہیں۔جنوری ۱۹۳۵ء کے شمارہ میں اداریہ میں 'اردو کے نادان دوست' اس عنوان سے لکھا مضمون آج بھی اردوداں کے لئے دعوت عمل ہے۔

رسالہ کہکشاں نے کم عرصہ میں ادب کی دنیا میں اپنا مقام بنایا۔قاضی مشاہد علی، فیروز ہاشمی کا نام ادبی حلقوں میں ادب واحترام سے لیا جائے گا۔دہلی میں رہتے ہوئے انھوں نے اپنے وطن کو کبھی فراموش نہیں کیا۔انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ خاندیس کا نام دنیا بھر میں روشن کیا۔ارنڈولی نیائے (آپسی مصالحت) کا بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں ذکر کیا ہے۔دسمبر ۱۹۳۷ء کے 'آواز نسواں' اس رسالہ میں ان کا افسانہ 'خالہ جان نے مخبری کی' کافی پسند کیا گیا۔اس افسانہ میں انھوں نے ارنڈول تعلقہ کی فرخندہ مسجد کی سیر کرائی جس کا ایک مینار ہلانے سے دوسرا خود بخود ہلتا ہے۔انھوں نے ایک افسانے میں یاول کے پرانے قلعہ کی سیر کرائی اور عیدگاہ کے عقب میں آموں کے درختوں کے باغ 'امرائی' کا ذکر کیا ہے۔جہاں چوکیدار سے آنکھ بچا کر وہ آم توڑا کرتے تھے۔۔ان کے بچپن کا

طویل عرصہ یاول میں گزرا تھا۔ان کی بہت سی یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں۔

ان کے بھائی قاضی میر جاہت علی کا افسانہ 'الٹی زکوٰۃ' (خاتون مشرق خاص نمبر ۱۹۳۸ء) شائع ہوا تھا جو طنز و مزاح کی اچھی مثال ہے۔ان کی بہنیں بھی افسانے لکھا کرتی تھیں۔اعجاز بیگم صاحبہ کا افسانہ 'برقی چوڑیاں' (خاتون مشرق خاص نمبر ۱۹۳۸ء) پڑھ کر عورتیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔دوسری بہن ممتاز بانو کا افسانہ 'شیروانی کی آپ بیتی' (خاتون مشرق مئی ۱۹۴۸ء) بھی کافی مشہور ہوا۔

۱۹۴۴ء میں دہلی کے ادبی حلقوں میں حسن و عشق کی برتری کے لئے بحث چھڑ گئی۔اس موضوع کو لے کر مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔شعراء حضرات نے عشق کی طرفداری کی جبکہ شاعرات نے حسن کے بغیر دنیا کو بے رونق قرار دیا۔اس وقت فیروز ہاشمی کی غزل نے خوب داد و تحسین حاصل کی جس میں انھوں نے حسن و عشق کے رشتہ کی اسطرح وضاحت کی ۔

کون ہوتا حسن کا پرسان حال　　　عشق دنیا میں اگر ہوتا نہیں

اس غزل کا آخری شعر اسطرح ہے۔

چھوڑ جاتے ہیں عزیز و آشنا　　　پاس جب فیروز زر ہوتا نہیں

خاتون مشرق (۱۹۳۸ء) میں شائع ایک غزل

فیروز الکلام

وہ امنگیں نہیں وہ ارماں نہیں وہ جوش نہیں
کیوں نفس آج میرا حشر در آغوش نہیں
گردش دور میں کیوں مجھ پر بلاؤں کا نزول
میں جہاں نوش ہوں قسمت سے بلا نوش نہیں
ہوش اتنا ہے کہ بے پردہ ہوا تھا کوئی
آگے پھر طالب دیدار کو کچھ ہوش نہیں
منزل حسن میں کیا ذکر میرا اے فیروز
یہ وہ دنیا ہے کہ دنیا میں یہاں ہوش نہیں

یہ ارنڈول ضلع جلگاؤں کی ادبی تاریخ کا مختصر جائزہ ہے۔ان صاحبان کے بعد بہت سے صاحب قلم حضرات آئے اور اردو ادب کی آبیاری کرتے رہے۔یہ سلسلہ جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا

(آمد: ۱۹۱۵ء　　　رخصت: ۱۹۸۶ء)

اپنے غم میں غمِ کائنات کو مدغم کرنے والا وسیع القلب فنکار: حامد جلگانوی

نام	:	انصاری عبدالوحید امام
قلمی نام	:	وحید امام
تعلیم	:	ایم اے، نیٹ (اردو) بی ایڈ
تاریخ پیدائش	:	۲ر فروری ۱۹۶۳ء
مطبوعات	:	معصوم احتجاج (ادب اطفال ۱۹۹۳)، لخت لخت زندگی (افسانے ۲۰۱۳)، درس اردو (درس وتدریس ۲۰۱۵)
رہائش	:	۷۰ ۳ر شنی پیٹھ (کاٹیا فیل) جلگاؤں
موبائل	:	9403478810

'خاندیس میں اردو شاعری' کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کیا جائے تو بحث کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ کچھ لوگ سعدی دکنی کو خاندیس کا پہلا شاعر ہونے کے اعزاز سے نوازتے ہیں تو کچھ لوگ گجرات سے تشریف فرما صوفی شیخ بہاؤالدین شاہ باجن کو خاندیس کا شاعر اوّل قرار دیتے ہیں ۔ بہاؤالدین شاہ باجن کی تصنیف 'خزائن رحمت' بلاشبہ انھیں خاندیس کا پہلا شاعر ہونے کا اعزاز عطا کرتی ہے ۔ خطۂ خاندیس نربدا کے پار اور تاپتی کے دامن میں بسا علاقۂ دکن ہی کا حصہ ہے اسی مناسبت سے یہ علاقہ بھی دکنی کہلایا۔ ماہرین کے مطابق برہان پور کی ادبی تاریخ خاندیس کے تذکرے کے بغیر ادھوری یا نامکمل قرار دی جائے گی ۔ اسی تناظر میں خاندیس کی ادبی تاریخ برہان پور کی ادبی تاریخ کے ذکر کے بغیر تاریخ کے تقاضوں سے انحراف ہوگا۔ ایک مدت گزرنے کے بعد خاندیس کے حدودِ اربعہ میں خاطر خواہ تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ برہان پور کی علیحدگی کے بعد مذکورہ علاقہ دو اضلاع یعنی ضلع جلگاؤں اور ضلع دھولیہ میں تقسیم ہوا۔ مگر آج بھی ان اضلاع کی شناخت مشرقی خاندیس اور

مغربی خاندیس کے طور پر ہوتی ہے۔ بہر حال اس علاقہ کی اپنی ایک ادبی شان وشناخت رہی ہے ۔محققین کے مطابق جلگاؤں کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز مرحوم مصطفی خاں اطہر جلگانوی سے شروع ہوتا ہے۔آپ چھ شعری تصانیف کے خالق ہیں مگر ان کا سارا شعری سرمایہ گردشِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔ باوجود اس کے 'ریاضِ نورس' اور 'غمِ محرم' کے نام سے ان کے دو مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہوئے ۔ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں خوشتر جلگانوی ،شاکر جلگانوی ،سکندر نوری انوری، نشتر جلگانوی، کلیم بیاولی ،علامہ عبدالرحمن خان برتر جلگانوی، منشی شیخ چاند خلفِ محمد حیات کمتر، محمد عبدالشکور اخضر اور منشی غلام محی الدین خاں اختر کے اسمائے گرامی شامل ہیں ۔پھر علاقائی ادبی تاریخ میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جلگاؤں کے ادبی آسمان پر مرحوم سلطان نقشبندی اور مرحوم غلام محمد ناظر انصاری ماہ واختر کی مانند روشن ہوئے۔

حضرت سلطان نقشبندی کے سلسلۂ خاندان سے وابستہ کہنہ مشق و بزرگ شاعر جناب حامد جلگانوی بھی اہل خاندیس وخصوصاً شہر جلگاؤں کے لیے تعارف کے محتاج نہیں ۔حامد جلگانوی مرحوم کی زندگی کا سفر ۱۹۰۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۹۴ء پر اختتام پذیر ہوا۔ابتدائی تعلیم شرور (دھولیہ) کے علاوہ مالیگاؤں میں حاصل کی ۔عملی زندگی کا آغاز تجارت سے کیا اور آخری عمر تک اس پیشہ سے وابستہ رہ کر اپنے اہل خانہ کی کفالت کی ۔ ۱۹۳۰ء سے باقاعدہ طور پر شاعری کا آغاز کیا۔موصوف کو شعر وسخن کا شوق وراثت میں ملا۔حضرت سلطان نقشبندی رشتے میں ان کے چاچا تھے اور انہوں نے اپنی وراثت کی اسی میراث کو آگے بڑھایا۔نوجوانی کے آغاز سے ہی ان کی طبیعت شاعری کی طرف راغب ہوئی ۔آغازِ کلام پر اصلاح حضرت شاہ محمد حسن جالب نقشبندی سے لی پھر انہی کے مشورے پر حضرت محوی صدیقی سے میدان شعر وادب میں رہنمائی حاصل فرمائی ۔شاعری کی تمام اصناف سخن میں انھیں دلچسپی تھی اور انہوں نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی مگر موصوف کو غزل کی کشش نے اپنے دائرے میں قید رکھا ۔اس کے علاوہ حمد ،نعت ،منقبت اور قطعات گوئی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ہندوستان کی حالتِ زار نے ہر حساس دل فنکار کو متاثر کیا، پھر یہ کیسے ممکن نہ ہوتا کہ موصوف ملک کی غلامی پر نہ کُڑھتے ۔ ۱۹ ویں صدی کی چوتھی دہائی میں ملک کے طول وعرض میں ایک انقلاب کی آمد کی گونج تھی اور اس گونج کی بازگشت ملک کے مختلف خطوں میں محسوس ہو رہی تھی ۔حامد جلگانوی بھی اس سے بے خبر نہیں تھے ۔انہوں نے

اس انقلاب کی آمد سے متاثر ہو کر بہت ساری نظمیں لکھیں ۔ ان نظموں کے متعلق جان کر ان کے جذبہ حُب الوطنی کا پتہ چلتا ہے ۔ حالانکہ نظمیں دستیاب نہ ہو سکیں مگر ان نظموں کی گونج جلگاؤں میں ہر جگہ سنائی دی ۔

حامدؔ جلگانوی اسی زمانے میں مسلم لیگ کے زیر سایہ جاری جدوجہد آزادی کے لیے متحرک تھے ۔ ملک کی آزادی کی لڑائی میں ایک سپاہی کی طرح عملی اقدامات انجام دینے کے علاوہ انہوں نے اپنے قلم کی جولانیاں بھی بکھیریں ۔ وہ مشاعروں میں شرکت ضرور کرتے تھے مگر کبھی اس کو حصول شہرت کا ذریعہ نہیں بننے دیا ۔ ہاں مگر معیاری ادبی رسائل میں چھپنے کی متواتر کوششیں اس بات کی غماز ہیں کہ وہ شعرو شاعری کو وقت گزاری کا ذریعہ تصور نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح اور فلاح و بہبود کو اپنا نصب العین بنا چکے تھے ۔ غلامی کی آہنی زنجیروں نے ملک کو جکڑ رکھا تھا ۔ ہر حساس دل شاعر نشاط آفرین سحر کے خوابوں میں کھویا ہوا تھا ۔ انہی جذبات کا عکاس ان کا یہ شعر نظر آتا ہے ؎

ترس رہا ہوں میں نشاط آفرین سحر کے لیے
نہ جانے کتنی طوالت لیے شبِ غم ہے

غلامی کی طویل شبِ غم کو آزادی کی نشاط آفرین سحر میں بدلنے کے خواہش مند حامدؔ صاحب جلگانوی ملک میں حقیقی بہار کے منتظر تھے ۔ ایسی گھٹن بھری فضا میں بہار کے موسم میں بھی تسکین قلب عیش و مسرت ، سرور کیفیت کو ترس رہے تھے ۔ ان حقائق کی روشنی میں ان کے جذبات کی عکاسی کرنے والا یہ شعر بھی توجہ طلب ہے ؎

تسکینِ قلب ، عیش و مسرت ، سرور و کیف
حاصل نہیں تو آگ لگا دو بہار میں

حامدؔ جلگانوی علامہ اقبالؔ کی شاعری سے بے حد متاثر تھے ان کے اشعار کا مطالعہ بھی حرکت و عمل کی ترغیب دیتا ہے ۔ ان کے کلام پر علامہ اقبالؔ کی شاعری کے اثرات نمایاں ہیں ۔ مصیبتوں اور غموں سے ان کی شناسائی کافی پرانی ہے ۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ حالات سے زیر نہیں بلکہ حالات کو زیر کرنے کے فن میں طاق تھے ۔ ان کے عزائم کی عکاسی اس شعر سے ہوتی ہے ؎

زمانہ بھر کے مصائب کا، شوق سے ہم نے
رہ طلب میں کیا بڑھ کے خیر مقدم ہے

ان کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ مصائب و آلام سے نہیں گھبراتے بلکہ خندہ پیشانی سے ان کا استقبال

کرتے تھے اور یہی ان کی حیات کا ماحصل تھا۔ وہ اپنی کمیوں اور لغزشوں کا بھی درک رکھتے تھے ان خیالات کا آئینہ دار ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

لغزشوں پر نہ حامدؔ کی جائے کوئی
آخرش وہ بھی تو ایک انسان ہے

مجروحؔ سلطانپوری ایک شعر میں یوں فرماتے ہیں ؎

جب ہوا عرفان توغم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

اردو کی قدیم روایتوں کے مطابق محبوب کا غم ہر غم سے سوا ہوتا ہے۔ مجنوں کے لیے لیلیٰ کے غم کے سوا کسی اور غم کی کوئی حقیقت نہیں تھی لیکن ترقی پسند شعراء نے محبوب کے غم کو زمانے کے غم پر ترجیح دی ۔اس شعر میں بھی مجروحؔ سلطانپوری نے اسی خیال کو پیش کرنے کی کوشش کی کہ جب ان کو غم کی حقیقت معلوم ہوئی تو غم ان کے لیے راحت جاں بن گیا۔ اصل زندگی میں دکھ درد اور غم کا مقابلہ کرنا ہی زندگی کی معراج ہے اور غم کے اس راز کو شاعر نے جب پالیا تو اسے محبوب کا غم ہلکا معلوم ہوا۔ جب اس نے دنیا کے دکھ درد کا اندازہ لگایا تو اس کا غم غم دیگراں میں تبدیل ہو گیا۔ اسی خیال کو اصغر گونڈوی نے بھی اپنے انداز میں پیش کیا ؎

آلام ِ روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ہوا اسے غم ِ جاناں بنا دیا

تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ انہوں نے غم دیگراں کو آلام روزگار بنا دیا اور اپنے غم کو غم جاناں میں تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے آلامِ روزگار کے زخم مندمل ہو گئے اور انھیں تسکین حاصل ہو گئی ۔اسی خیال کو حامدؔ جاگانوی نے بھی اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ؎

غمِ حیات ،غمِ دل ،غمِ صنم ہی نہیں ہمارے غم میں غمِ کائنات مدغم ہے

ناموافق حالات کا رونا رونے والوں کو حامدؔ جاگانوی کا یہ پیغام ہے ؎

جو غم و رنج میں مسکراتے نہیں زندگی کی وہ معراج پاتے نہیں
آندھیاں سر سے گزریں کے طوفان اٹھیں ہیں جو ثابت قدم ڈگمگاتے نہیں

حامدؔ جاگانوی نے ہر حال میں زندگی کا استقبال والہانہ انداز میں کیا پھر وہ غم حیات ہو یا وفا کی راہیں۔ زندگی نے ان کے سامنے جو پیش کیا انہوں نے اسے گلے لگالیا۔ ان کے خیالات کی وضاحت اس شعر سے ہوتی ہے ؎

حامدؔ وفا کی راہ میں جس سمت بھی چلے　　　جو کچھ بھی پیش آیا گلے سے لیا لگا

حامدؔ صاحب جلگانوی کے کچھ نمائندہ اشعار پیش خدمت ہیں ۔

تلاشِ امن وسکوں کس طرح کرے کوئی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا عجیب عالم ہے

زندگی ان کی ہے ننگِ انسانیت
جو کسی کے کبھی کام آتے نہیں

بزم عالم میں کچھ کام کرجایئے
ورنہ باتیں بنانا تو آسان ہے

خود ستائی میرا شیوہ ہے کہاں حامدؔ
طبع خاموش ہوں کہرام سے گھبراتا ہوں

حامدؔ منائیں جشن بہاراں تو کس طرح
کچھ سوجھتا نہیں ہے غمِ روزگار میں

زبان وادب کے میدان میں علاقہ خاندیس کی ادبی تاریخ کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں ۔شہر جلگاؤں کی اپنی ایک نمایاں شناخت ہر دور میں رہی ہے لیکن اس علاقے کی ادبی تاریخ ہنوز تحقیق طلب ہے ۔اگر ایمانداری سے تلاش وتحقیق کا کام انجام دیا گیا تو امید ہے کہ حامدؔ جلگانوی جیسے کئی گوہر نایاب سے ہماری آنکھیں خیرہ ہوسکتی ہیں ۔یہاں اس خیال سے اتفاق کرنا اشد ضروری ہوجاتا ہے کہ خود علاقے کے افراد اپنے ادیبوں اور شاعروں کے فن پر خامہ فرسائی نہیں کرتے ان کو اس قابل تصور نہیں کرتے کہ ان پر کچھ تحریر کیا جائے جس کی وجہ سے نسلِ نو ان کی ادبی کی خدمات سے واقف نہیں ہونے پاتی اور یہ گوہر نایاب وقت کی گرد میں دب کر اپنی فطری وحقیقی چمک کھودیتے ہیں ۔اہلِ قلم کا یہ فرض اوّلین ہے کہ وہ اپنے علاقے کی ادبی تاریخ کو مرتب کرنے میں نمایاں کردار ادا کریں ۔قابل مبارکباد ہیں وہ لوگ جو اپنے علاقے کے فنکاروں کی ادبی خدمات کا جائزہ کتابی صورت میں پیش کررہے ہیں اور تاریخ کے گمشدہ اوراق کی تدوین وتالیف میں دلچسپی لے رہے ہیں ۔اللہ ان کے حوصلوں کو بلندی عطا کرے (آمین) ۔میں نے اپنے مقدور بھر اپنے سابقون الاولین میں نمایاں حامدؔ جلگانوی کی ادبی خدمات کا حق ادا کرنے کی سعی کی ہے ۔میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوں یہ اہلِ نظر ہی بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں ۔

☆☆☆☆

حسین پائلٹ: شریف شخص اکیلا دکھائی دیتا ہے

مضمون نگار : ظہیرالدین ظہیر

پیدائش : ۹رجون ۱۹۵۳ء

تعلیم : بی ایس سی بی ایڈ

پیشہ : سبکدوش صدر مدرس

پتا : نشیمن کالونی، مہرون، جلگاؤں 9421637804

خدا نے اس سرزمین پر بے شمار ذی روح پیدا کیے۔ ان میں انسان کو ''اشرف المخلوقات'' بنا کر پیدا کیا۔ انسان روز ازل سے اس دنیا میں برسر پیکار ہے۔ اس کی زندگی بے شمار نشیب و فراز، غم و آلام، دکھ اور سکھ سے عبارت ہے۔ اسے زندگی کے دکھ بھرے لمحات سے نجات پانے کے لیے ''مزاح'' کی اشد ضرورت ہے۔ بقول شاعر ؎

ہنسو کہ آج ہنسی کی بہت ضرورت ہے
مگر کسی کے لبوں سے نہ چھین کر لاؤ

کہتے ہیں کہ جب زندگی اپنی بے پناہ مصروفیتوں، بے کیفی، ناہمواری اور تھکن کی زد میں آ کر بوجھ بن جائے تو مزاح روشنی کی کرن بن کر ہمارے گرد چھائی ہوئی تاریکیوں کو منور کر کے ہمیں کشمکش حیات سے حوصلہ مندی و تازہ دمی کے ساتھ نمٹنے کے اہل بناتا ہے۔

ہنسو آج اتنا کہ اس شور میں
صدا سسکیوں کی سنائی نہ دے

اسٹیفن لیکاک کہتا ہے ''طنز و مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے۔ وہ مزید رقم طراز ہے کہ ''دنیا میں آنسوؤں کی فراوانی ہے لیکن یہ کتنی خوفناک

جگہ ہوتی ہے اگر یہاں آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہ ہوتا''۔ غنیمت ہے کہ نا آسودہ حسرتوں، غم و آلام، دکھ درد، یاس و حسرت کے اندھیروں کے بیچ حس مزاح کا ٹمٹا تا دیا بھی ہے۔ جو یاس کو ہچکیوں میں تبدیل ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔

مزاحیہ کلمات چاہے وہ کسی شکل میں ہوں، سن کر انسان بے ساختہ ہنس پڑتا ہے اور اس طرح کچھ لمحات کے لئے ہی سہی وہ اپنے رنج و غم کو بھول جاتا ہے۔ ہنسنے کے بہت سے طبی فوائد بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زیادہ زور سے ہنسنے اور قہقہے لگانے سے دل مردہ بھی ہو جاتا ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے ۔مزاح چاہے نثر میں ہو یا نظم میں اگر زیر لب تبسم بھی پیدا کر دے تو دل و دماغ میں فرحت و انبساط کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔

شاعری میں ہجو نگاری کے بے شمار نمونے ملتے ہیں جیسے سودا کا 'تضحیک روز گار، انشا کا مزاحیہ کلام ،اکبرالٰہ آبادی کی فکر انگیز طنزیہ نظمیں، دلاور فگار، قمر اقبال، ساغر خیامی، پاپولر میرٹھی اور کئی مزاحیہ شعراء نے اپنے اپنے انداز میں 'ہجو ملیح' کا سہارا لے کر عوام الناس کو ہنسایا بھی ہے اور معاشرے کی اصلاح کی کوشش بھی کی ہے۔

اشعار میں کسی خاص واقعہ یا شخصیت، سیاسی رہنما کا خاکہ اڑانا ہو یا معاشرے میں در آنے والی مختلف النوع برائیوں پر مزاحیہ انداز میں طنز کرنا ہو۔ ان شعراء نے نہ صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے بلکہ انکے سدِ باب کی کوششوں میں ایک غیر جانبدارانہ کردار بھی ادا کیا ہے۔ اس طرح ان شعراء کا درجہ ایک مصلح، ایک ناصح اور مشفق و ہمدرد انسان کا ہوتا ہے۔ اسی لئے اس قسم کی شاعری ایک مشکل فن ہے لیکن ان شعراء نے اس مشکل کام کی اپنے خون جگر سے نمود کی ہے۔

خاندیش کے افق ادب پر ''ایمان بیاولی'' سے لے کر ''مجاہد جاگانوی'' تک (مرحوم شعراء) کئی نامور شعراء ابھرے چمکے اور غائب ہو گئے۔ حسین پائلٹ کا تعلق بھی خاندیش کی تحصیل راویر سے ہے ۔وہ روایتی شعراء سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ اپنے جذبات، احساسات اور مشاہدات کو پائلٹ نے مزاح کے انداز میں پیش کیا۔ خود ان کے مطابق

ظرافت صرف اک فن ہی نہیں بلکہ سعادت ہے
ہنسا کر غم کسی کے بانٹ لینا بھی عبادت ہے

پائلٹ کا مطالعہ و مشاہدہ بلا کا تھا۔ وہ کئی زبانوں سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے

مختلف زبانوں کے الفاظ اپنے اشعار میں بڑی بے تکلفی اور برجستگی سے برتتے ہیں ۔نعت میں انگریزی کا استعمال دیکھئے۔

دشمنان رسولؐ کا دیکھو
دل تو کالا ہے خون وھائٹ ہے

رخصتی میں ہندی کا استعمال دیکھے ؎

یہ مہکتے ہوئے مدھ بھری آنکھوں کے کمل
یہ تیرے پھول سے چہرے پر گلابی آنچل
یہ تیرے پاؤں میں شہنائی بجاتی پائیل
اور ہاتھوں میں سنہرے کنگن

اے میری پیاری بہن ۔۔۔

پائلٹ نے دیگر شعراء کے اشعار پر تضمین بھی کہی ہیں اور گرہیں لگائی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

صاحب ذوق ہو بیگم تو غزل ہوتی ہے
بال بچوں کا نہ ہو غم تو غزل ہوتی ہے
چار چھ پیک برانڈی کے چڑھا کر پائلٹ
پھر چرس کا بھی لگے دم تو غزل ہوتی ہے

(دلاور فگار کی مشہور ہزل ؎ دل کو امید رقم ہو تو غزل ہوتی ہے)

غالب کا رنگ دیکھئے۔

مرغا مرے آگے کبھی بکرا مرے آگے
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرا آگے
چھ بچوں کی ہر روز فکر کھاتی ہے مجھ کو
آتا ہے نظر پھانسی کا پھندا مرے آگے

ترے عشق کی بدولت ہے خراب حال پائلٹ
نہ وہ تجھ سے عشق کرتا نہ ذلیل و خوار ہوتا

یوں ہی کہتے ہیں پیار سے مجھ کو
وہ نہیں جانتے گدھا کیا ہے

فلمی مکھڑوں پر طبع آزمائی دیکھئے ۔

ترے منہ کا اگر ڈیئر بھپارا مل گیا ہوتا
مریض عشق کو آکسیجن دوبارہ مل گیا ہوتا

علاقہ خاندیش خصوصاً ضلع جلگاؤں کی دکن سے قربت کی وجہ سے یہاں کی اردو زبان پر دکنی زبان کا بھی خاص اثر ہے۔ اسی کا عکس پائلٹ کی ہزلوں میں بھی نظر آتا ہے۔

دیکھ یہ ان کا کوچہ ہے ایڑے چالے مت کرنا
قدم قدم پر لفڑا ہے ایڑے چالے مت کرنا
اسکو چھیڑا رستے میں تو کھاٹ کھڑی ہوجائے گی
اسکا بھائی غنڈہ ہے ایڑے چالے مت کرنا

جو مسلمانوں کو بھارت سے نکل جانے کی بات کرتے ہیں ان پر بمبیا انداز میں طنز دیکھئے ۔

نکل جانے کی دھمکی ہم کو کیوں دیتا ہے اے پاگل
ہمارے باپ دادا کا یہاں جھنڈا گڑیلا ہے

پائلٹ نے عصر حاضر کے ہر موضوع کو اپنے اشعار میں ڈھالا ہے۔ انکے مجموعۂ کلام میں حمد و نعت، نظمیں، ہزلیں، رخصتی، قطعات ہر صنف سخن کا احاطہ نظر آتا ہے۔

نظموں میں ۔ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ ۔ اے غم دل کیا کروں، چھوٹی بہن کا خط بڑی بہن کے نام، کتوں کی کانفرنس، مہنگائی، گرانی، قوم کا لیڈر، معرکہ کی نظمیں ہیں۔ سنجیدہ نظموں اور قطعات میں ایکتا، گجرات حادثہ، میرا ہندوستان بھی شامل ہیں۔

محرومی عشق ملاحظہ ہو ۔

غم ایسا ملا ہے کہ جو ٹالا نہیں جاتا
یہ دل کسی صورت بھی سنبھالا نہیں جاتا
جس دن سے ہوئی ہے میرے محبوب کی شادی
اس دن سے مرے منہ میں نوالہ نہیں جاتا

آج کل کے نوجوانوں کی بے راہ روی اور آوارگی، بدمعاش لوگوں کی ترقی پر طنز کے تیر چلاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جہاں بھی پان کا ٹھیلہ دکھائی دیتا ہے
وہاں جوانوں کا میلہ دکھائی دیتا ہے
حرام زادوں کے آگے بھی لوگ پیچھے بھی
شریف شخص اکیلا دکھائی دیتا ہے

طنز و مزاح میں بیگم کا ذکر ہر جگہ ملتا ہے۔ پائلٹ بھی اس سے مبرا نہیں لکھتے ہیں ۔

میں نے بیگم سے کہا کہ وقت ضائع مت کرو
ایک کتے کا سدھرنا غیر ممکن بات ہے
سن کے میرا مشورہ غصے سے بیگم نے کہا
تم سدھر سکتے ہو تو کتے کی کیا اوقات ہے

جہیز کی لعنت پر رقم طراز ہیں ۔

کہا بیٹے نے باوا سے چچا کا کیا بھروسہ ہے
رقم جوڑے کی لانے آپ خود جائے تو اچھا تھا
جہیز کی لسٹ میں موٹر بھی ہے ٹی وی بھی ہے لیکن
اِک انجن ریل گاڑی کا لکھا لاتے تو اچھا تھا

نام نہاد مولویوں پر طنز دیکھے ۔

کار میں پھر رہے ہیں مولانا
یہ تو چندے کی مہربانی ہے
مطمئن ہوں نماز میں پائلٹ
میری چپل بہت پرانی ہے

واعظ پی کر گھر سے نکلے
میخانہ بدنام ہوا ہے

رندوں نے مسجد بنوائی

مولانا کا نام ہوا ہے

اصلی دبا کے مال نمونہ لگا دیا

پنکھا نیا نکال کے جونا لگا دیا

چندے کی جو رقم تھی وہ متولی کھا گئے

مسجد کو دس ہزار کا چونا لگا دیا

بے عمل مسلمانوں پر طنز دیکھئے

مت پوچھ مسلمانوں کے ایمان کی حالت

روٹھے ہوئے اللہ کو منانے نہیں آتے

مسجد کے لئے سر تو کٹانے کو ہیں تیار

مسجد میں مگر سر کو جھکانے نہیں آتے

پائلٹ کے قلم کی زد میں رہنما اور سیاسی لیڈر

میں ٹیچر سے پھٹیچر ہو گیا ہوں

وہ لیڈر سے منسٹر ہو گیا ہے

کرشمہ دیکھئے جمہوریت کا

گدھا گھوڑے کا ہم سر ہو گیا ہے

اردو زبان کی شان دیکھئے

گر نہ ہو پھول تو ڈالی بھی بھلی لگتی ہے

شکل اچھی ہو تو کالی بھی بھلی لگتی ہے

پیار کے بول بھلے لگتے ہیں ہر بھاشا میں

گر ہو اردو میں تو گالی بھی بھلی لگتی ہے

لیکن اردو زبان کی ملک میں زبوں حالی اور نیتاؤں کی جھوٹی یقین دہانیاں اور تسلیاں ان سے اہل اردو اچھی طرح واقف ہیں اسلئے پائلٹ کہتے ہیں

ہر اک بھاشن میں یوں کہتے ہیں نیتا
انہیں اردو زباں پیاری بہت ہے
مگر انداز سے لگتا ہے ایسا
حقیقت کم اداکاری بہت ہے

حسین پائلٹ نے سنجیدگی کے ساتھ قومی یک جہتی کے موضوع کو بھی چھیڑا ہے۔ اردو کے پلیٹ فارم سے پائلٹ نے کچھ اس طرح پیغام رواداری دیا ہے ۔

پیغام محبت کا سُنا کیوں نہیں دیتے
تم فرقہ پرستی کو مٹا کیوں نہیں دیتے
پھیلاتے ہیں نفرت کا دھواں جو بھی یہاں پر
تم ایسے چراغوں کو بجھا کیوں نہیں دیتے

پائلٹ نے زندگی کو ہمیشہ مثبت انداز میں ہی دیکھا۔ اس لئے طنز و مزاح کے طرز سخن کو اپنایا ۔ احباب کی محفلوں کو بھی زعفران زار کیا اور مشاعروں کو بھی لوٹا۔

راقم الحروف کا میلان بھی کچھ طنز و مزاح کی طرف ہے۔ اسلئے ان کی شاعری کو پڑھ کر حقیقی لطف اٹھاتا ہوں۔ بھساول میں اواخر عمر میں موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ لگتا تھا وہ اپنے فن سے مطمئن ہیں اسی لئے تو وہ کہتے ہیں ۔

ہم وہ ہیں جو لفظوں کا گلدستہ بناتے ہیں
روتے ہوئے چہروں کو پل بھر میں ہنساتے ہیں
گر طنز کے نشتر سے کچھ زخم اُبھر آئیں
ہم اُن پہ ظرافت کا مرہم بھی لگاتے ہیں

☆☆☆☆
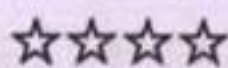
ایک بھولا بسرا شاعر: اسد انصاری

مضمون نگار : غلام نبی مومن

پیدائش : یکم جون ۱۹۴۹ء

تعلیم : ایم اے بی ایڈ، پی ایچ ڈی

پیشہ : سبکدوش افسر، بال بھارتی نصابی کمیٹی

مطبوعات : تعلیم میں نئی جہتیں، روشن ستارے، اردو میں نفسیاتی تنقید (مرتب)

پتا : روم نمبر ۲ / چودھری محلہ، کلیان 09321259451

آزادی ملنے کے بہت پہلے سے خاندیس کے اساتذہ ریاست کے تقریباً ہر تعلقہ میں تدریسی فرائض انجام دیتے آئے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔اس لیے بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مہاراشٹر میں اردو پرائمری تعلیم کے فروغ میں اہل خاندیس کا بہت اہم حصہ ہے۔ان میں سے کئی اساتذہ ادیب و شاعر بھی تھے جو درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شعروادب اور زبان کی خدمت بھی انجام دیا کرتے تھے۔ان اساتذہ میں ایک اہم نام اسد انصاری کا ہے۔

اسد انصاری ۵ / جولائی ۱۸۹۸ء کو نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ان کا پیدائشی نام عبدالقادر تھا لیکن گھر کے لوگ انھیں 'کڈو میاں' کہنے لگے اور وہ اسی نام سے مشہور ہوگئے۔اسد ان کا تخلص تھا۔اسد انصاری نے ابتدائی تعلیم نصیر آباد کی بورڈنگ اسکول (اردو میڈیم) میں حاصل کی۔فائنل کے امتحان میں کامیاب ہوتے ہی تیرہ برس کی عمر میں پرائمری اسکول میں ان کا تقرر بحیثیت مدرس ہوگیا۔پانچ برس کے بعد محکمۂ تعلیمات کی طرف سے ٹریننگ کے لیے بھیجے گئے۔اس زمانے میں ٹریننگ کی مدت تین برس کی تھی لیکن انھوں نے صرف دو برس ٹریننگ حاصل کی۔موصوف فارسی، مراٹھی زبانوں اور مراٹھی کے قدیم رسم الخط سے بھی بخوبی واقف تھے۔سبکدوشی سے قبل ہی ۳ / اکتوبر ۱۹۵۰ء کو مینا نگر (موجودہ دھرن گاؤں) میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔اس دن پورے ضلع کے اسکولوں میں چھٹی

ے دی گئی تھی جس سے اسد مرحوم کی مقبولیت اور قدر و منزلت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
اسد انصاری ایک کامیاب مدرس تھے۔ آزادی سے قبل کا واقعہ ہے کہ شری پاؤٹے (ڈائرکٹر آف یجوکیشن، پونہ) اسکولوں کے معائنے کے لیے چالیس گاؤں آنے والے تھے۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ وہ کسی استاد کے سبق کا مشاہدہ کریں گے۔ موصوف سخت گیر افسر کے طور پر مشہور تھے اس لیے کوئی بھی ستاد سبق کی پیش کش کے لیے تیار نہیں ہوا۔ کڈو میاں اس وقت اردو اسکول کے صدر مدرس تھے۔ آخر میں وہ خود آمادہ ہو گئے اور مراٹھی اسکول کے طلبہ کو قواعد پر ایک سبق پڑھایا۔ ان کے طریقہ تدریس سے ڈائرکٹر اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی تقریر میں برملا تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ جو سبق پڑھایا گیا ،زبان کی تدریس کا یہ مثالی طریقہ تھا۔
اسد انصاری نے تدریسی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ طلبہ کی زباندانی کی ترقی کے لیے قواعد کی کتابیں بھی تیار کی تھیں۔ میری نظر سے انیس القواعد (حصہ اوّل) کا دوسرا ایڈیشن (سن اشاعت ۱۹۳۹ء) گزرا ہے۔ یہ کتاب اردو پرائمری کی تیسری جماعت کے لیے تیار کی گئی تھی۔ ۳۲ صفحات کا یہ رسالہ تیرہ اسباق پر مشتمل ہے۔ ہر سبق میں مثالوں کے ذریعہ قاعدے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب لاہور کے ایک پریس میں چھپی تھی۔ اس زمانے میں اسد انصاری ضلع مشرقی خاندیس (موجودہ جلگاؤں) کے مدرسہ پارولہ میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز تھے۔
مذکورہ رسالے کے پشتی ورق کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ انیس القواعد حصہ دوّم (چوتھی جماعت کے لیے) شائع ہو چکی تھی جسے محکمہ تعلیم کی منظوری حاصل تھی۔ مرحوم نے انیس القواعد (حصہ سوّم) بھی تیار کیا تھا لیکن قطعی طور پر کہا نہیں جا سکتا کہ وہ کتاب شائع ہوئی تھی یا نہیں۔
اسد انصاری بچوں کے لیے ڈرامے بھی لکھا کرتے تھے جنھیں ان کے اسکول کے طلبہ اسٹیج پر پیش کیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں رائل ٹاکیز (دھرن گاؤں) میں 'جہانگیر کا انصاف' (اردو) اور 'آپلی مدد آپنڑے کیلی پاہی جے' (مراٹھی) اسٹیج کیے گئے اور دل خوش ٹاکیز (چالیس گاؤں) میں بھی ان کے کئی ڈرامے پیش کیے گئے تھے۔ ان کے اور دو ڈراموں کے مسودے دستیاب ہیں: (۱) دوشی کون ؟، (۲) امتحان میں کامیابی کا مجرب نسخہ۔ انھوں نے کئی مکالمے قلمبند کیے تھے۔ ان مکالموں میں 'جہانگیر اور منگل سنگھ' کا مکالمہ کافی طویل تھا اور اسے ڈرامے کے طور پر اسٹیج کیا تھا۔
اسد انصاری شاعری میں سیماب اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کی چند غزلیں ماہنامہ شاعر میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک غزل (۱۹۳۰ء) کا مقطع انتہائی بلیغ ہے:

ے روتے روتے جان ہی دے دی اسد نے ہجر میں

ڈھادیا قسمت نے ساون میں مکان زندگی

اسد انصاری نے عموماً طرحی غزلیں لکھی ہیں۔ان غزلوں کے سرسری مطالعے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے روایتی غزل کے فنی مسلمات کو اپنے کلام میں بخوبی ادا کیا ہے۔زبان وبیان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔روزمرہ اور بول چال کی زبان کی خوبی موجود ہے اور شاعرانہ حسن بھی ہے۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔پرانی شاعری کے اسلوب کی ساری خوبیاں ان کے کلام میں موجود ہیں۔ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

قضا اور مسیحا شب غم کہاں ہیں ؟ — نہ یہ آرہی ہے ،نہ وہ آرہے ہیں

یہ دلکش ادائیں ،یہ عشوے جفا کش — ستم ڈھارہی ہیں ،ستم ڈھارہے ہیں

ساتھ آیا نہ کوئی مرقد میں — ہاں ،مگر تیرا انتظار آیا

دل نے تن کو جلا کے خاک کیا — گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھائی ہے

ہوا کا ترنم ،گلوں کا تبسم — پتہ دے رہا ہے کہ وہ آرہے ہیں

زمین گور غریباں ہے بلند آواز سے کہتی — اسے آباد کرنے میں اجاڑے لاکھوں گھر میں نے

اسد کے بعض اشعار میں حسن تعلیل کی خوبی بھی موجود ہے۔ذیل کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے:

زمین شام ابھی تک اگل رہی ہے لہو — اسے ہے یاد شہیدان کربلا کی تڑپ

اے برق !چرخ سیہ فام کو بتا دینا — تجھے ہے یاد شہیدان کربلا کی تڑپ

اسد انصاری نے بچوں کے لیے بھی کئی نظمیں لکھی تھیں۔ایک نظم کے دوشعر یاد رہ گئے ہیں:

ناچو ستارو ناچو ،اب چاند نکلنے والا ہے — پہلی سے چودہ تاریخ تک پورا ہونے والا ہے

اماوس کو اے تارو ،چندا کو تم مت ڈھونڈو — کرتہ نہیں ،اس کارن وہ غائب رہنے والا ہے

مذکورہ بالا اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا جغرافیہ کے کسی سبق کو منظوم کردیا گیا ہے۔(کاش پوری نظم دستیاب ہو پاتی)۔مذکورہ بالا کلام کے نمونوں ،ان کی تحریر کردہ کتابوں اور ڈراموں سے بخوبی عیاں ہے کہ اسد انصاری مرحوم نہ صرف اچھے شاعر تھے بلکہ باصلاحیت استاد اور ملت کا درد رکھنے والے مخلص انسان بھی تھے۔

☆☆☆☆

'ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں'

مرحوم سید عبداللہ میاں ۔ عزیز مارولی

مضمون نگار : سید درویش علی عبداللہ میاں

تخلص : 'اختر' ہے اور قلمی نام 'درویش اختر'

پیدائش : یکم جنوری ۱۹۴۶ء

پیشہ : سبکدوش ۔ ایس ایس ۔ سی ۔ ڈی ۔ ایڈ (صدر مدرس)

مشاغل : اخبارات ورسائل کا مطالعہ

والد محترم کی صحبت اور مارول کے ادبی ماحول نے مجھے بھی شاعر بنا ہی دیا۔

تنہائی کا گنبد ہے اور گونج ہے سانسوں کی
بادل ہیں خیالوں کے برسات ہے یادوں کی

سید عبداللہ میاں کی زندگی ہمیشہ مفلسی سے داغدار رہی مگر شاعری کے چاند، سورج ان کی پیشانی پر ہمیشہ منور رہے۔ ان کی شاعری کھیتوں میں مزدوری، جنگل سے لکڑی اور گھاس کی کٹائی کے ساتھ پروان چڑھی۔ تیسری جماعت تک اسکول میں نام رہا مگر اسکول شاذ ہی گئے۔ بچپن سے بینائی کمزور تھی اسلئے کوئی کتاب نہ پڑھ نہ سکے۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا، قلم نہ اٹھا سکے، وائے حیرت، پھر بھی شاعر ہوئے، نام کمایا۔ مارول کی گلی گلی، گھر گھر اور میلاد کی محفلوں میں ان کے کلام کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ان کی شخصیت دیوانہ پن، بے خودی، خودداری، قلندرانہ شان مجذوبیت سے مالا مال تھی ۔عموماً خاموش طبع تھے۔ مگر جب بات کرتے تو نرم، دھیمے لہجے میں کرتے۔ میرے والد کی زندگی اور شاعری پر غور کرتا ہوں تو زیب غوری کا شعر یاد آجاتا ہے۔

رات میں نے ایک خرقہ پوش کو دیکھا ہے زیب
اپنے چہرے کے اجالے میں رفو کرتے ہوئے

کھیتوں اور جنگل میں، میں اکثر میرے والد کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ راہ چلتے چلتے ان کا وہ اچانک

ٹھٹھک جانا، چوکنا ہوجانا، جیسے انھیں کسی چیز کی تلاش ہو۔ بھیڑ میں بھی اپنے کوتنہا محسوس کرنے والا یہ شخص اپنے اندر عجیب اسراریت لیے ہوئے تھا۔ میں کبھی ساتھ بھی ہوتا تو ایسا لگتا جیسے وہ مجھے بھول گئے ہوں ۔میرے مخاطب کرنے پر چونک جاتے اور کہتے۔ ''آں! تم نے کچھ کہا۔'' اور حیرت سے ان کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔ ایسے تھے والد جناب عزیز صاحب۔ جنھیں رات میں غربت زدہ دن کی فکر سونے نہیں دیتی تھی ۔مگر قدرت کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہوتے ہیں۔ یہ فطرت کی طرفہ فیاضی ہی تھی جس نے تیسری پاس ،عام آدمی کے دل میں پرسوز اور مترنم بنائے عشق رسول ڈال دی۔ یہی نہیں زندگی کے رموز و نکات ان پر وا کیے اور مرصع غزل گو اور مرثیہ نگار بنا دی۔ شیرینی، سلاست، روانی، نغمگی اور سادگی و پرکاری سے معمور ترنم ریز جھرنے بہ صورت شاعری پھوٹ پڑے اور وہ اپنے وقت کے سب سے ہردلعزیز شاعر قرار پائے۔ مارول میں شعری نشستوں کی ابتداء کا سہرا بھی انہیں کے سر بندھتا ہے۔ شعری نشستوں اور میلاد کی محفلوں میں آپ کے کلام کو سن کر ان آنکھوں نے اہل علم اور دانشوروں پر وجد طاری ہوتے ہوئے اور گریبانوں کی دھجیاں اڑاتے ہوئے دیکھا ہے۔ عالم وجد میں 'آہ، واہ کرتے آنکھوں سے موتی بہاتے دیکھا ہے۔ یہ تھا عزیز کا فن اور ایسا تھا ان کا جادو۔ مگر ان کی زندگی کا دوسرا رخ بھی دکھاتا چلوں۔

عجیب دیوانہ شخص تھا۔ دن نکلتے ہی روزی کی تلاش میں گھر سے نکل جاتا۔ کوئی موسم ہو اس کی ہمت اور حوصلہ کے سامنے پسپائی پر مجبور ہو جاتا۔ اس شخص کو گرمی میں سائے کی تلاش رہتی نہ برسات میں چھت کی نہ سردی میں آگ کی۔ موسم کی سختی کو نظر انداز کیے، ہاتھ میں درانتی پکڑے کھیتوں کی جانب چل پڑتا۔ دھن رے دھنیر ے اپنی دھن کے مصداق اپنے احساسات وخیالات کو الفاظ کے پر اثر ،مترنم سانچوں میں ڈھالتے ہوئے راستہ طے کرتا۔ یوں خوبصورت اشعار کی تخلیق کرتا۔ نہ کاغذ، نہ قلم ۔اپنے ذہن میں اشعار جمع کر کے محفوظ کر لیتا۔ گھر واپسی پر جناب ابرار احمد کی تلاش رہتی۔ وہ ہی ان کی نعت، غزل لکھتے تھے۔ آپ دیوار سے ٹیک لگاتے، چٹکی میں دبی بیڑی سے جلدی جلدی دھواں اڑاتے اور یاد کر کے شعر لکھواتے۔

خدا کے بھید خدا ہی جانے کہ ایک تیسری جماعت کا طالب علم کس طرح شاعری کی بلندی پر متمکن ہوگیا۔ ان کی زبان سے پھوٹے الفاظ کے جھرنے تھے جو سوکھتے نہ تھے۔ عشق رسول میں سرشار یہ دیوانہ ایک ایسا عاشق تھا جو پل میں کبھی مدینہ، کبھی پیش حضورؐ، کبھی عرش پر کبھی فرش پر کبھی خلا میں کبھی سماوات میں اپنے تخیل کے پروں سے پرواز کرتا رہتا۔ انتہائی غیرت مند، متقی، کبھی کسی کے آگے دست سوال نہ پھیلانے والا، دنوں بھوکا رہ کے شان خودداری پر حرف نہ آنے دینے والا، ایسا تھا عزیز مارولی۔

ان کی زندگی کے واقعات تو بہت ہیں۔ میرے ساتھ ایک اہم واقعہ گزرا تھا۔ بتاتا چلوں۔ یہ وہ واقعہ تھا جس نے زندگی کے تیئں میرا نقطہ نظر ہی بدل کے رکھ دیا اور مجھے بے حد حساس بنا دیا۔ پونہ ۔ڈی ایڈ کالج میں امتحان فیس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ والد صاحب کو خط لکھا۔ خط کے جواب میں خط آیا۔ خط یوں تھا۔

عزیزم!

دعائیں!

خیریت حاصل، عافیت مطلوب۔

اللہ نہ دے بے بسی ایسی بھی کسی کو
ہم سامنے جلتا ہوا گھر دیکھ رہے ہیں

فقط

خستہ حال، عزیز بے نوا!

خط کیا تھا؟ مانو ایک زلزلہ تھا جس نے مجھے سر سے پا تک ہلا کر رکھ دیا۔ اس واقعہ کا اختتام پرنسپل محی الدین جیسے عظیم انسان اور دردمند پرنسپل کی مہربانی پر ختم ہوا۔ آپ نے میری فیس بھر دی تھی۔
میرے والد کئی مجموعوں کے مالک ہو سکتے تھے۔ مگر خود اپنا کلام محفوظ نہ رکھ سکے۔ شاید ہماری دیہاتی زندگی کی سادگی اور شہرت سے بے نیازی بھی ذمہ دار رہی۔ ابرار احمد کی ڈائری اور میلاد کے دفتر سے کچھ استفادہ حاصل کر کے میں نے اپنے والد کو یاد کیا ہے اور آپ سے متعارف کرایا ہے۔ ان کی شاعرانہ قدر و منزلت کا تعین آپ قارئین اور ناقدین ادب کا کام ہے۔
ان کی شاعری کی ابتدا حمد یہ نعتیہ کلام سے ہوئی۔ تخیل اور تصور کی اڑان کو کون روک سکا ہے۔ عقیدت و محبت کا دلکش انداز دیکھیے:

خواب میں احمد مختار سے باتیں کی ہیں ۔۔۔ بعد ازاں طالع بیدار سے باتیں کی ہیں
اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک ہی تصور، ایک ہی خیال
تیرے دیوانے مدینہ میں جو پہنچے ہیں کبھی ۔۔۔ والہانہ در و دیوار سے باتیں کی ہیں

خیال خوبصورت ہو تو خواب حسین ہو جاتا ہے اور عشق حقیقی در و دیوار سے لپٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

چلمن کے میں قریب ہوں چلمن میں روئے یار ہے
یہ بھی کوئی قرار ہے دل اور بے قرار ہے

ایک آرزو جو پوری نہ ہوسکی اسے تصور کی دنیا میں کسطرح پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں دیکھیے:

میرا سرِ نیاز ہے اور آستانِ یار ہے
اے موت روح قبض کر اب کس کا انتظار ہے

زبان آسان، مُکتفی، سادہ اور مترنم ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ مزید پیش ہیں:

میں ان کے تصور میں ہوں اے حضرت موسیٰ
تم طور پہ جاؤ میں یہیں دیکھ رہا ہوں

زمان و مکان کی حدوں کو توڑتا ہوا یہ مراقبہ ذاب بے مثال ہے۔

نہ کرتیں کیسے خوشبو سے وضو گلیاں مدینے کی
نبی گلدستہ تھے شہر نبی گلدان جیسا تھا

جی ہاں! گل، گلدستہ، گلدان کا تعلق خوشبو سے ہے اور آپ کے پسینے کی خوشبو سے دنیا واقف ہے۔
نبی کریمؐ کی محبت اپنے وجود میں سمالینے کی آرزو دیکھیے:

دل میں رہئے مرے آ کر کہ جگر میں رہئے
تم ہو مختار پسند آئے وہ گھر میں رہئے

فراق نبیؐ اور شوق دید کی روح پرور کیفیت کا نظارہ اس شعر میں دیکھیے اور لطف کلام اور روحانی ارتفاع حاصل کیجئے:

ترے عشق میں شہہ دوسرا مری زندگی کا یہ حال ہے
نہ فنا کا مجھ کو خیال ہے نہ بقا کا مجھ کو خیال ہے
کوئی اردلی ہے نہ نامہ بر تہی رحم کر مرے حال پر
اے صبا حضورؐ کی لا خبر میری زندگی کا سوال ہے

اور یہ عجیب سا نعتیہ شعر دیکھیے۔ کیا نقطہ اور کیا مضمون آفرینی ہے۔

خیال مدینہ تھا دل میں بسا نہ راس آیا آدم کو باغ ارم

مرثیہ نگاری، اہل بیت سے بے مثال محبت ان کی شخصیت کا اہم حصہ تھی۔ نہر القمر کی تجسیم کا شاعرانہ اظہار کمال دیکھیے۔

ساحل پہ مرے آل نبی پیاسی ہے افسوس
بدنام ہوا نام مری مری دریا دلی کا

یہ شوق شہادت کہ عزیز آل نبی نے
احساس نہیں ہونے دیا تشنہ لبی کا

مہمان کربلا کی ضیافت تو دیکھیے
شاقی کھڑے تھے ہاتھ میں خنجر لیے ہوئے
کیا کربلا کے پیاسوں کی تقدیر تھی عزیز
حوریں کھڑی تھیں ہاتھ میں کوثر لیے ہوئے

پانی حیات افزا ہوتا ہے مگر عزیز کا یہ پانی کو بے توقیر کرنے کا انداز دیکھیے۔

کوثر کے دھنی کو نہ ملا تجھ سے جو پانی
اے نہر ترا پانی پیا کون کرے گا

غزل میں عزیز صاحب طرح طرح کے رنگ بھرنے میں ماہر ہیں۔ واعظ سے چھیڑ اور خمریات کی تعریف وتحریص ہماری غزل کا ایرانی عنصر ہے۔ اسی روایت کی پاسداری میں عزیز صاحب شوخ بیانی سے بخوبی کام نکال لیتے ہیں۔

واعظ مجھے پینے کی ترکیب بتا ایسی
توبہ بھی نہ ٹوٹے اور حسرت بھی نکل جائے

مگر مذکورہ شعر جزو شاعری کل شاعری نہیں۔ اللہ کے حضور عاجزی کے اظہار کا سلیقہ بھی ان میں موجود ہے یہ اور بات کے دوسروں کو نشانہ طنز بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔

سجدے کا طریقہ نہ رکوع ہی کا سلیقہ
نادان دعاؤں میں اثر ڈھونڈ رہے ہیں

عزیز صاحب کی شاعری کا میدان عمل بنیادی طور پر نعت اور مرثیہ کی اصناف تھیں۔ مگر غزل ان کی واقعی زندگی میں اتری ہوئی تھی۔ مفلسی، کمزوری، مایوس کن حالات مگر عزیز کا زندگی کے لیے نقطہ نظر دیکھیے:

ضعیف العمر ہوں طبع جوان رکھتا ہوں
زمیں ہوں شانوں پہ میں آسمان رکھتا ہوں

مگر ان کی دوسری شاعرانہ جست انھیں احساس دلاتی ہے کہ وہ درحقیقت حالات کے قیدی ہیں۔ یہ زندگی کا کڑوا سچ ہے جس سے کسی فنکار کو نجات نہیں۔

کہاں جائیں تیر حوادث سے بچ کر

ہر اک گام پر تونشانے لگے ہیں

غزل کی ریزہ کاری جاری ہے، شعر کی اور ایک جست انہیں رومانیت کی جانی پہچانی دینا میں لے آتی ہے اور کہتے ہیں:

معتبر بتا اس کی تعبیر کیا ہے
وہ کیوں خواب میں آنے جانے لگے ہیں
کریں گے مجھے ساتھ اپنے وہ رسوا
وہ پھر مرے گھر آنے جانے لگے ہیں

اہل سیاست کی کج روی، ظلم و جبر اور عوام کی سادہ دلی کا خوبصورت اظہار یوں کرتے ہیں:

ان لوگوں میں کیا کوئی سمجھ دار نہیں ہے
جلتے ہوئے سورج سے نمی مانگ رہے ہیں

گنہگاروں کے لیے مژدۂ جاں افزا یوں سناتے ہیں جو ایک طرح کی جرأت رندانہ کا درجہ رکھتی ہے اور اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے کے مصداق

پارساؤں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ، میں گنہگاروں میں ہوں

روایتی لہجے کی شیرینی، معشوق سے شکایت کا یہ انداز دیکھیے اور لطف اٹھائیے:

بزم میں تو سب ہی نکلے جانے بوجھے آپ کے
اک فقط میں آپ کی نظروں میں انجانا رہا
جان کے کرتا نہیں درد محبت کا علاج
چارہ گر واقف حالات نہ ہوجائے کہیں
پھر بہار آئی ہے زاہد پھر اٹھی کالی گھٹا
زندگی نذر خرابات نہ ہوجائے کہیں

ابرار احمد کی شکستہ حال ڈائری، کٹے پٹے اوراق اور حروف والفاظ۔ خواب آنکھیں گڑا گڑا کے دماغ لڑا لڑا کے اشعار آپ کے سپرد کیے ہیں۔ خدا کرے محنت چیز ہو۔ عزیز مرحوم کو آپ اپنی دلی دعاؤں سے نوازیں۔ اسی امید کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں۔

☆☆☆☆

ساحرؔ ادیبی: شعر بن بن کے لب پہ آتے ہیں

مضمون نگار : سید شفیق ناظم سید نصیر
قلمی نام : شفیق ناظم
تعلیم : ایم اے بی ایڈ، پی ایچ ڈی
پیدائش : ۲۷/اگست ۱۹۶۴ء
پیشہ سے مدرس، فن کے اعتبار سے شاعر، افسانہ نویس و محقق
عظیم شاعر مجروح سلطانپوری کی شخصیت و فن پر تحقیقی کام ۲۰۰۰ء میں امراوتی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض۔
پتا : ''غزل'' نشیمن کالونی مہرون، جلگاؤں (مہاراشٹر) 09096298810

شہر جلگاؤں میں ادبی شخصیات نے نو واردین ادب کی ذہنی تربیت کا سامان کیا ان میں ساحر ادیبی مرحوم کا بھی شمار ہوتا ہے۔ گھنیرے بال، گوراچٹا رنگ، تفکر بھری آنکھیں، میانہ قد، میانہ روی، مسکراتا چہرہ، کرتا پاجامہ پوشاک، کالے رنگ کی فریم کا چشمہ، پان کے شوقین، نہایت نفیس وضعدار شخصیت کے مالک ساحر ادیبی پیشے سے مدرس تھے۔

تاریخ و مقام پیدائش ۱۶/جون ۱۹۳۴ء ناندورہ ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر اور وفات ۹/اپریل ۱۹۹۲ء جل گاؤں مہاراشٹر۔ مکمل نام قاضی سعید الدین فیاض الدین۔ بہ سلسلہ ملازمت ۱۹۵۴ء میں جلگاؤں آئے۔ آپ کا شعری مجموعہ ''فسونِ سخن'' پس مرگ ۱۹۹۳ء میں ''بزم یاراں جلگاؤں'' کے توسط سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا اور خوب مقبول عام ہوا۔

جس وقت آپ جلگاؤں وارد ہوئے اور پیشہ مُدرّسی سے وابستہ ہوئے اس وقت یہاں کی ادبی فضا پر مرحوم ناظر انصاری اور مرحوم سلطان نقشبندی چھائے ہوئے تھے۔ ادبی فضا نے ذوق شعر کو تقویت دی، ساحر ادیبی شعر کہنے لگے تو اپنے وقت کے نامور شاعر حضرت ادیبؔ مالیگانوی کے حضور تلمیذ دوزانو

ل تہہ کیا اور یوں ’’ادبی‘‘ کا لاحقہ ان کے تخلص سے مربوط ہو گیا اور آپ کی شناخت بنا۔

عمیق مطالعہ نے آپ کی شخصیت میں گہرے سمندر کا وصف خاموشی بھر دیا، شہرت و ناموری سے بے نیازی نے ہر ایک کو آپ کا نیاز مند بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بزرگوں کے چہیتے ہم عصروں کے محترم اور نو آموز شعراء کے استاذ رہے۔

اپنے وقت کے نہایت اہم شاعر افسر سیمابیؔ مرحوم جو کہ ثانیٔ اقبال کہلاتے تھے۔ ساحرؔ ادبی کے متعلق لکھتے ہیں ’’مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے جب میں اپنی ناچیز تصنیف ’’خاورستان‘‘ کی فروخت کے سلسلے میں جلگاؤں گیا تھا۔ پروفیسر فخرؔ، ناظر انصاریؔ، سحرؔ جلگانوی، میکش انورؔ، مظفر زبیری، حامدؔ جلگانوی وغیرہ احباب کا خلوص نا قابل فراموش ہے۔ ایک نوجوان شاعر نے مجھے بطور خاص متاثر کیا وہ نوجوان ہیں ساحر ادبیؔ، انہیں کے کمرے پر میرا قیام تھا۔ نہایت احترام اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کی ایک خصوصیت مجھے پسند آئی۔ میں کم و بیش ایک ہفتہ ان کا مہمان رہا مگر انھوں نے کبھی سننے سنانے کی آرزو نہیں کی اور نہ کبھی مشاعروں کا ذکر کیا۔ میرا خیال تھا کہ عام شاعروں کی طرح یہ بھی ’’غزل گا‘‘ قسم کے قافیہ پیما اور گلو فروش ہوں گے لیکن مدت دراز کے بعد جب انھوں نے اپنی بیاض شعر ارسال کی تو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ روایتی شاعری کی لغویات سے ان کا دامن فکر بڑی حد تک پاک ہے ۔۔۔ان کا موضوع سخن بھی وہی ہے جو کسی شاعر جواں کا ہو سکتا ہے یعنی جمال دوست کی ثنا خوانی اور سوز عشق کی شکوہ سرائی۔

ساحر ادبی مرحوم میرے والد محترم شوقؔ جلگانوی کے قریبی دوستوں میں رہے۔ میں انھیں بچپن ہی سے سنتا آیا ہوں۔ مدلل ادبی گفتگو، کتابوں کے حوالے، شعری رموز، روایتوں کا لحاظ، روانی، سادگی، اثر آفرینی، معنوی تہہ داری، عصری حسیت، علامتیں، استعارے، تشبیہہ، تلمیحات جیسے کئی موضوعات زیر بحث ہوتے۔ میں ان کی باتیں توجہ سے سنتا تھا۔ میرے والد انکی بات کو حرف آخر کا درجہ دیتے آئے ہیں۔ لہٰذا وہ میرے لیے بچپن ہی سے معتبر رہے۔ ساحرؔ صاحب روایتوں کے امین تھے انکے نزدیک شاعری واردات قلب کی ترجمان تھی۔ بالکل اس شعر کے مصداق

دل میں ساحرؔ جو غم سماتے ہیں
شعر بن بن کے لب پہ آتے ہیں

ساحرؔ صاحب کو عارضۂ قلب اور بلڈ پریشر جیسے امراض لاحق تھے یہ صرف وہی لوگ جانتے تھے جو انکے قریب تھے۔ ان کا چہرا یا تو گہرے تفکر کا آئینہ دار تھا یا پھر مسکراہٹ لیے ہوئے ہوتا۔ جو ایک بار

ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور بار بار ملنے کا مشتاق ہوتا۔ وہ اپنے دکھ درد کو اپنی نیکیوں کی طرح چھپائے رکھتے تھے۔ اس عظیم شاعر نے یہ شعر یوں ہی نہیں کہا ؎

مسکراہٹ اداس چہروں کی
عظمت زندگی بڑھاتی ہے

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خود کی ذات سے آگاہ ہوتا ہے۔ اسے اپنی خودداری کا احساس ہوتا ہے۔ زندگی کو قلندرانہ طرز سے جینے کا اس میں سلیقہ در آتا ہے اور اسکی سوچ نفی میں بھی اثبات کے پہلو تلاش کر لیتی ہے۔

ساحرؔ صاحب کے پیش نظر ایک آدرش زندگی کا تصور ہمیشہ رہا۔ اوروں کے دکھوں پر غمزدہ ہو جانا انکی فطرت میں تھا وہ جتنے سچے تھے ان کا کلام بھی اتنا ہی سچا ہے۔ سادگی سے بہت گہری بات کہہ جانا انکے کلام کا خاصہ ہے۔ بطور مثال ایک غزل کے چند اشعار ؎

مجھ کو سو سال کے ساماں پہ ہنسی آتی ہے
یعنی دو روز کے مہماں پہ ہنسی آتی ہے
بات بن بن کے بگڑ جاتی ہے تقدیر سے جب
اپنے ہی حال پریشاں پہ ہنسی آتی ہے
کبھی روتا ہوں میں پھولوں کو فسردہ پاکر
کبھی ارباب گلستاں پہ ہنسی آتی ہے
آرزو پھولوں کی رکھتا ہے جو کانٹے بو کر
مجھ کو اس دور کے انساں پہ ہنسی آتی ہے

ساحرؔ صاحب پیشہ سے مدرس تھے جب میں اس پیشے سے وابستہ ہوا تو انہیں کے مدرسہ سے ابتدا ہوئی۔ اس اعتبار سے میں خوش نصیب ہوں کہ شعر و ادب کے رموز و اوقاف جس شخصیت سے سیکھے اسی سے تدریس کے گر بھی مجھے سیکھنے کو ملے۔

۱۹۸۴ء میں میرے والد اور ساحرؔ ادیبی کی کاوشوں سے ''بزم یاران قہقہہ فروش'' کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس کے ذریعہ طلبہ میں ادب سے ذوق پیدا کرنے کی خاطر کئی پروگرام لیے گئے جیسے ہزل گوئی کا مقابلہ، لطیفہ گوئی کے پروگرام، مزاحیہ ڈرامے وغیرہ۔ اس انجمن میں مَیں اور ساحرؔ صاحب کے فرزند میرے رفیق غار عزیزم ضمیر اشرف پیش پیش رہے۔ مرحوم ڈاکٹر اکبر رحمانی نے ''راشٹریہ ایکاتمتا

پبلک لائبریری'' کا کمرہ ہمیں محفلوں کی خاطر مہیا کیا۔ مرحوم اکبرؔ شاہین، مرحوم صابر زاہدؔ، مرحوم مجاہد جلگانوی، عزیزم جمیل انجم، عزیزم افضال بھی اس انجمن سے وابستہ ہوگئے تو پروگرام خالص ادبی نوعیت کے ہونے لگے۔ ان میں طرحی محفلیں، مشاعرے، افسانوں کی محفلیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شعری محفلوں میں ساحرؔ صاحب کو نہایت ذوق وانہماک سے سنا جاتا تھا۔ انکے کئی شاگرد اس محفل میں شریک ہوتے جن میں محترم صابر نصیر آبادی، مرحوم افسرؔ بھڑگانوی اور خلیل احمد خلیلؔ بڑے لہک لہک کے کلام سناتے اور اپنے مخصوص اشعار اپنے استاد محترم کی نذر کرتے تھے۔ وہ دور شہر جلگانوں کی ادبی فضا کا سنہرا دور تھا۔ ساحرؔ صاحب کا وہ دفینہ جو انکی بیاض میں چھپا ہوا تھا ان محفلوں سے تشنگان ادب کو سیراب کرتا تھا۔

میں ۱۹۹۰ء سے شعر کہنے لگا۔ پہلی غزل کہی تو اصلاح کے لیے نظر انتخاب ساحرؔ صاحب پر گئی۔ مگر ایک تکلف کا پردا حائل تھا۔ غزل میں کئی رومانی اشعار تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنا کلام انکے سامنے پیش کیا جائے۔ آخر ایک ترکیب سوجھی میں نے اپنی غزل اپنے عزیز دوست صاعدؔ جیلانی کے نام سے ان کے سامنے رکھی۔ سات اشعار کی غزل میں دو اشعار کو انھوں نے درست کیا اور پرزہ میری جانب بڑھاتے ہوئے مسکرانے لگے۔ میں نے جب انکی جانب دیکھا تو یوں لگا کہ انکی نیم واں آنکھیں میرے دماغ تک پہنچ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ چور پکڑا گیا۔ میں بری طرح جھینپ گیا اور وہاں سے جلد از جلد جانے کے لئے بیتاب ہوگیا۔ ساحرؔ صاحب بولے'' اپنے دوست سے کہنا تم میں شعر کہنے کی رمق ہے۔ ابتدا ایسی ہی ہوتی ہے کہتے رہو۔'' میں فوراً اٹھا شکریہ ادا کیا اور باہر تیز قدموں سے چل دیا۔

کچھ دنوں بعد محترم محسن جلگانوی کی آمد پر ایک اعزازی شعری محفل بزم یاران قہقہہ فروش کے ذریعہ لی گئی۔ مجھے ان کے اشعار یاد تھے۔ میں نے اپنے تاثرات بیان کرتے وقت وہ اشعار بھی پڑھے۔ جب اپنی بات مکمل کر کے بیٹھنا چاہا تو ساحر صاحب بولے'' میاں آپ نے محسن صاحب کے اشعار خوب منتخب کیے۔ چلیے محفل کی ابتدا اب آپ کے ہی اشعار سے کرتے ہیں۔ میں ٹپٹا گیا تو آپ نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا پڑھیے خوب غزل ہے وہ۔ ساحر صاحب واقعی ساحر تھے۔ مردم شناسی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ہر شخص میں انھیں خوبیاں ہی نظر آتیں۔ وہ 'رد' کے نہیں 'قبول' کے حامی تھے۔ ہر چند کہ انکا شعری اسلوب صالح روایتوں کا پاسدار تھا تاہم ان کے ذہنی دریچے جدید شاعری کے لیے ہمیشہ ہی کھلے رہے۔

ایک مرتبہ مرحوم صابر زاہدؔ کے چند اشعار لیے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ زاہدؔ صاحب جدت پسند شاعر تھے۔ ان کے علامتی اشعار میری سمجھ سے پرے ہوتے تھے۔ میں نے ساحر صاحب کے سامنے ان کے اشعار پیش کیے اور کہا ’جدید شاعری ایسی کیوں ہے دو مصرعوں کے درمیان ربط کیوں نظر نہیں آتا، معنی سمجھ میں نہیں آتے؟‘

مجھے لگا ساحر صاحب میری بات سے متفق ہوں گے مگر جو انھوں نے کہا وہ نہ صرف میرے اعتراض کا جواب تھا بلکہ شعر فہمی کے لیے میری تربیت کا سامان بھی تھا۔ انھوں نے جواب دیا ’ایسا نہیں ہے دونوں مصرعوں میں ربط بھی ہے اور شعر پُر معنی بھی ہے۔ بہت دور جا کر ان میں ربط نظر آئے گا۔ بہت سوچ کے بعد ان گہرے سمندروں کے موتی ہاتھ آئیں گے۔‘

ساحرؔ صاحب کے کلام میں سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی خوب تھی انھوں نے جہاں اپنے جذبات کو شعری پیکر عطا کیے وہیں اپنے کلام سے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کے پیغامات بھی دیئے اور ساتھ ہی سیاست کی کج روی پر بھرپور چوٹ بھی کی۔ بطور مثال انکے یہ اشعار

واردات قلب

اُٹھ کے تیری بزم سے جانے کدھر جائیں گے ہم
بے خبر آئے ہوئے ہیں بے خبر جائیں گے ہم

عہد و پیماں سے گزرنے کا زمانہ آگیا
آہٹوں پر کان دھرنے کا زمانہ آگیا

حسن والوں کی ہر اک بات سے ڈر لگتا ہے
یعنی ارباب طلسمات سے ڈر لگتا ہے

گل مسکرا رہے ہیں بپاسِ بہار نو
ورنہ شگفتگی سے تعلق نہیں رہا

جب بھی ہم ان کو دیکھ پاتے ہیں
دونوں عالم کو بھول جاتے ہیں

پیغام معاشرہ

ایک اک دل ہوگا سرشارِ نشاط زندگی
جب یہ دنیا واقف رمزِ وفا ہوجائے گی

محبت ہے متاعِ جاودانہ
نہیں اس راز سے واقف زمانہ

علم ہے رازِ ارتقائے حیات
علم ہے رونقِ سرائے حیات

جو اہل حق حقیقت آشنا ہوتے ہیں اے ساحرؔ
سکوں ملتا ہے ان کو خنجر و شمشیر کے نیچے

اٹھیں گے مایوسیوں کے پردے تو بزم عالم نئی ملے گی
جہاں ہیں اب ظلمتوں کے ڈیرے وہیں سے کل روشنی ملے گی
اگر طلب ہے سکون دل کی تو پھر نہ گھبرا مصیبتوں سے
کہ بطنِ آلام ہی سے تجھ کو مسرت زندگی ملے گی
بچھے ہیں کانٹے قدم قدم پر جو راہ صدق و صفا میں ڈر کیا
جو گامزن راہ حق پہ ہوگا اسے نئی زندگی ملے گی

زندگی ہے مثالِ نقش قدم
پھر بھی جینے کو مر رہے ہیں ہم

موت راہ عشق میں جب زندگی سے کم نہیں
آپ کا غم بھی مرے حق میں خوشی سے کم نہیں
عشق میں تاریک راہوں سے نہ گھبرائے کوئی
یہ وہ ظلمت ہے جو ساحرؔ روشنی سے کم نہیں

سیاست کی کج روی پر ضرب

ہمارے دور کا کیا رنگ روزگار رہا
کھلا جو پھول وہ آزردۂ بہار رہا

تہذیب کی بلاؤں کے تیور تو دیکھیے
دولت کے ان خداؤں کے تیور تو دیکھیے

گلستان دل گلعذاروں نے لوٹا
چمن کو چمن کی بہاروں نے لوٹا

خبر بھی ہے کہ قائم ہے نظام گلستاں ہم سے
بہت پچھتائے گا تو روٹھ کر اے باغباں ہم سے

زمانے کی ہوا نے پھر نیا رخ تو نہیں موڑا
مخالف جا رہا ہے کیوں غبار کارواں ہم سے

خار و گل کا مسئلہ ہے آج ساحرؔ حل طلب
عظمت جمہوریت ورنہ ہوا ہو جائے گی

بات کیا ہے امام میخانہ
سونی سونی ہے شام میخانہ

کج نگاہی سے تیری اے ساقی
ڈوب جائے گا نام میخانہ

جڑیں نفرت کی پختہ ہو رہی ہیں پیار کے نیچے
اندھیرا بڑھ رہا ہے مطلعِ انوار کے نیچے

ساحرؔ صاحب کے اس نوعیت کے اشعار میں عصری آگہی صاف نظر آتی ہے جو اس بات کی غماز ہے کہ فنکار نباض زمانہ بھی ہے اور اپنے فن سے اس نے مجاہدہ بھی کیا ہے تو وہیں اپنی خاموش شخصیت سے کردار سازی کی صدائیں بھی دی ہیں۔

ساحرؔ ادیبی گزر گئے یہ واقعہ غلط ہے۔۔۔ ساحرؔ ادیبی زندہ ہیں۔۔۔ سینہ در سینہ اپنی شخصیت کے وسیلے سے اور شعر در شعر اپنے فن کے حوالے سے۔

(اے ''فسونِ سخن'' ساحرؔ ادیبی)

☆☆☆☆

ظفر علی ظفر۔ مختصر احوال وکلام

مضمون نگار : سید عنایت علی ظفر علی

تعلیم : ایس۔ایس۔سی۔ڈی۔ایڈ

تاریخ پیدائش : یکم جون ۱۹۶۴ء

تاریخ سبکدوشی : ۳۰؍مارچ ۲۰۱۴ء

پیشہ : سبکدوش پرائمری صدر مدرس، اردو اسکول، ساودہ تعلقہ راویر

میرے والد محترم سید ظفر علی ولایت علی بھرپور خاندانی زندگی گزار کے ۵؍اکتوبر ۲۰۰۸ء میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کے بعد والدہ محترمہ محبوب بیگم بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے، مراتب بلند کرے (آمین)

۱۳؍اگست ۱۹۶۰ء میں مارول کے اہل علم حضرات جن میں سید جہانگیر علی عنایت علی میرے حقیقی پھوپھا، فاروقی ضیاء الدین۔۔۔مرحوم جیسے حضرات وطن عزیز کے اور مخدومین ملت کو ساتھ لیا اور فیض پور میں مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی۔ جس انجمن نے یہ کار عظیم کیا اس کا نام انجمن عروج تعلیم ہے جو آج بھی مارول کی اینگلو اردو ہائی اسکول اور جونیئر کالج کی نگراں ہے۔ میرے والد اس انجمن کے تاحیات سیکریٹری رہے۔ میرے دادا بڑے زمیندار تھے۔ یوں والد کو ایس ایس سی کے بعد نہ مزید پڑھایا اور نہ نوکری کی اجازت دی۔ ہمارے والد نے ہم تین بھائیوں، محمد خالد، محمد طارق اور مجھے ڈی ایڈ کرایا۔ الحمدللہ ہم تینوں بھائی سبکدوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ مضمون لکھنے کے لیے میرے پھوپھی زاد بھائی قیوم راز نے کہا۔ میں نے والد کی ایک پلاسٹک بیگ کو ان کے اسباب میں پایا۔ ڈائری وغیرہ نہیں ملی۔ تمام پرزے کٹے پھٹے، خستہ حال، ہاتھ لگاتے ٹوٹ جانے والے ملے۔ وہی قیوم راز کے حوالے کردیا کہ آپ کسی طرح پڑھ کر لکھ لیں۔ ہاں میلاد کی

بیاض سے ان کی کچھ نعتیں ملیں۔ وہ بھی حاضر کر دی ہیں۔

جو بات ماضی کی بھلائے نہیں بھولتی وہ یہ کہ میرے والد، میرے پھوپھا ڈاکٹر عبدالغفار اور ایک پھوپھا سید عبداللہ میاں، عزیز مارولی روزانہ صبح ہمارے کشادہ آنگن میں چارپائیوں پر بیٹھ جاتے اور شعر و شاعری کی محفل گرم ہو جاتی۔ عزیز مارولی اپنا کلام سناتے۔ پھر کیا غالب، داغ، میر، اقبال، امیر مینائی وغیرہ کے اشعار وہ ایک دوسرے کو سناتے اور لطف اندوز ہوتے۔ اب ایسی محفلیں کہاں! حرف آخر یہی کہ

جانے والے کبھی نہیں آتے

جانے والوں کی یاد آتی ہے

نمونۂ کلام

کچھ ایسی الکشن کی دیوی نے لی انگڑائی

پنڈت ہوں کہ مولانا سب ہو گئے شیدائی

لینا ہو تو پیسہ لو، دینا ہے تو مت دینا

بس اتنی گزارش ہے ہر اک سی یہی بھائی

آیا ہے الکشن گیا شیطان سنا کر

آئے گا مزہ باپ کو بیٹے سے لڑا کر

ایسے بھی ہیں ثالث جو نمک مرچ لگا کر

سو جاتے ہیں آرام سے کچھ فتنے جگا کر

تولتا ہے فقط سکۂ زر سے انصاف

پاس منصف کے جو حق تولے ترازو بھی نہیں

میں دعا کرتا ہوں مرحوم کی بخشش کے لیے

اقربا روتے ہیں پر آنکھ میں آنسو بھی نہیں

تن بھی کالا دھن بھی کالا

من میں ہو پھر کیسے اجالا

اصل ہی لیتے سود نہ لیتے

پیٹ نہ اتنا پھولتا لالہ

غزل

زندگی میں جس کی لطیف بندگی شامل نہیں
عمر بھر تقدیر میں اس کی سکون دل نہیں
آنکھ ہے وہ آنکھ ہو جس آنکھ میں جلوہ ترا
دل وہی دل ہے جو تیری یاد سے غافل نہیں
بخش دے یارب طفیل مصطفی یہ حشر میں
ورنہ میرے یہ گنہہ تو عفو کے قابل نہیں
ہم مسافر ہیں چلے جائیں گے کل ملک عدم
ایک ہے منزل ہماری دوسری منزل نہیں
بندگی یہ بندگی صد حیف ایسی بندگی
سر تو جھ جاتا ہے سجدے میں ہمارا دل نہیں
خوبرو انسان کوئی ہو نہ ہو ،ہو نیک خو
حسن سیرت چاہئے صورت کے ہم قائل نہیں

غزل

تیر نظر کا ان کے نشانہ بنا ہے دل
برباد ہوگئے ہیں بڑی سادگی سے ہم
نایاب آج ہوگیا مٹی کا تیل بھی

پہلے چراغ گھر میں جلاتے تھے گھی سے ہم
ہوش اڑ گئے ہیں تار گریبان ہوگیا
مانوس اس قدر ہوئے دیوانگی سے ہم

غزل

نقب زن روز روزی کے ٹھکانے ڈھونڈ لیتا ہے
شکاری جس طرح تیر اور نشانے ڈھونڈ لیتا ہے
وہی دراصل ہوتا ہے سکندر وقت کا اپنے
جو لمحوں کے جزیرے میں زمانے ڈھونڈ لیتا ہے
جفا کش آدمی دنیا میں فاقہ کش نہیں رہتا
وہ زور بازو سے خزانے ڈھونڈ لیتا ہے
نہیں مسجد میں ملتے شیخ تو یہ ملا بیچارہ
بھٹک کر شہر کے سب بادہ خانے ڈھونڈ لیتا ہے
غنی کو کچھ نہیں پروا اگر لاکھوں بھی کھو جائیں
مگر کنجوس اپنے چار آنے ڈھونڈ لیتا ہے
ظفرؔ معمول ہے یہ موسم باراں کی آمد پر
چھپانے سر کو پنچھی آشیانے ڈھونڈ لیتا ہے

شعر

آج کل بس دوستی کو زور ہے
خون کا رشتہ ہوا کمزور ہے

نعتیہ قطعہ

جب تصور میں جبیں جلوہ یار آتا ہے
دل مضطر کو اسی وقت قرار آتا ہے
روح قدموں سے لپٹنے کو تڑپتی ہے ظفر
سامنے جب شہہ والا کا مزار آتا ہے

قطعہ

خدایا کرم پھر یہ اک بار کردے
نگاہ مسلماں کو تلوار کردے
نہ کر خوفِ باطل اٹھ اے مرد مومن
ظفرؔ ساتھ میں ہے تو یلغار کردے

نعت

عرش پر سب کے سب دیکھتے رہ گئے
حسن محبوب رب دیکھتے رہ گئے
چاند کی سمت کوئی نظر کب گئی
لوگ ماہ عرب دیکھتے رہ گئے
حق سے علم لدونی ملا آپ کو
اہل علم و ادب دیکھتے رہ گئے
آپ معراج کی رات عرشِ بریں
پہنچے کب آئے کب دیکھتے رہ گئے

☆☆☆

گردوں فاروقی بحیثیت طنز و مزاح نگار

مضمون نگار : سید وجاہت علی رفاقت علی

قلمی نام : پروفیسر فوز عرفانی

پیدائش : یکم جولائی ۱۹۶۸ء

تعلیم : ایم ای الیکٹریکل

پیشہ : جے ٹی مہاجن کالج (سینئر پروفیسر)

موبائل : 9545191890

ای میل : fauzirfani@gmail.com

اردو کے معروف طنزیہ، مزاحیہ و سنجیدہ شاعر مبین الدین فاروقی علاقہ خاندیش میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اپنے علاقہ میں خصوصاً طنز و مزاح کے حوالے سے اپنی شناخت رکھنے والے شاعر گردوں فاروقی ۱۹۲۶ء میں مارول کے ایک تعلیم یافتہ دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دارالسرور (برہانپور، مدھیہ پردیش) سے میٹرک پاس کیا اور اسمٰعیل یوسف کالج ممبئی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سینٹرل ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے جلگاؤں میں تقرر ہوا۔

حاضر جوابی، شگفتہ مزاجی، فطری شوخی، زبان میں سلاست، بے ساختگی، رنگینی و شیرینی گفتار آپ کے امتیازی اوصاف تھے۔ کم سنی سے ہی شاعری کی طرف میلان رہا جو دادا جان کی معیت میں مزید نکھرتا رہا۔ جس ظرافت سے شخصیت فطری طور پر معمور تھی اسی حس کو شعوری طور پر تیز تر بھی کرتے رہے اور علاقہ خاندیش میں طنز و مزاح نگاری میں اپنی پہچان مرتب کی۔ مزاح میں بلا کی برجستگی اور لہجہ وہ نیرنگ اور سحر انگیز کہ تھکے ماندہ کی تھکن، مایوس کی مایوسی کافور ہو کر اس میں تر و تازگی اور زندگی کی طرف واپسی کی تحریک جنم لیتی تھی۔ باضابطہ طور پر اس سپاہ سخن کو استاذ الاساتذہ حضرت خلیق برہانپوری کی رہبری و تربیت حاصل رہی اور یہ شرف تلمیذ اس قدر بابرکت رہا کہ استاد محترم کی بصارت ضائع

ہونے کے بعد استاذ موصوف کے دیگر شاگرد آپ سے اصلاح لینے لگے۔اس طرح علامہ خلیق صاحب کی سجادہ نشینی کا شرف بھی دستیاب ہوا۔گردوں فاروقی یقیناً ایک مستند و معتبر طنز و مزاح گو فنکار و شاہکار ہونے کا مکمل سامان اپنے نگارخانے میں سنبھالے ہوئے تھے مگر بقول غالبؔ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

کچھ اپنی ذاتی، کچھ اہل وطن اور کچھ اہل علم و اسباب کے تئیں بے نظری کے سبب یہ طنز و مزاح کا بے تاج بادشاہ اپنے سر کوئی تاج رکھے بغیر اس دار فانی سے ۲۲ رجنوری ۲۰۱۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔اناللہ وانا الیہ راجعون طنز و مزاح وہ فن ہے جس کا اکتساب صرف کتب بینی کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔بقول انور مسعود ؎

بڑے نمناک سے ہوتے ہیں انور قہقہے تیرے

شاعر جہاں مزاحیہ شاعری کے ذریعہ لوگوں کو گدگداتا ہے،مسکان و تبسم بکھیرتا ہے وہیں اس شاعری سے وہ اپنے اندر کا کرب واحساس بھی تقسیم کرتا ہے۔

ظرافت کا جوہر اکثر و بیشتر شعراء میں موجود ہوتا ہے لیکن کم ہی اس کی دریافت کرپاتے ہیں اور جو حس ظرافت سے بہرور ہوتے ہیں اسے عمل میں لاکر حیوان ظریف کہلاتے ہیں۔اسی لیے مولانا حالی نے غالب کو ان کی ظریفانہ شاعری اور خطوط کے حوالے سے حیوان ظریف کہا ہے۔مراد یہی ہے کہ ان کے حسی نظام میں ظرافت کو بڑا دخل ہے۔یہ وہ نعمت ہے جو حیوان ناطق کے علاوہ اور کسی کو میسر نہیں۔

شاعری کی اصطلاح میں طنز و مزاح دونوں کی تعبیریں جداگانہ ہیں۔میری ناقص رائے کے مطابق اور اس پر اکثر کا اتفاق بھی ہے کسی کے ساتھ مذاق کرنے کو مزاح اور کسی کا مذاق اڑانے کو طنز کہتے ہیں ۔دونوں میں وہی فرق ہے جو گدگدانے میں اور تھپڑ لگانے میں ہوتا ہے۔مزاح اس وقت جنم لیتا ہے جب فارغ البالی کا دوردورہ ہو،ہر جانب سکون و اطمینان چھایا ہو اور معاشرہ میں اعلیٰ انسانی اقدار، چند خرابیوں کے باوجود حیات انسانی پر حاوی ہوجائیں۔مزاح نگار کے دل میں ہمدردی اور انس و محبت کی فراوانی بے اعتدالیوں کو دریافت کرکے،ان کا علاج میٹھے شربت سے کرتی ہے۔جس سے معاشرہ سے آہ کی بجائے واہ کی آوازیں نکلتی ہیں۔اس بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:''مزاح اپنی دوربین نگاہ سے زندگی کی ناہمواریوں اور مضحک کیفیتوں کو دیکھ لیتا ہے جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔''

دوسرے ان ناہمواریوں کی طرف مزاح نگار کے ردعمل میں کوئی استہزائی کیفیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ ان سے محظوظ ہوتا ہے اور اس ماحول کو پسند بھی کرتا ہے جس نے ان ناہمواریوں کو جنم دیا ہے۔ چنانچہ ان ناہمواریوں کی طرف اس کا زاویہ نگاہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ مزاح نگار اپنے تجربے کے اظہار میں فنکارانہ انداز اختیار کرتا ہے اور اسے سپاٹ طریقے سے پیش نہیں کرتا۔

مزاح کے برعکس طنز کی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب معاشرہ بدحالی کا شکار ہو، امن وامان مفقود ہو جائے اور انسانی قدروں کی پامالی معمول جائے۔ ایسے ماحول میں لوگوں کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ مروت، زندہ دلی اور دیگر اوصاف حمیدہ دم توڑ کر طنز کو جنم دیتے ہیں۔ طنز اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مسائل کی اصلاح کے لیے میٹھی گولیوں کی بجائے نشتر کو استعمال میں لاتا ہے۔ طنز کے لیے ضروری ہے کہ یہ مزاح سے بیگانہ نہ ہو بلکہ کڑواہٹ کو شکر میں لپیٹ کر پیش کرے۔ دوسرے پردہ داری اور عیب جوئی کرتے وقت لطیف فنکارانہ پیرایۂ اظہار اختیار کرے۔

تیسر کسی خاص فرد کے عیوب کی پردہ داری کو زندگی اور سماج کی عالمگیر ناہمواریوں کی پردہ داری کا وسیلہ بنائے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا طنز، طنز نہیں رہتا محض پھبتی استہزاء یا ہجو کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

آیئے طنز ومزاح کے بے تاج بادشاہ گردوں فاروقی کے گلزار فن کی سیاحت کریں:

پہلے خالص مزاح سے معمور کیاریوں کی رعنائی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک مشاہدہ عام ہے کہ مزاحیہ شاعری میں فن شاعری کا فقدان نظر آتا ہے یوں لگتا ہے جیسے مزاحیہ شاعری میں فنکار کو سات خون معاف ہیں۔ شاعری میں کہیں تہہ داری اور ایک پختہ حس مزاح کم ہی محسوس ہوتی ہے لیکن گردوں فاروقی اپنے معاصر مزاح نگاروں میں ایک جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں جو بخوبی آپ کی بذلہ سنجی نیز فنکارانہ پیرایۂ اظہار سے واضح ہے۔ درج ذیل پیکر فن میں گردوں صاحب کی تمنا رہی ہے کہ پہلا مصرع بہ آواز بلند پڑھیں اور دوسرا دل ہی دل میں ادا کریں یا بڑی آہستگی سے ادا کریں، پھر اس نظم کا مزہ لیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

آیئے آیئے بخت آج میرا جاگا ہے — کیا ترے باپ کا گھر ہے جو چلا آیا ہے
آپ آئے تو مرے گھر میں بہار آئی ہے — تیری شامت ہی تجھے آج یہاں لائی ہے
آپ آئے ہیں علی الصبح شگون اچھا ہے — کیا یہاں باپ نے کچھ تیرے کمار کھا ہے
آپ کے نام کا تھا رزق مری ہنڈیا میں — تجھ سا بے شرم بھی ہوگا نہ کوئی دنیا میں

میرا خدمت کے سوا اور کوئی کام نہیں ــــ نہ سبق تجھ کو سکھایا تو میرا نام نہیں

یہ ایک طویل نظم بعنوان ''عادی مہمان'' سے ماخوذ ہے۔ دیکھئے مصرعہ ثانی میں خالص مزاح کی گنجائش کس ہنر مندی کے ساتھ پیدا کی ہے۔ یہ فاروقی صاحب کا کمال تھا کہ الفاظ کی ترتیب میں الٹ پھیر کر کے دو زبانوں یا لہجوں کو باہم خلط ملط کر کے کبھی مکالمہ کے انداز میں یا کبھی معکوس انداز بیان سے ظرافت کے پہلو نکال لیا کرتے تھے۔

جدت طرازی کی بانگیں سن سن کر فاروقی صاحب ایک روز محترم المقام عبدالقیوم راز کے مکان پر پہنچتے ہیں بڑے پیار سے راز صاحب کو شہزادۂ غزل کہا کرتے تھے۔ با آواز بلند بے تکلفانہ پکارتے ہیں ''ابے راز کے بچے! تو کیا جدید غزل کہے گا یہ مہا جدید غزل لے! اور پڑھ! یہ ایک تجریدی غزل ہے'' جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو خالص مزاح کی ایک بہترین مثال ہے۔ ہر چند کہ سبھی اشعار بے معنی اور مفہوم کے اعتبار لغو ہیں لیکن مقصود یہاں آپ کا نمونہ مزاح ہے کہ کس طرح روایت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے آپ نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ساتھ مزاحی سلوک کیا۔

لب منقار شجر مست کڑم ٹوں ٹوں ــــ شکم ریگ دروں نصف چرنگ چنگ چوں چوں
چرخ ٹھوکر تہہ پرواز مثلث گم صم ــــ پیٹ الجبرا گٹاگٹ در مولی سرسوں
پیکر خندق گل خلد جناں درزیدہ ــــ غم افسوس رواں دیدۂ یک مشت ستوں
بے ستوں آنکھ شب برگ خرد خاک بضد ــــ سخت سرپٹ دل گردہ کہ نہاں کل پرسوں
ناک ژولیدہ ستم نیر بحر رستم ــــ فیل محراب ہوا جھنجھٹ مے نوش کہ 'ہوں'

موصوف اپنے مزاحی انداز میں سنجیدہ طنز کے تیور کس طرح پوشیدہ رکھتے ہیں اس کی کچھ مثالیں پیش خدمت ہیں۔

نہیں یہ جھریاں چہرے کی آثار کہن سالی ــــ انہیں پگڈنڈیوں سے ہو کے گزرا ہے شباب اپنا
الجھا ہوا ہوں کشمکش موت و بقا سے ــــ مردہ ہی سمجھ لو مجھے تھوڑا سا بچا ہوں
ایک بوڑھا گدھا برسر پیکار گدھوں سے ــــ کہنے لگا ہو جاؤ گے پیوند زمیں کے
لاریب یہ انسان کی صحبت کا اثر ہے ــــ آپس ہی میں لڑ مرتے ہو، انسان کہیں کے!
تجھ کو یا رب کبھی اقبال نے یہ دی تھی رپورٹ ــــ ''تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے''
میں مگر سوچ رہا ہوں کہ ترے یہ بندے ــــ تیرے دربار سے نکلے تو کبھی ایک ہوئے
جب شعر کہہ سکا نہ فقیرا تمام عمر ــــ چوری کے فن سے مسئلہ آسان ہو گیا

اپنے کمال فن کے طفیل اک سخن پروف غزلیں چرا کے صاحب دیوان ہوگیا

مانا حضور آپ بھی روشن ضمیر ہیں میری دعا ہے آپ کو یہ وصف راس آئے

لیکن ضمیر اتنا بھی روشن نہ ہو کہیں جو روشنی میں آپ کے باطن کو کھینچ لائے

مسدس تو مسدس حالی کی نسبت سے جانی اور پہچانی گئی لیکن خماسی کی اصطلاح بھی کیا خوب اصطلاح ہے فاروقی صاحب کی!!!

خماسی

جوانی کی کڑکتی دھوپ اور افلاس کے سائے

کسی کی سرد مہری بے کسی کا خون کھولائے

دہکتی آرزو دل میں تڑپ کر سرد پڑ جائے

جو سائے سے گریزاں ہوں ملیں گر ایسے ہمسائے

تو اک انسان پھر انسان بن کر کیوں نہ پچھتائے

زندگی کی ایک تلخ اور سنجیدہ حقیقیت کو ایسے خوشگوار ظریفانہ انداز میں مضمون آفرینی کرتے ہوئے ذاتی اور عالمی المیہ کا اظہار گردوں فاروقی ہی کر سکتے ہیں اور خوب سے خوب تر کر سکتے ہیں۔ پیروڈی میں اپنی مثال آپ تھے۔ علامہ اقبال کے کلام پر پیروڈی کے نمونے ان کی شاعری میں اکثر دیکھے گئے ہیں۔ لب پہ آتی ہے، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، شکوہ جواب شکوہ و دیگر فن پارے ان کے کلام میں نظر سے گزرتے ہیں۔ ایک پیروڈی بطور مثال پیش ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا اے کاش سچ ہی ہوتا وہم و گماں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں میل رکھنا لیکن نہ سہہ سکے وہ دینا اذاں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی لہو کی ندیاں گل رنگ ہوگیا ہے ہندوستاں ہمارا

فاقوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں جامہ جامہ ہے چیتھڑوں کا قومی نشاں ہمارا

لاکھوں میں ہوں اگر ہم پہچان لے گی دنیا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کوشش تو کی بہت کچھ، کچھ اور کر کے دیکھو ممکن نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں ڈرتے ہیں گھر نہ پھونکے کوئی وہاں ہمارا

اقبال امن شاید اس دور میں رہا ہو گردوں سے کاش پوچھو سوز نہاں ہمارا

گردوں فاروقی کی فکری اساس معاشرہ کی اصلاح ہے نہ کہ تنقید برائے تنقید، لب ولہجہ شوخ مگر

باوقار ہے، لفظیات و احساسات میں، زبان و بیان میں، تراکیب و محاوروں میں نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ موضوعات کے تنوع اور انداز بیان کی رنگا رنگی اور اثر انگیزی کے باعث ان کا کلام معیاری ہے۔ ان کا شمار معتبر طنز و مزاح نگاروں میں ہونا چاہئے تھا مگر نہیں ہوا کہ تاحیات کوئی مجموعہ کلام شائع نہ کرا سکے کاش کوئی اس کام انجام دے کر اردو ادب کا محسن بن جائے۔

گردوں فاروقی نے اپنے باطن کے دکھ کو ظاہر کرنے کے لیے وسیلہ اپنے ماحول ہی کو بنایا اور طرز اظہار بھی وہ جو اپنے قاری کے لیے اکثر جراحت افزا ثابت ہوتا تھا۔ کلاسیکی اسلوب اختیار کرنے کے باوجود آپ نے علاقائی لب و لہجہ اور لفظیات نیز انگریزی الفاظ کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ علاوہ ازیں اس باکمال فنکار نے اپنے نگار خانے میں دو سو سے زائد نعوت مبارکہ پیارے نبی ﷺ کی بے پناہ عقیدت میں سجا رکھی ہیں جو یقیناً کسی شاعر کا ذخیرۂ آخرت ہے۔ دعا ہے کہ رب کریم موصوف کے لیے اس گنجینۂ نعت کو وسیلۂ نجات بنا دے نیز اپنے حبیب ﷺ کی قربت کا سبب بنا دے (آمین)

کسی قاری کو گردوں فاروقی کی شخصیت نیز شاعری کا تجزیہ کرنے میں آسانی خاطر ایک دو مکمل کلام پیش کر کے تبصرہ ملتوی کرتا ہوں۔

شکوۂ داماد بحضور سسرین شریفین

(ساس اور سسر کو سسرین کی اصطلاح سے نوازا ہے)

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں — فکر فردا نہ کروں مفلسی بردوش رہوں
نالۂ دل بھی سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں — ہم نوا میں کوئی بدھو ہوں کہ خاموش رہوں؟

جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ سسرین سے اے چرخ کہن ہے مجھ کو

چاپلوسی میں تری مانا کہ مشہور ہوں میں — تجھ سے نزدیک مگر دل سے ترے دور ہوں میں
ہوں میں خاموش مگر طیش سے معمور ہوں میں — کوری کہتا ہوں کہ یوں کہنے پہ مجبور ہوں میں

اے سسر شکوۂ داماد بھی تھوڑا سن لے
تجھ کو سننا ہی پڑے گا مرا شکوہ سن لے

مجھ سے پہلے تھا عجب تیرے مکاں کا منظر — کہیں جھاڑو کہیں جوتے کہیں کنکر پتھر
مثل آثار قدیمہ تھا یہ بوسیدہ گھر — ہوتا خدمت پہ رضا مند کوئی پھر کیوں کر

تو ہی بتلا کسی قابل تھا درو بام ترا
میری دن رات کی محنت نے کیا کام ترا

ایک بس میں ہی یہاں ہوں ترے دامادوں میں — حیثیت بیون کی ہے میری سسر زادوں میں
جانا پڑتا ہے دواخانوں میں بازاروں میں — کبھی کا لینا کے بدبو زدہ میدانوں میں

پھر بھی جچتا نہیں آنکھوں میں سسر زادوں کی
ایسی درگت نہیں دیکھی کہیں دامادوں کی

تو ہی بتلا کیا احسان یہ تجھ پر کس نے — باندھ رکھی ہے گلے میں تیری دختر کس نے
تیری قربت کے لیے چھوڑ دیا گھر کس نے — بے حیائی کا رکھا سینہ پہ پتھر کس نے

باوجود اس کے بھی اس گھر میں مری قدر نہیں
اس پہ کہتا ہے علاج اس کا بجز صبر نہیں

صفحۂ قلب کو غیرت سے مٹایا میں نے — عزت نفس کو دنیا سے اٹھایا میں نے
اپنی اولاد سے گھر تیرا بسایا میں نے — تیری بیٹی کو کلیجے سے لگایا میں نے

پھر بھی مجھ سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
میں وفادار نہیں تو بھی دل دار نہیں

اور بھی ہیں کئی داماد جو عیار بھی ہیں — کچھ نکھٹو ہیں تو ان میں کئی مے خوار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی نکھٹو بھی طرحدار بھی ہیں — سیکڑوں ایسے کہ سسرال سے بیزار بھی ہیں

بخششیں ہیں تیری بس ایسے ہی دامادوں پر
چشم تحقیر فقط میرے ہی ارمانوں پر

پہلے تھا میرے لیے پیار سے سینہ معمور — گفتگو میں بھی نمایاں تھا سلیقہ و شعور
یہ وہی دل ہے؟ کہ خالی کوئی پنجرہ ہے حضور — اڑ گئے چھوڑ کے پنجرے کو محبت کے طیور

اب وہ الطاف نہیں مجھ پہ عنایت نہیں
بات کیا ہے کہ وہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں ہے دامادوں پہ اب دولت دنیا نایاب — کیوں ہے سسرین کی الفت کا سمندر پایاب
سالیاں رہتی ہیں گم کیوں پس دیوار حجاب — سلجوں کے ہیں وہ نخرے کہ نہ حد ہے نہ حساب

طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے
میرے اللہ کیا خدمت صلہ خواری ہے

خود کے بیٹوں کی ہے اب چاہنے والی سسرال
پئے داماد ہے صرف خیالی سسرال
میں تو رخصت ہوا اوروں نے سنبھالی سسرال
پھر نہ کہنا ہوئی داماد سے خالی سسرال

میں تو سسرال میں یوں تھا کہ ترا نام رہے
تیری بیٹی تیرے گھر میں سحر و شام رہے

ہے جو دل میں ترے پائیگا تو ہر سو بھی وہی
فکر کا رخ وہی تیرا میرا پہلو بھی وہی
تو بھی داماد کسی کا ہے تیری خو بھی وہی
رشتۂ زیست میں ہوں میں بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی
اپنے داماد پہ یہ چشم غضب کیا معنی

اے خدا مشکل داماد کو آساں کردے
مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کردے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کردے
جملہ دامادوں کی تسکین کا ساماں کردے

جوئے خوں می چکداز حسرت دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

چاک داماد شکستہ کی نوا سے دل ہوں
دور سسرین کے ہر دام بلا سے دل ہوں
اب نہ مانوس کبھی عہد وفا سے دل ہوں
پھر نہ اس بادۂ مسموم کے پیاسے دل ہوں

گونج ہر سمت فضاؤں میں ہے فریادوں کی
لاج رکھ لے مرے اللہ تو دامادوں کی

تبصرہ کی طوالت کا اندیشہ اسے یہیں ملتوی کرنے کا اشارہ دے رہا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ یقیناً فاروقی صاحب اپنے مزاج میں انفرادیت رکھتے تھے۔ ہر چند طنز کے تیر چھوڑے کے باوجود شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ ہمیشہ اپنی تہذیب کو ترجیح دی۔ مزاح وطنزیہ شاعری میں یہ وہ فن ہے جو با آسانی دستیاب نہیں ہوتا۔ اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور خوب خوب ماجور فرمائے (آمین)

(آمد: ۱۹۲۶ء تا رخصت: ۲۰۱۳ء)

☆☆☆☆

روایتوں کا پاسدار: عشرت راشدیؔ جامنیری

مضمون نگار : ڈاکٹر اسد اللہ خان

قلمی نام : ڈاکٹر اسدؔ جامنیری

پیدائش : یکم اپریل ۱۹۷۲ء جامنیر

تعلیم : بی یو ایم ایس (پونہ)، ایم اے (انگریزی)، ایم اے (اردو)، بی اے (میوزک)

کتاب : اینگلو اردو ہائی اسکول کا قیام ایک اجمالی جائزہ

پتا : جامنیر بودوڑ روڈ، جامنیر، ضلع جلگاؤں 0937006276

یکم جون ۱۹۵۴ء کو جناب عشرت راشدی کا جنم جامنیر کے ایک متوسط گھرانے میں ہوا۔ والد بزرگ وار ایک دیندار انسان تھے۔ پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ جن میں عشرت سب سے بڑے تھے۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد گورنمنٹ کالج، پونہ سے ڈی ایڈ کیا اور اس کے بعد ضلع پریشد اسکول میں درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ تقریباً ۲۲ رسال ملازمت کرنے کے بعد لاابالی مزاج کی وجہ سے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا۔ جس میں کافی کامیابی بھی ملی۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی عشرت کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ جو انھیں استاد محترم حضرت راشد ادیبی مرحوم کے دیار تک لے گیا اور استاد محترم نے بھی عشرت کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں شرف تلمذ بخشا۔

ویسے تو شاعری میں عشرت نے نظمیں اور گیت بھی کہے ہیں لیکن جو کمال انھیں غزل پر حاصل تھا وہ کسی اور صنف سخن پر نہیں۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔

اس زمانہ میں دہرہ دون سے ایک مشہور ماہوار رسالہ ''ساز سرمدی'' نکلتا تھا۔ اس مشہور رسالہ میں

عشرت کا سب سے پہلا افسانہ ''قاتل کون؟'' شائع ہوا تھا جسے مقبولیت بھی کافی ملی تھی۔اس طرح عشرت کا شعری سفر جاری رہا۔مختلف رسالوں میں چھپتے رہے۔ریڈیو آکاش وانی جلگاؤں کے پروگراموں میں بھی بہت ادب واحترام سے بلائے اور سنے جاتے رہے۔آپ کی درسی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مہاراشٹر سرکار نے ۱۹۹۵ء میں آپ کو آدرش شکشک (مثالی مدرس) کے خطاب سے اس وقت کے ریاستی وزیر تعلیم سدھاکر راؤ نائک کے ہاتھوں نوازا گیا۔

مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی، رویندر جین، ظفر گورکھپوری، ساغر اعظمی، انجم جبلپوری جیسے ملک کے بڑے شعراء کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرنے کا شرف حاصل رہا۔ان کا شعری مجموعہ ''پاسنگ'' کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔جس کا اجراء ایک کل ہند مشاعرہ میں مہاراشٹر کے کابینی وزیر جناب گریش مہاجن کے ہاتھوں ۱۴ر نومبر ۲۰۱۵ء کو عمل میں آیا۔

لفظ ''پاسنگ'' کے لغوی معنی ہیں ترازو کے دونوں پلڑوں میں توازن کو برقرار رکھنے والی چیز چونکہ عشرت صاحب کی دو بیویاں ہیں اور زندگی بھر اپنی ازدواجی زندگی میں دونوں بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کے توازن کو ہر گھڑی برقرار رکھنے کی کوشش وسعی کرتے رہے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔اسی مناسبت سے اپنے مجموعہ کلام کو ''پاسنگ'' کا نام دیا۔

عشرت کی شاعری سخت گرم دھوپ میں ہوا کے سرد جھونکے کی طرح پھر وہی عالم وہی رنگ قدیم اور وہی طرز سال۔اس کی وجہ ان کا ماحول اور ان کے حالات رہے ہیں۔دراصل وہ جس خطہ ارض سے وابستہ تھے اور جن افراد کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزار رہے تھے وہ غالب واقبال کے شارح تو تھے نہیں۔وہ نہ تو معیاری ادبی زبان بولنے والے تھے اور نہ اہل زبان سے ان کا تعلق تھا۔وہ ایسی سیدھی سادی زبان بولتے تھے جس میں مقامی زبان کے اثرات بھی نمایاں رہتے۔ایسے ماحول میں اگر کوئی شاعری کا مداح ہو جائے اور شعر وسخن کی زلفیں سنوارنے کا حوصلہ کرے تو یہی بڑی بات اور بڑی خوبی ہوگی۔اس اعتبار سے عشرت راشدی بھی قابل مبارکباد ہیں اور ان کے احباب بھی جنھوں نے ان کی شاعری کی بھی قدر کی اور ان کی بھی۔

مری آنکھوں کے مقدر میں کہاں تھے عشرتؔ
اشک ان آنکھوں سے برسے ہیں جو گوہر بن کر

عشرت صاحب کے کلام میں اشتراکیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے عناصر تلاش کرنے کی کوشش بے معنی ہوگی۔انھوں نے روایت کی پاسداری کی لہٰذا ان کا سارا کلام بیانیہ اور روایتی انداز کا

ہے۔لیکن ان کی یہ روایت پسندی قابل تعریف ہے۔اس روایت پسندی میں کوئی برائی نہیں ہے۔اس لیے کہ انھیں جو ماحول ملا انھوں نے اس کا حق ادا کیا۔دیگر یہ کہ روایتوں کی پاسداری ہی اساس کامیابی ہے۔جس طرح بغیر بنیاد کوئی تعمیر ممکن نہیں اسی طرح روایتوں کی شاہراہوں کے بغیر کوئی سفر یا کسی منزل کا تعین ممکن نہیں۔

عشرت صاحب کے کلام میں روایت پسندی ضرور ہے لیکن وہ محض کنگھی چوٹی اور ذکر لب ورخسار تک محدود نہیں بلکہ وہ اپنے حالات و ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ اور عصری کرب کا اظہار بھی بخوبی کرتے ہیں۔ہر سمت انسانوں کا جم غفیر مگر انسانیت کا فقدان،وفا کے نام پر بے وفائی کا عام چلن دیکھ کر وہ کہہ اٹھتے ہیں :

بے درد زمانے کا چلن دیکھ رہا ہوں
بے روح وفاؤں کا بدن دیکھ رہا ہوں
ہر سمت نظر آتا ہے انسانوں کا جنگل
تاحد نظر سانپ کے فن دیکھ رہا ہوں

آج کے انسانوں میں خلوص وایثار کی بجائے مکروفریب اور یگانگت کی بجائے بیگانگی موجود ہے۔اسے دکھاوے اور تصنع سے اس قدر پیار ہے کہ اس کی پالیسی دورخی اور دوغلی ہوگئی۔وہ دوستی کے پردے میں دشمنی کرتا رہتا ہے۔

اخلاص سے گلے تو ملے ہیں ہزار بار
لیکن دلوں کے بیچ بڑا فاصلہ رہا
جن کی سلامتی کی میں کرتا رہا دعا
عشرت انہی کے ہاتھوں کا پتھر لگا مجھے

فی زمانہ ہمارا مشاہدہ ہے ہر شخص کسی نہ کسی سبب پریشان ضرور ہے۔عشرت صاحب مالی اعتبار سے کوئی مستحکم پوزیشن والے تو نہیں تھے اس لیے وہ بھی پریشان رہتے تھے۔ان کی زندگی درد وغم اور رنج والم کا شکار رہی جس کا ظاہری اثر ان کے کلام میں آنا ناگزیر ہے۔

جائے خزاں کہ آئے ایام رنگ و بو کے
کاغذ کے گل پہ عشرت کیوں کر بہار آئے
اب کون علاج غم حالات کرے گا

زاہد کی دعاؤں میں بھی تاثیر نہیں ہے

بات بن کر بگڑ گئی عشرت

اس کو قسمت کا فیصلہ کہیے

عشرت صاحب رنج وغم کی مار کھاتے رہے لیکن وہ نا تو دل برداشتہ ہوئے اور نا ہی ہار مان کر بیٹھے بلکہ انھوں نے حالات غم کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور تاریکی حیات کو نوفشاں بنانے کے لیے عزم وہمت کے چراغ روشن کرتے رہے۔

سازشوں کا یہ تسلسل یہ حوادث کا ہجوم

ایسے ماحول سے میں عزم جواں لے جاؤں

موت کے مد مقابل ہے یہ جرأت دیکھو

ایک تنکا ہے مگر سینہ سپر لگتا ہے

خون دل کی روشنائی سے غزل تحریر کر

آج کے ماتھے پہ آنے والا کل تحریر کر

عشرت صاحب نے صرف اپنے ہی دل میں عزم وہمت کی جوت نہیں جلائے رکھی بلکہ وہ تو اپنے دوست واحباب کو بھی حوصلہ مندی اور جرأت وعمل کا درس دیتے رہے۔ انھوں نے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھے رہنے کی بجائے ہاتھ پاؤں مارتے رہنے اور حرکت وعمل سے مقصدِ دلی حاصل کرنے کا حوصلہ جگائے رکھنے کی بات کی۔

گوہر کی ہے تلاش تو گہرائیوں میں ڈوب

ساحل پہ سیپیوں کے سوا اور کیا ہے

وقت قفس ساتھ لے کے اڑتے ہیں

جن کے پروں میں اڑان ہوتی ہے

قلب شکستہ میں زندگی کی ایک رمق اور دل رنجور ہی ایک جینے کی لکیر ہی تو ہے جو حالات کے ماروں کو زندہ بھی رکھتی ہے اور زندگی سے پیار کرنا بھی سکھاتی ہے۔ عشرت صاحب جہاں غم واندوہ سے پریشان رہے ہیں وہیں وہ زندگی کی رعنائیوں اور رنگینیوں سے لطف واندوز بھی ہوتے رہے ہیں۔ وہ حسب موقع زندگی کی دلکشی اور اس کی سحر انگیزی سے بحر طور حظ اٹھاتے رہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ وہ بھی تو ایک انسان ہی تھے اور انسان قدرت کا عظیم شاہکار ہے اور زندگی فطرت کی عظیم دین ہے

عشرت صاحب کی خوش طبعی ملاحظہ فرمائیے ۔

خواب میں وہ یوں نظر آیا کہ دل خوش ہوگیا
خواب ہی میں وہ ملا لیکن اکیلا تو ملا

اپنے آنچل میں چھپائے چاند تاروں کی چمک
زلف بن کر دوشِ دو عالم پر بکھر جاتی ہے رات

سرخ جوڑے میں یوں گلشن سے گزرتے کیوں ہو
آگ لگ جائے گی مہکے ہوئے گلزاروں میں

سہل ممتنع کی منزل سے بہ آسانی گزر جانا بڑا مشکل مرحلہ ہے یعنی چھوٹی بحروں میں اچھے اشعار نکال لینا اور مفاہیم ومطالب کا بخوبی ظاہر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہاں پختہ گو اور کہنہ مشق شاعر بھی پسینہ پسینہ ہوجاتے ہیں۔ تب کہیں قابلِ تحسین شعر کا عرق کشید ہوتا ہے۔ عشرت صاحب نے چھوٹی بحروں کو اس طرح اپنا کر وہ زندگی کے مختلف رخ پیش کرتے ہوئے اس راہ سے ہنستے کھیلتے گزر گئے۔

طوفاں کا انعام سکون ہے | طوفاں سے ٹکرا کے دیکھو
ڈھونڈنے والا کچھ نہ پائے گا | بھاگ مت تو سراب کے پیچھے
اس سے تمام عمر عجب فاصلہ رہا | ہر وقت ساتھ ساتھ رہا اور چھپا رہا
اس کی نیند بھی روٹھ جاتی ہے | جس کی بیٹی جوان ہوتی ہے
دو ندامت کے آنسو کسی کے | رخ بدل دیتے ہیں زندگی کے

پریشان حال افراد کو اکثر مقدر کا رونا روتے ہوئے اور تقدیر بدلنے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے سنا جاتا ہے۔ عشرت صاحب نے رنجیدہ رہ کر یا خندہ بہ لب ہو کر روتے ہوئے یا ہنستے ہوئے بہر کیف جس طرح بھی ہوسکا اپنی زندگی گزاری اور خدائے لاشریک کی مرضی پر راضی بہ رضا رہے۔ ان کا ایمان تھا کہ ایسی ایک طاقت ضرور ہے جو سارے نظام کائنات کو چلا رہی ہے اسی لیے اس پر ایمان رکھنا اور پیش آنے والے حالات پر صبر کرنا ہی اس کی بندگی واطاعت ہے۔

(پیدائش: یکم جون ۱۹۵۴ء وفات: ۱۶ر فروری ۲۰۱۳ء)

☆☆☆☆
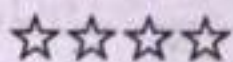
صداقت بیانی اور دل پذیر اسلوب کا شاعر:
راشد ادیبی جامنیری

ڈاکٹر اسد جامنیری

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

اردو زبان وادب اور خاص طور پر اردو شاعری کی عین خوش نصیبی ہے کہ بفضل خدا اس کی زلفوں کو سنوارنے اور اس پُر بہار چہرے کو مزید آب وتاب بخشنے کے لیے ہر دور ہر علاقے میں مختلف کمالات رکھنے والے اہل قلم اور صاحبان فکر ونظر مصروف عمل رہے ہیں۔ چنانچہ دہلی، لکھنؤ، رام پور و حیدر آباد جیسے ادبی مراکز سے دور رہنے کے باوجود مہاراشٹر کے سنگلاخ علاقہ خاندیش تک میں ہمیں ایسے باذوق، باصلاحیت و باشعور سخن سنج وفنکار نظر آتے ہیں جو اپنی اپنی ذہنی وفکری استعداد کے مطابق رشحات قلم کی سوغاتیں زمانے کی جھولی میں ڈالے چلے جارہے ہیں۔ ایسے ہی صاحبان ذوق اہل قلم میں خاندیش کے دور افتادہ شہر جامنیر کے جناب راشد ادیبی کا بھی شمار ہوتا ہے۔

پرائمری اسکول سے ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اینگلو اردو ہائی اسکول جلگاؤں میں داخلہ لیا۔ مسلسل کئی امراض کا شکار ہونے کے باعث تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ والد مرحوم نے اپنے دینی مزاج اور ذوق کے مطابق حضرت مولانا غیاث الدین مرحوم فارغ دار العلوم دیوبند کے پاس مقامی مکتب میں داخل کرادیا۔ حضرت مولانا سے گلستان و بوستان جیسی فارسی کی چند کتب نیز عربی زبان کی ابتدائی کتابیں ہی پڑھنے کا موقع مل سکا۔ والد مرحوم شعر وادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو کے سیکڑوں اشعار ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ احباب کی مجالس میں موقع محل کے اعتبار سے ایسے اشعار پیش کرتے تھے کہ لوگ تڑپ کر رہ جاتے تھے۔ میر سے لے کر غالب تک اردو کے تمام شعراء کا گہرا مطالعہ تھا اور فارسی میں گلستان وبستان مثنوی مولانا روم جیسی کتابیں تادمِ آخر

رحوم کے زیر مطالعہ رہیں۔

اس زمانے میں بزم ادب بھساول کے زیر اہتمام بے مثال کل ہند مشاعرے ہوا کرتے تھے۔خوش قسمتی سے موصوف (حضرت راشد ادیبی) کو بھی بھساول کے ان یادگار مشاعروں میں والد مرحوم کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملتا رہا۔حضرت راشد کامل یقین کے ساتھ یہ بات خود کہا کرتے تھے کہ والد محترم سے ورثے میں ملے ہوئے ذوق شعروادب کو شعر گوئی کی ترغیب بھساول کے مشاعروں سے ہی ملی۔

استاد محترم حضرت ادیب مالیگانوی مرحوم کے فیض تربیت نے ایسا اعتماد پیدا کردیا تھا کہ جن مشاعروں میں موصوف نے شرکت کی بڑی حوصلہ مندی اور خود اعتمادی سے اپنا کلام سنایا۔ ملکاپور میں کیفی اعظمی کی صدارت منعقدہ کل ہند مشاعرہ میں راشد کی ایک ابتدائی غزل پر کیفی اعظمی نے جس داد سے نوازا اس کے نقوش زندگی بھر جناب راشد ادیبی کے دل ودماغ پر باقی رہے۔کیفی اعظمی کی حوصلہ افزائی نے راشد کے ذوق سخن کو بڑا ہی فروغ بخشا ورنہ جامنیر کی سرزمین شعروادب کے اعتبار سے ایسی بنجر وسنگلاخ رہی ہے کہ یہاں شعر کہنا چٹانوں پر پھول کھلانے کے مترادف ہے۔

استاد محترم ادیب مالیگانوی نے ایک شعر اپنے اس ہونہار شاگرد کی شان میں کہا تھا ؎

جنت کی بہاروں کے سلام آتے ہیں اس کو

وہ پھول جو تپتے ہوئے صحرا میں کھلا ہے

بہر حال جن تیروں کی خلش نے حفیظ جالندھری سے اپنے دوستوں کی ملاقات کرادی تھی انہی تیروں سے راشد ادیبی کے دل پر لگے ہوئے زخموں سے خوشبوئے وفا پھوٹی اور ان زخموں کو وہ تازہ گلابوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کے مجموعہ کلام کا نام ''زخموں کے گلاب'' ہے۔

اسی مجموعہ غزلیات میں ان کی ایک نظم 'غم ملت' بھی شامل کی گئی ہے جو انجمن ہائی اسکول و جونیئر کالج کھام گاؤں سے متعلق ہے۔یوں سمجھئے کہ راشد ادیبی کا جذبہ احسان مندی اور شکرگزاری نظم کی شمولیت میں کارفرما ہے۔نظم میں ان کے کرم فرما بزرگوار حضرت ضیاء الحق خان صاحب مرحوم صدر انجمن کے تاثرات بھی پیش خدمت ہیں۔

حضرت راشد ادیبی عرصہ دراز تک خدمت شعروادب میں جگر سوزی کا مظاہرہ کرتے رہے۔وہ غزل بھی کہا کرتے تھے اور نظم بھی۔ان کا رنگ تغزل مجھے خاص طور پر اس لیے بھی پسند ہے کہ ان کی غزلوں میں سنجیدہ انداز فکر اور پاکیزہ وصالح جذبات واحساسات کی ترجمانیاں ملتی ہیں۔

کلاسیکی نظم وضبط اور ادب کی صالح روایات کے فنی رچاؤ اور پاسداری کے اہتمام نے ان کے کلام کو دل میں اتر جانے والی کیفیت عطا کی ہے اور اسے دلکش و پر تاثر بنا دیا ہے۔ یوں بھی غزل بڑی ظالم صنف ہے۔ خود جناب راشد فرماتے ہیں ؎

جگر کے سوز سے چمکا ہوا ہے فن میرا
جواب لائیں گی کیا صبح کی کرن میرا

یہ سوز جگر اور خون دل کا فیضان کہ ان کے کلام میں عجیب قسم کی کشش پائی جاتی ہے۔ گویا جناب راشد کی شاعری ہر اعتبار سے معیاری و معتبر ہے۔ زبان کی سادگی اور دلکشی ہر جگہ اپنی بہار و جادو دکھاتی نظر آتی ہے۔ چونکہ حضرت ادیب مالیگانوی کے سامنے زانوئے تلمذ خم کیا جو کہ بلند مرتبہ سخن پرواز اور کہنہ مشق استاد فن کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت کے حامل رہے ہیں۔ استاد کا رنگِ طبیعت اور انداز فکر ونظر ایک باذوق شاگرد میں بھی فطری طور پر سرایت کر جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ شاگرد راشد ادبی اپنے ادبی ہونے کا ثبوت بدرجہ احسن فراہم کرتے رہے ہیں۔ ان میں اپنے طور پر پھلنے پھولنے کی خداداد صلاحیت تو پہلے ہی سے موجود تھی اس پر استاد کی نگاہ توجہ اور فیضان صحبت نے ان کی صلاحیت کو خوب اجاگر کر کے جلا بخش دی۔ راشد صاحب کی ادبی شخصیت اور ذوق سخن گوئی کی تعمیر و تشکیل میں استاد مرحوم کے فیض نظر کا خاصہ عمل دخل پایا جاتا ہے۔

جناب راشد کی پختہ مشقی نے انھیں دلی جذبات واحساسات کی عکاسی کی بھرپور قدرت عطا کر دی ہے۔ ان کے یہاں فنکارانہ رچاؤ کے ساتھ عصریت کی مہک بھی ملتی ہے۔ کلاسیکی روایات کی بنیاد پر انہوں نے جتنا کچھ لکھا ہے اس میں صداقت بیانی اور دل پذیر اسلوب والی سخن سنجی جا بجا دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی نظر آتی ہے۔ ان کے منتخب کلام کا بغور مطالعہ کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کے یہاں فرسودہ مضامین والی حسن وعشق کی وارداتوں کا ذکر اور مجہول قسم کی خواب آگیں خیالات کا پرتو مطلق نہیں پایا جاتا۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

زخم نیزوں کا شگوفوں کے بدن میں دیکھا
ہم نے مقتل کا سامان صحن چمن میں دیکھا

میرے اشکوں پہ تو ہوتے ہیں شبنم کے غلاف
کون ہے جس نے مرا سوز دروں دیکھا ہے

ہندو، مسلم، نفرت، کینہ، شیخ و برہمن کی باتیں
جلتی دھرتی چیخ رہی ہے انسانوں کی بات کرو

ہے خزاں کی فصل، ظالم باغبانوں نے مگر
موسم گل میں بھی گلزاروں کو صحرا کردیا

کال ہے آنسوؤں کا آنکھوں میں
لب ہنسی کے لیے ترستے ہیں

نہیں ہے پھول دامن میں تو کیا غم
کسی کی راہ کا کانٹا نہیں ہوں

ہنسی بھی کرتی ہے انساں کو سرخ رو لیکن
جو آئے خنجر قاتل پہ وہ ہنسی کہاں

ہر نفس اک داغ تازہ، ہر قدم اک حادثہ
زندگی ہے مرگ پیہم اور جیئے جاتے ہیں لوگ

(سن ولادت: ۱۹۳۰ء پیشہ: زراعت)

☆☆☆☆

سراج انورؔ مصطفی آبادی:
منجمد اندھیروں میں روشنی کا متلاشی

مضمون نگار : شیخ افتخار احمد غلام رسول
تعلیمی قابلیت : ایم اے بی ایڈ (انگریزی)
پیشہ : معاون مدرس۔ اقرا شاہین اردو ہائی اسکول مہرون جلگاؤں
رہائش : محمدیہ نگر، جلگاؤں 9021561044

مرزا اسد اللہ خان غالب نے کہا تھا ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

معنیٰ و انطباق خصوصی میں اس شعر کا اطلاق صرف مرزا غالب پر ہوتا ہے مگر جب ہم سخنورانِ مشرقی خاندیش کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو غالب کے مذکورہ شعر کے مصرعہ ثانی کا اطلاق سراج انورؔ مصطفی آبادی پر ہوتا نظر آتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ سراج انورؔ کا ہے اندازِ بیاں اور۔

سراج انور قادری مصطفی آبادی کا نام سراج الدین عبد الرحمن، قلمی نام سراج انورؔ مصطفی آبادی۔ آپ کی ولادت یکم جولائی ۱۹۴۰ء کو مشرقی خاندیش کے شہر مصطفی آباد حالیہ نام چوپڑا میں ہوئی۔ آپ کے والد محترم کا نام عبد الرحمن اور والدہ کا نام روشن آرا تھا۔ سراج انورؔ نے اپنی بنیادی تعلیم شہر مصطفی آباد میں حاصل کی۔ بنیادی تعلیم کے بعد پونہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر اردو میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا۔ بچپن سے جوانی تک آپ کی زندگی نے شہر مصطفی آباد میں نکھار پایا مگر جب ذریعہ معاش کی بات آئی تو ذریعہ معاش نے آپ کو شہر املنیر سے وابستہ کر دیا۔ یہاں آپ نے ریٹائر

منٹ تک اردو پرائمری اسکول میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔

جس دور میں سراج انورؔ نے شعر گوئی کی ابتداء کی اس دور میں غزل اپنے روایتی انداز کے ساتھ مقبولیت کی سرحدوں کو چھو چکی تھی۔ بعد میں جدیدیت کے اثرات سے غزل کا لب ولہجہ بدلا۔ حقیقت کے ساتھ لفظی پیکروں اور محسوس استعاروں سے جدید غزل کی عمارت تعمیر ہونے لگی۔ چنانچہ سراج انور نے بھی غزل میں اس رنگ وآہنگ کو تو اپنا لیا مگر اپنے آپ کو روایتوں سے بھی جوڑے رکھا اور اس بات کی تلقین نئی نسل کو بھی کی۔ سراج انور فرماتے ہیں:

مہکتی رت میں یہ سوغات چھوڑ جاؤں گا

گل وسمن سے نشانات چھوڑ جاؤں گا

جدیداں میں جو رنگ و نور ہے انورؔ

انھیں کے نام روایات چھوڑ جاؤں گا

تخلیقی ادب کے تعلق سے سراج انورؔ کا خیال تھا کہ ادب کی تخلیق نہایت خلوص اور سچے جذبہ کے ساتھ کی جانی چاہئے۔ کیوں کہ شاعر زندگی کی حقیقتوں کو اپنی ذات کے تعلق سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے ذاتی تجربات اور وقت کے تقاضے اس کے احساسات اور فکر وبصیرت کا جز بن جاتے ہیں۔ شاعر جب ذات اور کائنات کا عرفان حاصل کرتا ہے تو زندگی اپنے ہزار رنگوں کے باوجود اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔

شہر املنیر میں رہتے ہوئے وہاں کے پر خلوص دوستوں، قابل احترام بزرگوں اور پیارے بچوں کی صحبت میں آپ نے شعر گوئی کی ابتداء کی۔ اس مرحلہ میں آپ کو حضرت علامہ ابرؔ احسنی مرحوم سے فنی رہنمائی حاصل ہوئی۔ موصوف کے انتقال کے بعد سراج انور نے اپنے شعور وفکر کو اپنا رہنما بنا لیا۔ موصوف ایک بہترین اور مثالی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ ایک متین، ذہین اور طبع زاد شاعر بھی تھے۔ اپنے گرد وپیش پر نظر رکھتے ہوئے اپنی تخلیقی مسافتیں طے کرتے ہوئے نہایت متانت، ضبط اور توازن کے ساتھ عصری رجحانات کا ساتھ دیتے ہوئے اور اپنی فکری سطح کو بلند کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہی چیز ان کے بیدار ذہن شاعر ہونے کی پہچان ہے۔

سراج انورؔ مصطفی آبادی کی تین کتابیں ''ورق ورق'' (غزلوں کا مجموعہ)، ''بچوں کی پھلواری'' (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) اور ''فیضان اولیاء'' (اولیائے کرام کے حالات زندگی کا مجموعہ) منظر عام پر آچکی ہیں اور ''لامکاں'' (مجموعہ غزلیات)، ''لب گفتار'' (مجموعہ نظم)، ''اظہار'' (ہائیکو کا مجموعہ

)، ''کہکشاں'' (کہانیوں اور نظموں کا مجموعہ۔ بچوں کیلئے) اور ''آب کوثر'' (مجموعہ نعت) زیر ترتیب تصانیف ہیں جو زیور طباعت سے آراستہ ہونے سے رہ گئیں۔ سراج انور کو اپنے والدین اور اساتذہ سے بڑی عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی اوّلین تصنیف ''ورق ورق'' کو اپنے والدین (جن کی عملی زندگی نے موصوف کو خنداں پیشانی کیساتھ حوادث و مصائب کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کیا) اور اساتذہ کرام (جنھوں نے زمانہ طالب علمی سے لے کر ایک فنکار بننے تک آپ کی رہنمائی فرمائی) کے نام سے منسوب کر دیا۔ عمر کی ۴۸ ویں منزل پر سراج انورؔ کے پچیس سالہ تخلیقی سفر کا اوّلین نچوڑ ''ورق ورق'' کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ اس تصنیف اور اس میں موجود اشعار کے تعلق سے موصوف نے کبھی کوئی دعویٰ تو نہیں کیا لیکن جب ہم اس تصنیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو شعر گوئی میں آپ کا مسلک یہی سمجھ میں آتا ہے کہ صحت مند اقدار کی تلاش اور تعمیری ادب کی سمت پیش رفت کی جائے۔ نئے اسلوبِ غزل نئے احساسات کے ترجمان ہوں۔ جدید غزل میں انھیں احساسات نے شاعر کے تخیل میں ڈھل کر اشعار کی صورت گری کی ہے اور لہجہ کی ایمائیت اور رمزیت کے ساتھ اثر آفرینی جیسی خوبیوں نے اشعار اور شاعر دونوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ اپنی والدہ سے اپنی عقیدت کا اظہار موصوف نے اسطرح کیا:

خوش نصیبوں ہی کو شئے بیش بہا ملتی ہے
سارے بیٹوں کو کہاں ماں کی دعا ملتی ہے

ماضی سے حال تک بدلتی ہوئی معاشرتی سوچ کے تعلق سے یوں گویا ہوتے ہیں:

تیر رکھتے نہ سلیقے سے کمان رکھتے ہیں
لوگ اسلاف سا کردار کہاں رکھتے ہیں
شمع اخلاص زمانہ میں فروزاں تھی کبھی
دل میں اب لوگ عداوت کا دھواں رکھتے ہیں

جیسے ہیں تیر و کماں کے سلسلے ایسے نہ تھے
کشمکش ہوتی تھی لیکن تفرقے ایسے نہ تھے
آدمی ملتے ہیں ان پر دل سے دل ملتا نہیں
اس سے پہلے بستیوں کے راستے ایسے نہ تھے

باتوں میں زہر تھا نہ کمانوں میں تیر تھے
کیا وقت تھا کہ لوگ بھی جنت نظیر تھے
سادہ لباس ، سادہ قلم ، سادہ لوحِ دل
بستی میں لوگ ایسے بھی روشن ضمیر تھے

جب موصوف نے کبھی عدم عدل اور ناانصافی کا مشاہدہ کیا تو کہا:

یہ کیسا عدل ہے انسان دیکھتا ہی نہیں
سزا پا گیا وہ جس کا قصور تھا ہی نہیں

سراج انورؔ نے جدید فکر وخیالات کو اپنانے کا خود اعتراف کیا ہے لیکن آپ نے کبھی جدیدیت پسندی کے منفی پہلوؤں پر ان الفاظ میں تنقید بھی کی:

مجھ کو تنہا چھوڑ کر یادیں پرانی لے گیا
یوں کتابِ دل سے وہ اپنی کہانی لے گیا
اب کہاں امن و سکون انورؔ نیا طوفان ہے
کون ان شاخوں سے پھولوں کی جوانی لے گیا

سراج انور کو بچپن ہی سے مطالعہ کا بڑا شوق رہا تھا۔ اسی شوق نے آپ کو تدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے پونہ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر اردو سے بی۔اے اور ایم۔اے کرنے کی تحریک دی اور آپ نے یہ دونوں ڈگریاں امتیازی نمبرات کے ساتھ حاصل کیں۔ اپنے اس شوق کا اظہار ان اشعار کے ذریعہ کرتے ہیں:

تمازتوں کا قلق ثواب کا رشتہ
ازل سے ہم کو ملا آفتاب کا رشتہ
حرف حرف اترتا ہوں میں ہی لفظوں میں
ورق ورق ہے مجھ سے کتاب کا رشتہ

سراج انورؔ نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ موجودہ اور آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کی تاریخ کو کبھی فراموش نہ کریں بلکہ اس سے اپنے مستقبل کا لائحہ عمل طے کریں۔ اس فکر کا اظہار اس طرح کیا:

ایک قطرہ کی طلب کیوں ہے سمندر سوچنا
پیاس کے صحرا سے کل تو بھی گزر کر سوچنا

اپنے ماضی کے دھندلکوں سے ذرا لینا سبق
آنے والی نسل کے بارے میں بہتر سوچنا

سراج انور کی شاعری کے مسلک کا تذکرہ پیچھے گزرا ہے کہ آپ صحتمند اور تعمیری شاعری کے حامی تھے۔ مندرجہ ذیل شعر آپ کے اس مسلک کا حامی نظر آتا ہے:

خیال و فکر کے پیکر کو جو اُبھار نہ دے
وہ فن ہے کیسا زمانہ کو جو شاہکار نہ دے

''بچوں کی پھلواری'' کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سراج انور مصطفی آبادی کو اپنی ابتدائے شعر گوئی سے ہی بچوں کیلئے نظم کہنے کا شوق رہا تھا۔ آپ کی نظمیں اور کہانیاں ''غنچہ، بجنور'' اردو ٹائمز اور انقلاب کے صفحات کی زینت بنتی رہیں۔ ''بچوں کی پھلواری'' میں شامل نظمیں ایک مقصد رکھتی ہیں مثلاً یہ کہ بچے اچھے انسان بن سکیں۔ خاص طور پر ان میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ پیدا ہو، قومی ایکتا کو فروغ حاصل ہو۔ بعض نظمیں بچوں میں کچھ کرنے کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ تاریخی موضوعات پر کہی گئی نظموں میں یہ مقصد کار فرما ہے کہ ہمارے بچے اپنے بزرگوں کے کارناموں سے واقف ہوں اور ان پر فخر محسوس کریں۔ بچوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ ایک عظیم تہذیب اور مثالی ورثہ کے مالک ہیں۔ ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور بھارتی سماج میں بچے ہم رنگ ہوں اور اسطرح وہ قومی وحدت میں اپنا مقام بنالیں۔ مذکورہ تمام خیالات کی حمایت میں سراج انور کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بہت شوق سے میں پڑھوں گا لکھوں گا
وطن کی بھی خدمت ہمیشہ کروں گا
مدد میں غریبوں کی کرتا رہوں گا
میں ہمدرد اور نیک انسان بنوں گا

نو نہالو! ہر قدم پر کامراں ہم لوگ ہیں
ہم سپاہی ہیں وطن کے پاسباں ہم لوگ ہیں

دیش کو اونچا اٹھائیں گے ہم
اس کی قسمت بھی بنائیں گے ہم
کام یہ کرکے دکھائیں گے ہم

رات اندھیری دور سویرا

آؤ ہٹائیں گھور اندھیرا

آندھی سے ہم خوف نہ کھائیں

سب کو سیدھی راہ دکھائیں

دیے جلائیں دیے جلائیں

لاکھ ہوں طوفاں نہ گھبرائیں

بچوں کی اسلاف کی تاریخ سے جوڑنے کیلئے مختلف نظمیں مثلاً ''چاچا نہرو''، ''ابوالکلام آزاد''، ''دلتوں کے محسن'' اور ''شیر دکن ٹیپو سلطان'' وغیرہ نظمیں سراج انور نے تخلیق کیں۔ شیر دکن ٹیپو شہید کے تعلق سے فرماتے ہیں:

عدل و انصاف کا حامی تھا جواں شیر دکن

تھا تعصب سے بَری اور تھا ہمدردِ وطن

مسجدوں کیلئے دیتا تھا جہاں وہ جاگیر

مندروں کو بھی عطا کرتا تھا زر و مال کثیر

سراج انور مصطفی آبادی کی ایک تصنیف جو زیور طباعت سے مرصع ہو چکی ہے وہ ہے ''فیضان اولیاء''۔ اس کتاب میں موصوف نے علاقۂ خاندیش، برار، دکن، مغربی مہاراشٹر اور گجرات کے اولیائے کرام کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف کے تعلق سے موصوف خود اعتراف کرتے ہیں کہ اولیاء اللہ سے عقیدت و محبت رکھنے والے خوش عقیدہ عوام، فرزندان توحید اور برادران اسلام کی بڑی تعداد ان پاکیزہ ہستیوں کے متعلق جاننے اور ان کی پاکیزہ تعلیمات کو سمجھنے کا عزم رکھتی ہیں۔ ان عقیدت مندان اولیاء کے ذوق و شوق کے پیش نظر حضرت علامہ مولانا کلام القادری مصباحی کے دل میں تحریک پیدا ہوئی۔ مولانا نے سراج انورؔ سے ذکر کیا اور مولانا کی تحریک سے موصوف نے اولیائے کرام کی زندگی کے حالات پر مبنی ''فیضان اولیاء'' ترتیب دی۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اولیاء اللہ نے اپنے حسن کردار سے عالموں کو باعمل بنایا۔ درس و تدریس اور تحقیق و تصانیف کے ذریعہ اسلام کو ہر دلعزیز مذہب بنایا۔ دوسری طرف مسلمانوں کے ایمان کو مضبوط کیا۔ ایک طرف وہ علم و فضل۔ ذکر و اذکار اور حق کی دعوت دیتے رہے تو دوسری طرف ان کا فیضِ باطنی اور روحانی طاقت اہل علم و بصیرت کی رہنمائی کرتی رہی۔ یہ عظیم کارنامہ کسی دانش گاہ یا

یونیورسٹی کے ذریعہ بھی ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ کارنامہ صرف اولیاء اللہ کی طرح کی باکمال اور صاحب کردار نیز فیوض ظاہری و باطنی رکھنے والی ہستیاں ہی کرسکتی تھیں۔ سراج انورؔ نے محسوس کیا کہ ہماری نئی نسل کے ذوق وشوق اور شعور و بصیرت کی آبیاری ضروری ہے۔ اس لئے انھوں نے ان بزرگ و عالی مرتبت اولیاء و اصفیاء کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا اور ان تمام کی تصانیف کی تلاش کی اور ''فیضان اولیاء'' کی صورت میں ازسرنو منظر عام پر لائی۔

سراج انورؔ چونکہ مصطفی آباد سے تعلق رکھتے تھے اسلئے آپ کو حضرت شاہ مصطفی چشتی قدس سرہ سے خاص عقیدت تھی۔ حضرت کے تعلق سے فرمایا:

گنبدو مینار نقشِ رفعت و عرفان ہے
مرکزِ قلب و نظر یہ روضۂ ذیشان ہے
اس سخی در کے ہزاروں ملتے ہیں امیدوار
مصطفی چشتی کا جاری آج بھی فیضان ہے

سراج انور کو تمام ہی اولیائے کرام سے بہت زیادہ عقیدت تھی اور اپنی اس عقیدت کا اظہار انھوں نے اپنا اشعار کے ذریعہ کیا مثلاً حضرت سید شاہ محمد صادق حسینی کے تعلق سے فرماتے ہیں:

سید صادق حسینی معرفت کے آفتاب
تازہ تر ہے تیرے گلستاں میں شریعت کے گلاب
چشمِ الطاف و کرم کا فیض ہوجائے اگر
اک چراغِ راہِ منزل بھی مثل ماہتاب

آفتاب کوکن حضرت مخدوم علی ماہمی کے تعلق سے کہا:

آپ نے روشن کیا علم و ہدایت کا چراغ
ظلمت الحاد میں چمکا ہے وحدت کا چراغ
حضرت مخدوم اس تفسیر رحمانی کے ساتھ
تا ابد پُر نور ہے تیری ولایت کا چراغ

اولیائے برہانپور کے تعلق سے یوں گویا ہوتے ہیں:

جائے عرفان منزلِ روحانیت
ہے یہ شہرِ اولیاء دارالسرور

مطلع انوار ہے انورؔ یہی

ہے ضیائے اوّلین برہانپور

اولیائے گجرات سے اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

منزلِ صبرو قناعت ہے یقینِ اولیاء

ہے یدِ بیضا کا مظہر آستینِ اولیاء

ہے یقیناً چشمۂ روحانیت سے فیضیاب

سرزمین گجرات کی ہے سرزمینِ اولیاء

۴۵ رسال کے عرصۂ دراز تک اردو کا یہ سپاہی اپنی تخلیقات کے ذریعہ سے نہ صرف اردو کی خدمت انجام دیتا رہا بلکہ دینِ حق کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیتا رہا اور ۱۵ راگست ۲۰۰۸ء کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی۔

میری صدائیں خضر کے کانوں میں ڈال دے

اندھے کنوئیں سے کوئی تو باہر نکال دے

زندہ رہے گا نام زمانے میں تا ابد

انورؔ ہو کام ایسا کہ دنیا مثال دے

☆☆☆☆

غنائیت، سلاست، سوز و گداز کا شاعر:
منظر صدیقی مصطفی آبادی

مضمون نگار	:	شیخ ارشد احمد عبدالرزاق
پیدائش	:	۹ رمئی ۱۹۶۸ء مصطفی آباد، چوپڑا، ضلع جلگاؤں
تعلیم	:	ایم اے بی ایڈ (ڈی ایڈ، پارنگت) معلم دینیات
تحقیقی مقالہ بعنوان	:	خاندیش میں اردو صحافت، ممبئی یونیورسٹی
پیشہ/مصروفیت	:	مدرس (اعلیٰ تحتانوی اردو اسکول برائے طالبات، چوپڑا، ضلع جلگاؤں)
رہائش	:	نزد عائشہ مسجد، مصطفی کالونی، چوپڑا 9970788988

منظر صدیقی کا اسم گرامی حسام الدین اور ان کا مولد و مسکن مصطفی آباد تھا۔ وہ فقیر محمد شیخ امیر کے فرزند ارجمند تھے جو لطیف مصطفی آبادی کہلائے۔ وہ حکیم بھی تھے بلکہ وہ اچھے نباض مشتہر ہوئے۔

منظر صدیقی مصطفی آبادی کو سخن وری تو ارثاً منتقل ہوئی تاہم انہوں نے استاد شاعر نیر مصطفی آبادی سے اصلاح سخن لی۔ طبع موزوں اور ادبی ماحول کے سبب وہ کم وقت میں ہی فارغ الاصلاح ہو گئے۔ بعدازاں اس فن میں اس قدر طاق ہوئے کہ نیر صاحب کے جانشین قرار پائے۔ وہ اچھا خاصہ حلقۂ تلامذہ رکھتے تھے۔ جس میں مرزا مصطفی آبادی، محشر مصطفی آبادی، منان مصطفی آبادی، احمر مصطفی آبادی، نور شاہ مصطفی آبادی جیسے قابل ذکر شعرائے کرام شامل تھے۔

منظر صاحب کئی خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان ہی میں سے ایک بلند و مسحور کن آواز کا ہونا بھی تھا۔ وہ اپنی خوش الحانی کے باعث ترنم۔ سے پڑھتے اور مشاعروں میں چھا جاتے۔ انہوں نے کئی مشاعروں میں اپنا کلام پیش کیا نیز مشاعروں کی مسند صدارت پر جلوہ افروز بھی ہوئے۔ بالخصوص مشاعروں کے شہر بھساول، جامنیر اور سورت جیسے مقامات پر ان کی صدارت میں مشاعرے پڑھے گئے۔

منظر صدیقی کا کلام متاثر کن ہے۔ان کے پوتے انیس محشری ہیں جو خود بھی شعر و ادب کا اچھا شغف رکھتے ہیں اور وہ اس مضمون کے مواد کے ماخذ بھی ہیں۔ان کی ہی کے توسط سے ہمیں منظر صاحب کا چیدہ چیدہ کلام میسّر ہوا، تو معلوم ہوا کہ موصوف نے بیشتر اصناف سخن میں طبع آزمائی فرمائی تھی۔بالخصوص حمد، نعت، مرثیہ، منقبت، سلام اور غزل۔غنائیت، سلاست، سوز و گداز علاوہ ازیں روایت کی پاسداری ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

دکن اردو مرثیہ نگاری کا مبدا رہا ہے۔عاشور خانے یعنی امام باڑے کی روایت شعیت سے راہ پائی۔خاندیش میں فاروقی سلاطین کے عہد میں تو نہیں البتہ ان کے بعد عہد مغلیہ اور آصف جاہی قلمروی میں ایران نژاد شیعہ امرا نے مرثیہ گوئی کو مروج کیا۔مجالس عزا برپا کی جاتی، جہاں 'جنگ نامے' سماعت ہوتے اور مرثیہ خوانی کی جاتی۔بعد ازاں بیسویں صدی میں سوز و نوحے اور سلام کی مختصر اصناف نے طویل مرثیوں کی جگہ لے لی۔سلام میں واقعات کربلا، دنیا کی بے ثباتی، صبر و توکل جیسے مضامین باندھے جاتے ہیں۔اخلاقی تعلیم اور شہیدان کربلا کے سبب سلام مقبول عام ہو گیا۔منظر صاحب نے بھی اس صنف سخن میں مہارت پائی تھی اور ایک ایسا کلام نظم کیا جو معرّا ہے۔

ہر اک عدو ہلاک حسام دودم ہے	''طور اس کلام کا دل حاسد کو سم ہوا''
لکھا ہے رسوئے سرور والا کا وہ کمال	مصرع ہر اک سلام کا سرو ارم ہوا
مداح گو امام امم کا ہوا ہے دل	اس طرح حوصلہ دل حاسد کا کم ہوا

شعرا اپنی جودتِ طبعی ظاہر کرنے کے لیے کلام میں ان حروف کو ٹانک دیتے ہیں جن کے نیچے نقاط ہوں یا اس کے برخلاف اوپر نقطے ہوں۔کلام کا یہ وصف صنعت منقوط سے معروف ہوا ہے تاہم چنندہ ایسے قادر الکلام بھی ہوتے ہیں جو ان کے برعکس غیر منقوط یا معرّا حروف کی کڑیوں سے کلام ترتیب دیتے ہیں۔یہ خوبی صنعت غیر منقوط یا صنعت مہملہ یا صنعت عاطلہ کہلاتی ہے۔مذکورہ صنعت میں کہا گیا درج بالا کلام جہاں منظر صاحب کی نکتہ آفرینی پر دال ہیں وہیں ان کی نشست الفاظ کی استعداد کا آئینہ دار بھی۔

درحقیقت اس وقت خاندیش میں انعقاد ''مسالمہ'' کی روایت تھی۔واضح ہو کہ جس طرح غزل گوئی کی بزم ''مشاعرہ'' ہوتی ہے ٹھیک اسی نہج پر وہ محفل جہاں سلام گوئی پر داد وصول کی جاتی ہے اسے 'مسالمہ' کہتے ہیں۔روایت یہ تھی کہ ہر سال محرم الحرام کے یوم عاشورہ اور اس سے ایک روز قبل مہتمم بالشان 'مسالمے' منعقد کیے جاتے تھے جہاں کہنہ مشق شعرا مدعو کیے جاتے جو معیاری و متغزلانہ سلام

پیش کرتے تھے۔ منظرؔ صدیقی بھی ان میں بصد شوق شریک ہوتے اور شہدائے کربلا کے حضور سلام پیش کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

سلامی آج مقتل میں شہید پنجتن آئے
شہادت کے نشے میں جھومتے تشنہ دہن آئے

الٰہی بے کفن ہے رن میں اس مظلوم کا لاشہ
کہ جس کے واسطے خلد بریں سے پیرہن آئے

فرشتے چوم لے ہر لفظ منظرؔ فرطِ الفت میں
بوقت مدحِ سرور جو میرے لب پر سخن آئے

شاعر و شاران شہرہ آفاق حقائق سے چشم پوشی نہیں کر سکے جو معاشرت پر براہ راست اثر انداز ہوئے نیز انسانیت پر مثالی اخلاقی اقدار کے ان مٹ نقوش مرتسم کیے۔ ان ہی میں ایک واقعۂ کربلا بھی ہے۔ حساس قلم کار اس معرکے کو انسانیت کی فلاح و بہبود اور صالح معاشرے کی تعمیر کے لیے سرچشمۂ ہدایت جان کر اپنے فن میں برتتا ہے۔ خاندیش کے شعرا کے یہاں یہ معرکہ حدیث غم ہے اور حق و باطل، خیر و شر، جبر و استبداد اور ظالم و مظلوم کا واضح استعارہ بھی۔ منظرؔ صدیقی نے اس روایتی انداز میں شہدائے کربلا کا مضمون باندھا ہے۔ ان کے رثائی کلام کے چنندہ نمونے حاضر ہیں:

فضائے آسمانی مظہرِ خونِ شہادت تھی
شفق کیا چیز ہے سارے فلک کی سرخ رنگت تھی

سرِ شبیر نیزے پر تھا یا خورشیدِ محشر تھا
زمینِ کربلا واللہ تصویرِ قیامت تھی

بہر پہلو ہنسا دیتا تھا شہ کو درد اٹھ اٹھ کر
انوکھا زخم تھا ہر اک انوکھی اس کی لذت تھی

منظرؔ کے یہاں اس نوحۂ غم کو نشاطِ غم میں تبدیل کرنے کا ہنر ہے۔

مقتل میں علی کے پیارے سے اعدا جو بغاوت کر بیٹھے
جس کام کی جرأت کرنی نہ تھی اس کام کی جرأت کر بیٹھے
لب بند نظر نیچے سر خم مقتل میں شہادت سے پہلے
ہر عضو بدن فرزند علی پابند شہادت کر بیٹھے

منظرؔ صاحب زود گو شاعر تھے۔ موصوف نے سیکڑوں اشعار قلم بند کر مصطفی آباد، خاندیش کے رثائی ادب کو مالا مال کیا۔ چوپڑا کی میلاد پارٹیوں کے سبب ان کے کئی اشعار زبان زد عام ہوئے۔ منظرؔ صاحب نے مرزا غالبؔ کی مشکل زمینوں پر بھی طبع آزمائی فرمائی۔ مثلاً " کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور" اس مشہور زمانہ مصرع پر یوں خامہ فرسائی کی

سوزِ غم شبیر میں ہے طرز فغاں اور
اڑ جائے نہ اے پیر فلک تیرا دھواں اور

وہ ضعف وہ صدمے وہ ستم اہل جفا کے
شبیر کو تھا سر کا اٹھانا بھی گراں اور

منظرؔ صدیقی نے اسی زمین میں مدحتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے یہ اشعار لکھے۔

توحید کے نغموں کی ہے تاثیرِ بیاں اور — مسرور ہوئے جاتے ہیں سن کر دل و جاں اور
میں گلشنِ طیبہ کی فضاؤں پہ ہوں صدقے — اے شیخ مبارک ہو تمہیں باغِ جناں اور
یہ آگ محبت کی بجھائے نہیں بجھتی ! — گرتے ہیں جو آنسو تو نکلتا ہے دھواں اور
پھر ہولے برسات برس جائینگے موتی — مدحِ دُرِ دنداں میں کھلی میری زباں اور

مرزا غالبؔ نے اپنی طبع کے متعلق کہا تھا کہ

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

جب کہ منظرؔ صدیقی کا بیان یوں ہے کہ

منظرؔ غمِ دِل موجِ تخیل میں بہادوں — دے دے جو ذرا ساتھ میری طبع رواں اور

درحقیقت اصناف ادب میں نعت سب سے مطہر، محترم اور معتبر شمار کی جاتی ہے۔ نعت سرور عالمؐ نہایت سرشار موضوع ہے۔ رسول کریمؐ کے اوصاف، فضائل، شمائل، فضائل بیانی میں منظرؔ صاحب نے اپنی صلاحیتوں کو خوب آزمایا۔ عشقِ رسولؐ میں سرشار وہ اپنی بزم گیتی کو یوں سجاتے سجاتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

اصنام حرم کی قسمت کا گردش میں ستارہ آہی گیا — توحید کا سورج کُفر شکن اللہ کا پیارا آہی گیا
روشن ہوئیں شمعیں نورانی ذرات نے پائی تابانی — تاریکیٔ بزم گیتی میں وہ انجمن آرا آہی گیا

یہ نعت ان کے فرزند جناب محشرؔ منظری مصطفی آبادی کے مجموعہ کلام 'گل خنداں' کے مشمولات میں بطور تبرکات شائع ہوئی ہے۔ نعتِ رسولِ خدا کے جستہ جستہ اشعار

حوروں کی تمنا ہے دل میں نہ آرزوئے باغ جنت کی — مشتاق نگاہوں کو مولا روضہ کا نظارہ کافی ہے
گھر سے جب سوئے گلشن طیبہ عاشقانِ نبی نکلتے ہیں — دید کے حوصلے خدا کی قسم دو قدم تیز اور چلتے ہیں
سوئے عرب فراق کے مارے چلے گئے — جذبات دید ہی کے سہارے چلے گئے
دلِ پُر سوز مدینے میں خبر ہونے تک — جاں نکل جائے نہ آہوں میں اثر ہونے تک
عرش پر جاتے ہیں سلطانِ امم آج کی رات — کہکشاں فرش بنی زیر قدم آج کی رات

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا اواخر تھا کہ خاندیش میں محرم الحرام میں معرکہ کربلا کے موضوع پر رزمیہ شاعری کے دنگل منعقد ہونے لگے تھے جو عام فی البدیہہ مسالموں کے میدان کارزار بن جاتے۔ اس میں مختلف میل مدمقابل ہوتے تھے۔ میل درحقیقت چند شعراء کا گروہ ہوتا تھا۔ جنھیں طرحیں دی

جاتیں۔ یہاں مشکل ردیف قوافی ہوتے علاوہ ازیں ادبی قیدو بند بھی لگائی جاتیں۔شرکاء ان شرائط پر کاربند ہوکر مختصر وقت میں سلام پیش کرتے تھے۔شاعری کے ان اکھاڑوں میں ایک شاعر اپنے مد مقابل کو استفہامیہ انداز میں شعر پیش کرتا جب کہ دوسرا برجستہ جواباً شعر کہہ کر اپنی قابلیت کو منواتا تھا۔اس طرح ان مقابلوں نے خاندیش میں زود گوئی ،انتہائی سخت زمینوں میں بے تکان طبع آزمائی ،صنائع بدائع کی نت نئی تراکیب میں خیال آرائی اور عوام میں ادبی مذاق کی پذیرائی کیں۔منظر بھی اسی عہد کے پروردہ تھے۔انہوں نے یہاں بھی اپنا سکّہ بٹھایا اور مد مقابل کو جہاں آزمائش میں مبتلا کیا وہیں دندان شکن جواب بھی دیا۔ایک واقعہ نمونتاً حاضر خدمت ہے۔

منظر صدیقی کے ایک ہم عصر کشور مصطفی آبادی تھے۔یہ دونوں مکتب نیرّی کے تربیت یافتہ اور ہونہار شعراء تھے مگر ان میں زبردست اختلاف رائے تھا۔چنانچہ وہ ایک دوسرے کے مد مقابل شمار ہوتے تھے۔ان کے اپنے میل تھے جن میں حریفانہ مقابلہ آرائی ہوتی تھی۔

منظر صدیقی نے رخصتیاں اور سہرے بھی لکھے ہیں۔اس وقت دلہنوں کی بدائی پر رخصتیاں اور سہرے بندھنے یا نکاح کی تقاریب میں سہرے پڑھوانا شرفاء وامراء اپنی شان سمجھتے تھے۔یہ رنج والم اور محبت وکلفت کے اظہار کا پیرایہ مقبول عام تھا۔وہ لوگ جو خود نظم نہیں کر پاتے تھے وہ کہنہ مشق سخنوروں سے بہ اصرار لکھوالیا کرتے تھے۔منظر صاحب نے رخصتی اور سہرا نگاری میں بھی مہارت پائی۔کسی نوشہ وعروسہ کے سر پر سہرا بندھنے کی تقریب پر انہوں نے یوں خامہ فرسائی کی تھی۔آپ بھی محظوظ ہوں۔

تیرے سر پہ سہرا ہے یہ حسیں یا چمن کا تازہ بہار ہے
ہے گلوں کی اس میں شگفتگی تو کلی کلی پہ نکھار ہے
تیری حسرتوں کا ہے رازداں تیری خواہشوں کا ہے ترجماں
ہے وہ سہرا جس کا بندھا ہوا تیرے دل کے تار سے تار ہے
ہے یہ گوشے گوشے میں روشنی تیرے جلوئے پائے حسین کی
تیرے حسن کا مہِ پر ضیاء سرِ چرخ آئینہ دار ہے

غزل وہ صنف سخن ہے جو ہر دور میں پسندیدہ اور کامران رہی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر دور میں ہماری ہم جلیس رہی۔منظر صاحب کی غزلیں بھی اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ان میں رنگ تغزل نمایاں ہے۔ان کے یہاں غزل سراپا غزل ہے۔

خرد کی نیرنگیاں بداماں حسین نظاروں سے کھیلتا ہوں — سراپا حسن بہار بن کر کر لالہ زاروں سے کھیلتا ہوں

وہ کب حقیقت دار و رسن سمجھتے ہیں — کمالِ ہوش کو دیوانہ پن سمجھتے ہیں

جو ان کو زلفِ گرہ گیر کے ہیں دیوانے — کمالِ سوزش دار و رسن سمجھتے ہیں

مستی نواز دل میں ہے شوریدہ پن ابھی — بھولا نہیں ہے لذتِ جام کہن ابھی

تنکوں سے کر رہا ہوں نشیمن کی بندشیں — ہو برقِ شعلہ وش نہ کہیں خندہ زن ابھی

چشم قاتل بھی ہے رقصاں انھیں نظاروں پر — خونِ بسمل کے اچھلتے ہوئے فوّاروں پر

ناوکِ تیر نظر ہوئے تیری عمرِ دراز — زندگی وقف ہے اپنی انہیں سوفاروں پر

شعلہ حسن کے جلوؤں پہ فدا کرنے کو — آخرش دل ہی تھا جو رکھ دیا انگاروں پر

نگہ ناز تھی کس کی یہاں رونق افروز — چڑھ گیا رنگِ حسیں قلب کی دیواروں پر

اپنی تقدیر کا پانسہ تو نہ پلٹا منظر — قرعہ اندازیاں کی سیکڑوں سیاروں پر

ستم ظریفی کا ہے یہ عالم عجب روّیہ ہے دل لگی کا — کس کی آنکھوں سے خون ٹپکے کس کو موقع ملے ہنسی کا

فریبِ حسن نظر کا صدقہ دلِ حزیں مطمئن تو ہے کچھ — شب الم کی سیاہیوں میں گماں ہوتا ہے روشنی کا

یہ منزل پُرخطر سراسر بھری ہے تاریکیوں سے منظر — چراغ داغ جگر سے اکثر میں کام لیتا ہوں رہبری کا

نگاہ برق اثر چھا گئی تو کیا ہوگا!
تخیلات کو گرما گئی تو کیا ہوگا!
اے کائنات کی نیرنگیاں کی دلدادہ
فریب حسنِ نظر کھا گئی تو کیا ہوگا
زمانہ جن کی داؤں پہ جان دیتا ہے
انھیں ہماری ادا بھاگئی تو کیا ہوگا
بقا کی لذّتیں پوچھیں تو خضر سے کوئی
حیات عمر ابد پاگئی تو کیا ہوگا

مرحوم کی شاعری اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کا مجموعہ کلام منظر عام پر آئے۔

☆☆☆☆

جمیلؔ مُصطفیٰ آبادی: حیات اور شاعری

ارشد احمد عبدالرزاق

ملک قاسم ملک مُحمد جمیل مُصطفیٰ آبادی، بروز منگل مورخہ ۴ر ستمبر ۱۹۲۳ء کو بمقام چوپڑا پیدا ہوئے تھے۔ یہ بستی چشتیہ سلسلۂ طریقت کے بزرگ سید مُصطفیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا مسکن تھا۔ عہدِ رفتہ میں یہ شہر اُن ہی سے مُعنوَن ہو کر مُصطفیٰ آباد کہلاتا تھا۔ ہائے افسوس کہ یہ نام از یادِ رفتہ ہو گیا ہے۔ عرفان ذات کی ایک روایت یہ ہے کہ اہل قلم اپنے تئیں اس سے موسوم ہوتے ہیں۔ شاید کہ جو لوگ مر چکے ہیں، ان کے نیک ناموں کو ضائع نہ کر، تاکہ تیرا نام بھی نیکی سے زندہ رہے، علی وجہ البصیرت جمیل صاحب نے بھی دیگر سُخن ورانِ شہر کی طرح کر مُصطفیٰ آبادی اسمِ منسوب لگا رکھا تھا۔

جمیل مُصطفیٰ آبادی نے اپنے وطن ہی میں معیارِ ہفتم تک تعلیم حاصل کی۔ وہ مورخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۴۵ء کو محکمۂ پولس میں ملازم مُنتخب ہوئے تھے۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں تھانہ بھی گئے، بعدازاں ممبئی تبادلہ ہوا تو وہیں ہجرت کر گئے تھے۔ وہ یہاں پولس محکمے کے شعبہ ٹریفک میں بطور جمعدار اپنی خدمات انجام دیتے ہوئے مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۱ء کو سبک دوش ہو گئے تھے۔ وہ دورانِ ملازمت اپنے نُمایاں کاموں کے سبب تمغے اور اِنعام سے سرفراز ہوئے تھے۔ موصوف ۱۹۴۷ء میں بہادری کے میڈل ''سوتنتر ویر'' سے نوازے گئے تھے۔ انھیں ۱۹۷۰ء میں ممبئی ایئرپورٹ پر محترمہ اِندرا گاندھی (وزیراعظم عہد) نے ایک یادگار قلم عطا کیا تھا۔ اُس وقت مہاراشٹر میں شراب بندی نافِذ تھی۔ مُشتبہ سرگرمیوں کے دِل دادہ عناصر اُمّ الخبائث کا کاروبار کرنے کی نت نئی تدابیر اِختیار کرتے تھے۔ موصوف نے اُن میں سے ایسے گروہوں کو سلاخوں کے پیچھے پہنچایا جو اپنے جسم پر شراب سے بھری بڑی بڑی پلاسٹک کی بوتلیں باندھ کر اس کاروبار کو چلا رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

جو دِل کی بات لب پر آئے کہہ دو جمیلؔ
جو سچے دوست ہیں اُن کا حساب مت رکھنا

اُن کا یہ وصف بھی قابلِ ذِکر ہے کہ ملازمت سے بری الذمہ ہونے کے بعد جب وہ چوپڑا مقیم

ہوئے اُس وقت اُن کی والدہ مخدومہ ''زیتون بی'' پیرانہ سالی میں تھی، تب موصوف نے اُن کی خدمت بڑی فرماں برداری سے انجام دیں۔ بلاشبہ یہ عمل قابل تقلید ہے۔ ماں کی محبت کا اعتراف اُن کے اِس شعر میں کیا خوب ہے:

ملی نہ ایسی محبت و ماں کے پیار میں ہے
ہزار چاہنے والے ہیں آج دُنیا میں

جمیلؔ صاحب فطری طور پر شاعر تھے۔ شاعری سے اپنی نسبت کا بیان یوں نظم کیا ہے:

نظر چرا کے تجھے فکر شاعری دے دی
جمیلؔ رنج نہ کر اُس کی بے وفائی کا

یہ غمِ روزگار تھا یا غم جاناں بہر حال اُنھیں طالب علمی کے زمانے سے ہی شاعری کا شغف تھا۔ وہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ اور مرزا غالبؔ کی شاعری پر فریفتہ تھے۔ محترم کو اُن کے سیکڑوں اشعار از بر تھے۔ چوں کہ وہ مُطالعے کے شائق تھے اِس لیے اُن کے پسندِیدہ موضُوعات بھی غالِبیات اور اِقبالیات ہی بنے۔ اُن کی شاعری پر اُن دونوں کے گہرے اثرات بھی ثبت ہوئے ہوں۔

چناں چہ ہفتم جماعت سے ہی اشعار نظم کرنے لگے تھے۔ اپنے پڑوسی کشور کرؔ مُصطفیٰ آبادی کی صحبت اور راہ نمائی میں ان کا یہ ذوق وشوق خُوب پروان چڑھا۔ اُن کے ماموں مرزا انورؔ بیگ مُصطفا آبادی تھے جن سے اکثر ردیفوں اور قوافی کی نزاکتوں پر اور اشعار کے اوزان پر اُن کی نوک جھونک ہو جاتی تھی۔ جب وہ ممبئی میں نوکری کی وجہ سے مُنتقل ہوئے تو اُنھوں نے ہاشمؔ نوگانوی کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ وہ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد وطن لوٹے تو پیرن رہبرؔ مُصطفیٰ آبادی کے ہم جلیس بن گئے اور اپنی سخن آرائی کا سلسلہ رواں رکھا۔

جمیل کرؔ مُصطفیٰ آبادی پیشے سے پولس تھے۔ اُنھیں مشاعرے پڑھنا بھی خوب آتا تھا۔ محترم تحت میں پڑھتے اور اِس مُنفرِد انداز سے کہ مشاعرہ لوٹ لیتے۔ اپنی اس خوبی کو اشعار میں یوں پیش کیا:

مُنفرِد سب سے جو اندازِ بیاں چھوڑ چلے
جیتے جی اُن کی سخن فہمی نہ بھولیں گے جمیلؔ

کیا کیا کھِلائے بزمِ سُخن میں سخن کے پھول
کہتے ہیں جھوم جھوم کے اہلِ سُخن جمیلؔ

وہ سامعین کو گرفت میں لینے کا ہُنر جانتے تھے۔ وہ اُن میں یوں جوش بھر دیتے کہ مشاعرے میں جان آجاتی۔ اپنی خوش بیانی کا ذکر اِن الفاظ میں کیا تھا:

اے دوست آ کے محفل اہلِ سخن میں دیکھ
وہ کیوں کہوں کہ شاعر خوش فکر ہے جمیلؔ

دیکھیے پہلی سی پھولوں میں مہک ہے کہ نہیں
پھر بہار آئی ہے غنچوں میں چٹک ہے کہ نہیں

اُن کے اشکوں میں ستاروں کی چمک ہے کہ نہیں
جو شکن ماتھے پہ اُبھری ہے دھنک ہے کہ نہیں
رونق بزم بدل جاتی ہے سناٹے میں
اُن کی آہٹ میں قیامت کی دھمک ہے کہ نہیں
مثل فردوس یہ دنیا کو سجاتے ہیں جمیل
دِل میں انسانوں کے جنّت کی للک ہے کہ نہیں

موصوف کئی مشاعروں میں شریک ہوئے۔ بالخصوص عروس البلاد ممبئی کے مشاعروں میں شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، روندر جین، کالی داس گپتا رضا جیسے باکمال شعراء کے شہ نشین ہوئے اور اپنا کلام پیش کیا۔

ممبئی فلمی نگری ہے۔ یہ بھلا مانوس اس کی چکا چوند سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چناں چہ موصوف نے چند ایک فلموں کے لیے نغمے بھی لکھے۔ اُن میں سے ایک حاتم طائی پر مبنی بلیک اینڈ وہائٹ فلم کے چار نغمے مقبول عام ہوئے تھے۔ تاہم ہمیں اس متعلق مزید معلومات میسّر نہیں ہو سکی۔

کلام جمیل؛ ممبئی پہنچنے والے اپنے عہد کے ہر نمایاں اخبارات و جرائد کے مشمولات میں جگہ پاتا تھا۔ مثلاً ماہنامہ پیش رفت، ماہنامہ صبح امید، ماہنامہ آج کی خاتون دہلی، آہنگ ایران وغیرہ رسائل۔ اخبارات میں روزنامہ انقلاب ممبئی، روزنامہ اِن دنوں، روزنامہ اُردو ٹائمز ممبئی، روزنامہ ہندستان ممبئی، روزنامہ شام نامہ ممبئی روزنامہ اخبار عالم ممبئی، روزنامہ آج ممبئی، روزنامہ رہبر اورنگ آباد، روزنامہ جدید رپورٹر، ہفت روزہ انوار قمر شولاپور،، ہفت روزہ تیسری دنیا، روزنامہ آج کل وغیرہ

جمیل صاحب کا کلام متذکرہ بالا اخبارات و جرائد اور موصوف کی بیاضوں کے بوسیدہ اوراق میں بکھرا ہوا پڑا تھا۔ اُن کے متعلقین بھی کوشاں تھے کہ اُن کا یہ کلام طاقِ نسیان کی نظر نہ ہو جائے۔ وہ آرزومند تھے کہ شیدائیانِ جمیل اُن کے دیوان سے مستفیض ہوں۔ چناں چہ ۲۰۱۲ء میں جمیل صاحب کے بعد از مرگ "دربارِ سخن" (شعری مجموعہ) منظر عام پر آیا۔ جس کے مرتب اور ناشر کاظم ملک ہیں۔

حبِّ رسالت مآب ﷺ میں جمیل مصطفی آبادی نے بھی طبع آزمائی فرمائی اور دل نشیں کلام پیش کیا۔ جو بے پناہ وارفتگی کا مُرقعہ معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

دیکھا جو چہرہ ماہِ رسالت مآب کا
فق ہو گیا رنگ رخِ آفتاب کا
جس نے پھیلائی ضیائے حق جہاں میں دُور دُور
ہم سمجھتے ہیں اِسے کردارِ احمد کا چراغ
اپنے محبوب کے صدقہ میں خدا یا ہم کو!
اور کچھ دے کے نہ دے، عشقِ پیمبر دے دے

محترم روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدخواہ تھے بفضل خدا یہ سعادت بھی نصیب ہوئی۔ تاہم یہ ملاقات اُنھیں یہ مزید شرف بازیابی کا آرزو مند بنا گئی۔ فرمایا:

اُڑ کے جاؤں مجھے جبرئیل کے شہپر دے دے
آخری ہے یہ تمنا کہ مدینہ جاؤں

کب میں کہتا ہوں فلک کے مہ و اختر دے دے
جلوۂ حسنِ محمدؐ کی تمنا ہے جمیلؔ

جمیلؔ مُصطفیٰ آبادی فطرتاً شاعر تھے۔ وہ زود گو بھی تھے۔ اُن کے یہاں رَجائیت کا پہلو تھا۔ وہ یاسیت کے خارنہیں اُمید کے گلزار مہکاتے تھے:

شعر گوئی میں تو کوئی مرحلہ باقی نہ رکھ
فکر و فن سے گلشنِ اُمید مہکا دے جمیلؔ

ذوقِ مطالعہ، تاریخِ اسلام سے واقفیت اور زبان وادب سے وابستگی نے جمیلؔ صاحب کی صلاحیتوں کو جلا بخشی تھی۔ وہ الفاظ کے مِزاج شناس تھے اور اُن کی الفاظ پر گرفت بھی تھی۔ یہی سبب تھا کہ اُن کے زباں و بیاں میں پُختگی پیدا ہوگئی تھی۔ اُن کی خوبیوں میں ایک برجستگی بھی تھی۔ وہ اکثر فی البدیہہ شعر کہا کرتے تھے۔

جمیلؔ صاحب کے سخن کا میدان غزل تھا۔ اُن کے بقول غزل عشاق و اہلیانِ قلم کی صدا، رن میں تیغ و تیر و سناں، آئینۂ دِل کی زباں، دستِ دُلہن کی حِنا، شوخ ہوش رُوبا، حسنِ رشکِ بتاں، ترانۂ غازی، اذانِ حرم، اشکِ رواں، درِ نہاں اور برقِ تپاں ہیں۔ انہوں نے غزل کی ثنا گوئی میں لکھا:

میداں میں تیغ و تیر و سناں بن گئی غزل
اُردو نے درسِ امن دیا درسِ جنگ بھی

عشاق کے دِلوں کی صدا بن گئی غزل
کرتی ہے اِستعاروں میں احوالِ دل بیاں

یوں دشمنوں کے حق میں قضا بن گئی غزل
ہے غازیوں کے لب پہ ترانہ بنی ہوئی

جمیلؔ صاحب کے یہاں غزل اپنے رِوایتی اُسلوب میں نظر آتی ہے۔ سواُن کی غزل کی وضع قطع بھی رِوایت آشنا ہی رہی۔ جس میں وارداتِ قلبی کا بیان ہے، تو کہیں عِشق کے تجربات کا اظہار بھی۔ کبھی وِصال و ہجر کی حِکایات ہیں، تو کہیں جمالِ یار کے ذِکر و اذکار بھی۔ اُن کی جمالیاتی حِس بہت تیز تھی۔ سواُن کے کلام میں جمالیاتی ذوق کی فراوانی ہے۔

یہ زُلف تری کُھل کر جو زیرِ کمر آئی
اب اِس سے سوا کوئی کیا رات بڑی ہوگی

گویا چڑھا ہُوا ہے لعل و گہر کا پانی
دندان و لب ہیں تاباں اُس مہ لقا کے ایسی

دِل نے جو پایا سکوں سرد شراروں میں جلے
ہم ترے حسن کے پُرکیف نظاروں میں جلے

وہ تیرے حسن کی گرمی کہ آئینہ پگھل جائے
بہت دشوار ہے آنکھیں ملائے آرسی تجھ سے

زخم گہرے جو میرے دِل پہ دِیے جاتے ہیں
تیرِ مژگاں سے وہی زخم سِیے جاتے ہیں

کاش! آجائے پلٹ کر سوئے منزل اپنی
ہم چراغوں سے تری راہ گزاروں میں جلے

آئے گا وہ جمیلؔ شبِ وصل خواب میں
گُل کردو آج میرے شبستاں کے سب چراغ

جمیلؔ صاحب کلاسیکی روایات سے انحراف نہیں کر سکے ،لیکن وہ اپنے عہد سے کیسے اجتناب برتتے ۔ان کے یہاں مسائلِ زمیں ومکاں تو موجود ہیں ہی ،علاوہ ازیں ایجاز و اختصار کے عناصر بھی گاہے بگاہے دکھائی دیتے ہیں ۔جستہ جستہ اخلاقی مضامین کی ضیاباری ہوتی ہے۔خال خال عارفانہ کلام کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔کبھی خود ہی دو عالم کا رنگ شامل ہونے کا اعلان کرتے دکھائی دیے:

جمیلؔ اہلِ سخن کیوں نہ داد دیں بڑھ کر
تری غزل میں دو عالم کا رنگ شامل ہے

زاہد طلبِ حور میں کرتا ہے عبادت
لب پر ہے خُدا دِل میں مگر اُس کے صنم ہے

زباں پہ چھالے نہ پڑ جائے دیکھ اے کافر!
بُتوں کے سامنے ہنس کے خُدا کا نام نہ لے

احساسِ تشنگی کا تری جب بھی میں کروں
دریا بھی مجھ کو پیاس کا مارا دیکھائی دے

ہم سمجھ لیں گے دِل کی اُلجھن کو
زُلف کے پیچ وخم کی بات کرو

اشک بہتے گئے یادوں کا سہارا لے کر
اُن کی ہر یاد پہ خود یاد کو رونا آیا

جمیل صاحب کے یہ اشعار دیکھیے جس میں حکمت آموز باتیں ہیں۔عام فہم لفظوں سے پُر دل میں سیدھا اُتر جانے والا انداز ہے۔اشعار ملاحظہ کریں:

عزمِ محکم ہے تو ہو جاتی ہے مُشکل آساں
کون کہتا ہے کہ مِلتی نہیں منزِل تنہا

جمیلؔ فتح و ظفر اُس کے زیرِ پا دیکھے
شُمار جس کا سدا حق کے جاں نثار میں ہے

جسے ہے حوصلہ وہ آسماں کو چھوتا ہے
ڈرے جو گردشِ ایام سے وہ بزدِل ہے

حدیثِ عشق ہے کہ دِل سے دِل کو راحت ہے
خُلوص والوں سے تم اِجتناب مت کرنا

چھوڑ دے اِس کو تو مِل جائے حیاتِ جاوداں
یہ جہاں فانی ہے اِس سے رابطہ باقی نہ رکھ

وہ ایک ایسا حساس دِل رکھتے تھے جو ملک کی فضا سے اچھی طرح واقف تھا۔یہ دل تقسیمِ ملک کا المیہ اور اُس کے خوں چکاں ایام سے مجروح ہُوا ہوگا۔آزادی کے بعد مِلّت کی زبُوں حالی سے وہ بے قرار رہا ہوگا تاہم سرکاری ملازمت کی بندشوں کے باوجود اس سوختگیِ دِل نے کُچھ چنگاریاں ضرور

بکھیری:

گھر جس نے میرا لوٹا وہ ہمسایوں میں تھا ۔ میرا لہو سڑک پہ تماشائیوں میں تھا

یہ حال میرا گردشِ آلام نے کیا ۔ اچھائیاں میں کر کے بھی رُسوائیوں میں تھا

کچھ باغ لہلہائے کچھ چاند جگمگائے ۔ ٹپکا جہاں بھی میرے زخم جگر کا پانی

نظر آیا مجھے رنج و الم کا چار سو ڈیرا ۔ جو دیکھا حال نہ احساس مستقبل کو نیند آئی

ثبوت ملتا ہے اِن سے مری وفاؤں کا ۔ گلوں کے رُخ پہ ہیں روشن مِرے لہو کے چراغ

غریبوں پر ہُوا ہے بند دروازہ عدالت کا ۔ کریں فریاد ہم، کس سے کہ خود عادِل کو نیند آئی

'تصوف برائے شعر گفتن خوب است'، اِس خیال کے سبب شعرائے اردو نے اِسے اپنایا۔ وارداتِ قلبی کے بعد جمیلؔ صاحب کے یہاں تصوف کا موضوع بھی ملتا ہے۔ جو قناعت، صبر و توکل جیسے نظریات کو پیش کرتا ہے:

تو بُلبلے کی طرح سطحِ آب پر اُبھرا ۔ تیرا وجود اگر ہے تو کس شمار میں ہے

اِس قدر تو لَو لگا لے اپنے رب سے دوبدو ۔ عبد و معبود میں کچھ فاصلہ باقی نہ رکھ

یہ کس مقام پر آیا ہے آج کل اِنساں ۔ خُدا کو بھول کے مشغول کاروبار میں ہے

صبر کرنا میری فطرت میں ہے تو اِس کا غم نہ کر ۔ اور بھی تُو جبر کر کچھ انتہا باقی نہ رکھ

عشق؛ جذبۂ صادق ہے۔ یہ وہ لازوال دولت ہے جو صرف عشقِ مجازی کی منزل پر ہی نہیں ٹھہرتی۔ بلکہ عشقِ حقیقی سے سرشار کراتی ہے۔ بعد ازاں عشق ربانی کی بدولت وہ بصیرت عطا ہوتی ہے جو اُسے محبوب سے محب بنا دیتی ہے۔ اب وہ خالق کے لیے اُس کی مخلوق سے محبت کرنے والا بن جاتا ہے۔ ان کے مطابق:

ابتداء سے میری جبینِ نیاز ۔ وقف ہے تیری بندگی کے لیے

بس وہی کام سب سے بہتر ہے ۔ ہو جو اِنساں کی بہتری کے لیے

کیوں کر بلائے ناگہاں نازِل ہے اِن دنوں؟ ۔ اِنساں خدا کی یاد سے غافِل ہے اِن دنوں

اس سے بہتر مشغلہ مِلتا نہیں کوئی جمیلؔ ۔ یادِ حق میں آپ اپنے دِل کو بہلانے لگے

عشقِ حقیقی میں سرشار ہو کر جمیلؔ صاحب نے بہت عمدہ کلام پیش کیا۔ در حقیقت یہاں عشقِ حقیقی میں عشقِ مجازی کے جذبات کی شمولیت ہو گئی ہے:

اپنی منزل ہے فرشتوں کی بھی حد سے آگے
جستجو میں تری ہم کون ومکاں چھوڑ چلے

ترے جلووں کی تابانی سے چمکے ہیں مہ وانجم
ہوا خورشید روشن نور کی جب بھیک لی تجھ سے

کرتا ہوں۔یہ عشق میں ہر گام پہ سجدے
میرے لیے کعبہ ترا ہر نقشِ قدم ہے

سنبھل حجابِ تجلی سے کھیلنے والے
کہیں حیا کو حیا آگئی تو کیا ہو گا !

ہر اک گلی کے موڑ پہ ہوتا ہے یہ گماں
حیرت ہے تیرے گھر کا ہی رستہ دکھائی دے!

ان کے یہاں عشقِ حقیقی اور مجازی کی آمیزش کے حوالے بھی ملتے ہیں جس میں پردہ ہٹانا، بے نقاب ہونا، جلوہ دِکھانا، تابِ نظر، سجدہ شوق، جھکی جبیں کا ذکر کیا گیا ہے۔وہ پیش خدمت ہے:

پردے کی بات ہے ذرا پردہ ہٹایئے
تابِ نظر جو ہو تو نظارہ کریں گے ہم

باشوق سجدہ بارہا کیوں جھک رہی جبیں؟
یہ کِس کے پائے ناز پہ سجدہ کریں گے ہم!

دِل مرا طور نہیں برق گرا دے کوئی
مثلِ موسیٰ جو میرے ہوش اُڑا دے کوئی

میں تُجھ کو دیکھتا ہوں یوں بزمِ خیال میں
موسیٰ کو جیسے طور پہ جلوہ دِکھائی دے

تھی طور کی وادی پر روشن موسیٰ بھی نہ جس کو دیکھ سکے
اِس شمع فروزاں پہ دِل کو پروانہ بنا کر پیش کیا

نئے نئے اُسلوب نِکالنا اور ایک ایک بات کو کئی کئی طرح سے ادا کرنا شاعرانہ کمال ہے۔خیال ہر ذہن میں موجود ہوتا ہے۔معانی بھی ہر ایک کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔خیال ومعانی کے لیے کسی ہنر کے اِکتساب کی ضرورت نہیں۔لیکن اِن معانی کی کِن الفاظ سے جامہ زیبی ہو؟اِنھیں ہو بہو ادا کِیا جائے یا کہ موثر تر صورت میں پیش کِیا جائے۔یہ پیش کش ہر کس و نا کِس کے بس کی بات نہیں۔یہ تو وہی جانے جو تخلیقی اِظہار کے ذریعے کی کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں۔جمیل مُصطفیٰ آبادی ایک ایسا ہی نام ہے جو اس ذریعۂ اظہار سے بخوبی واقف رہا۔اس ضمن میں موصوف کا چنندہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

بے چین اس قدر دلِ بسمل ہے اِن دنوں
جینا مُحال مرنا بھی مُشکل ہے اِن دنوں

روزِ جزا وہ پیش خدا ہوگا سرنگوں
دنیا میں سر اُٹھائے جو باطل ہے اِن دنوں

کیا راہ وہ دکھائے گا گمراہ کو جمیلؔ
گمراہ خود جو رہبرِ منزل ہے اِن دنوں

اُن میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی ہے تابانی بھی
کِتنے دریا لیے پھرتی ہیں سُلگتی آنکھیں

تجربہ عِلم وفہم اُن میں سبھی ہیں وہ ہنر
راہ چلتی ہوئی دنیا کو پرکھتی آنکھیں

ناگہاں ذِکر اُدھر چھیڑ دے کوئی میرا ہے تعجب کہ اُدھر اُن کی پھڑکتی آنکھیں

حمد وثناء کا ذکر ہو تو جمیل صاحب کے دعائیہ کلام پر بھی نظر جاتی ہے۔ یہی وہ کلام ہے جسے وہ ہمیشہ گنگنایا کرتے تھے

قوم مُسلم کو خدا علم کے جوہر دیدے دانش و عقل و ہنر اوروں سے بہتر دے دے
نہ محبت نہ مروّت نہ خلوص اور نہ وفا پھر مسلماں کو خُدا خُلقِ پیمبر دے دے
ہم ہیں محتاجِ کرم اور ہے تو بحرِ کرم! ایک قطرہ ہی سخاوت کے سمندر دے دے

جہاں قافیوں کو برتنے کا ہنر جمیل صاحب کے پاس بدرجہ اتم موجود دکھائی دیا وہیں ردیف پر بھی گرفت مضبوط لگتی ہے۔

تمام رات جو دیکھا تھا اُس نے خواب میں سانپ سحر ہوئی تو بنا خود بھی پیچ وتاب میں سانپ
کبھی جو آگئی لہرا کے زلف زیرِ نقاب ہُوا نظر کو یہ دھوکا کہ ہے نقاب میں سانپ
نہ جانے کتنے جوانوں کو ڈس چکے ہوں گے جو تیرے دوش پہ لہراتے ہیں شباب میں سانپ
عطائے حضرتِ واعظ کا بھی جواب نہیں کبھی ثواب میں جنت کبھی عذاب میں سانپ
تمہاری آنکھ میں سُرمے کا خط بتاتا ہے کہ بند کرتے ہو تُم، کس طرح حُباب میں سانپ

جمیل مُصطفیٰ آبادی نے کئی مُتنوع معنوی جہتوں کو پیش کیا ہے۔ اُن کی درج بالا غزلیں سہل اور سادہ ہیں۔ مزید برآں اِن میں معنوی تہہ داری اور لفظی تہہ داری کا حسین اِمتزاج موجود ہے۔ جس نے معانی آفرین اور خیال آفرینی پیدا کر دی ہے۔ اُن کے کلام میں جا بجا عشق بکھرا ہوا ہے سو یہ جذبۂ عشق کی ترجمان ہے۔

(آمد: ۱۹۲۳ء رخصت: ۲۰۰۹ء)

☆☆☆☆

حمد و نعت اور موضوعاتی نظموں کا قد آور شاعر:
عبدالقادر قادرؔ جلگانوی

مضمون نگار : ثناء عبدالقیوم خان

پیدائش : ۱۶؍مئی ۱۹۹۳ء

تعلیم : ایم اے بی ایڈ (نارتھ مہاراشٹر یونیورسٹی، جلگاؤں)

پتا : ۱۶۸؍شیواجی نگر، جلگاؤں

عبدالقادر لاڑجی باغبان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ والد صاحب جناب لاڑجی تاج محمد باغبان میونسپل کاؤنسل جلگاؤں کے پہلے باغبان کاؤنسلر تھے۔ مرحوم لاڑجی تاج محمد نے کبھی الیکشن نہیں لڑا اس کے باوجود ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۷ء میں مسلسل کاؤنسلر چنے گئے۔ آج سے تقریباً ۱۰۰؍سال پہلے جب کانگریس اور مسلم لیگ انگریزی اقتدار سے برابر لڑ رہی تھیں وہ سیاسی اتھل پتھل کا زمانہ تھا تحریک خلافت بھی زور پکڑے ہوئے تھی۔ مرحوم عبدالقادر قادرؔ جلگانوی اس زمانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ تحریک سے جڑے رہے۔ آپ کے والد تاحیات جامع مسجد جلگاؤں کے متولی رہے۔ باغبان برادری کا مدرسہ بھی آپ ہی نے قائم کیا تھا۔ والد صاحب کی طرح عبدالقادر قادر جلگانوی نے بھی باغبان برادری میں عزیزوں اور رشتہ داروں سے قرابت اور محبت کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔

۱۹۷۰ء کے خونی فساد کی آگ میں موصوف کا بیشتر کلام جل کر خاک ہو گیا اور بچے ہوئے کلام کا بھی کافی حصہ ضائع ہو گیا۔ کچھ روشنائی کی بوتل الٹ جانے سے، چند بے توجہی کی وجہ سے۔ جو کلام بمشکل آپ کے پوتے شکیل احمد سے دستیاب ہوا اُس میں حمد و نعت اور مختلف موضوعات پر نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ اسی کلام کی روشنی میں یہ تاثر۔

تعلیمی لیاقتوں کے بارے میں تو کوئی معلومات ہاتھ نہیں لگی لیکن کلام میں موضوعات، مفاہیم

لفظوں اور تراکیب کا ستعمال، خوبصورت اور معنی خیز لفظوں کا برتاؤ، خیالات کی ترسیل اور سلاست کے ساتھ زبان و بیان کی خوبصورتی یہ سوچنے پر آمادہ کرتی ہے کہ آپ کا مطالعہ عمیق تھا یا تجربہ۔ ممکن ہے زیادہ پڑھے لکھے نہ ہوں۔ یوں تو شاعری خداداد صلاحیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے لیے مدرسہ کی سیڑھیاں چڑھنا ضروری نہیں۔ ہاں نئے موضوعات سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے تعلیم انتہائی ضروری ہے کہ ماضی و مستقبل کی شناخت ہو سکے۔

نعت پاک جو آپؐ کے لیے مختص ہے اس میں اپنی فکری پرواز کو پاکیزہ ماحول میں رکھ کر تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں۔ ویسے تو آپؐ کی تعریف قرآن کریم ہے۔ اگر اللہ کے اس کلام کو نعت رسولؐ سے تعبیر کیا جائے تو ایمان کی زنجیریں پختہ ہونے لگیں گی۔

قادر صاحب دل کی گہرائیوں سے نعت پاک کے سارے حسن سامنے رکھتے ہیں اور دل کو چھو لینے والا مضمون باندھنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ کمال یہ بھی ہے کہ موصوف نے نعت پاک کے حسن کو قطعی طور پر پیش کیا۔ وہ آپؐ کی جانب سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹے۔ یہی تو قدرتی عطیہ ہے۔ جوان کی موت کے بعد بھی دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔ انھی کا یہ انداز دیکھیے ؎

مٹا کر اپنی ہستی ہستی میں جان کی پیدا
ترا ثانی ہوا کوئی، نہ ہوگا اب کوئی پیدا
یہ انداز نظر تیرا، کرے گا کیا کوئی پیدا
دلِ دشمن میں گھر کر لے نگاہِ سرسری پیدا
تری خاکِ قدم کے ذرہ ذرہ کا وہ عالم ہے
حرم سے بت کدے تک ہو رہی ہے روشنی پیدا

اللہ کی حمد و ثناء بیان کرتے ہوئے قادر صاحب نے اپنے آپ کو وحدانیت کے سرور میں اس طرح ڈبو دیا کہ کلام سے لا الٰہ الا اللہ کا واضح تصور سامنے آجاتا ہے جو روحانیت میں حلول پا جائے تو عاقبت سنور جانے کے سارے دلائل مغفرت کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ رب کائنات کی تعریف انھوں نے اپنے انداز میں اسطرح کی ہے کہ بمشکل کہیں اور سننے اور دیکھنے کو ملے۔ وہ حمد و ثناء اسطرح بیان کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے رب کی بارگاہ میں معمول کے مطابق ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں ہمراہ لفظوں کے برتاؤ بھی چونکا دیتے ہیں۔

یا الٰہی دل میں کردے عشق یوں پیدا تیرا

سر میں ہو سودا تیرا ،کہلاؤں دیوانہ تیرا
کیا جمادات و نباتات اور حیوانات کیا
رات دن ہے مدح خواں ادنیٰ و اعلیٰ تیرا
طورِ سینا پر اسے جانے سے پھر کیا واسطہ
جس کو یارب ہر جگہ آئے نظر جلوہ تیرا

داغؔ دہلوی کے علاوہ بھی انگنت لوگوں نے اردو زبان کی تعریف اپنے اپنے انداز میں پیش کی ہے لیکن قادر صاحب نے بھی 'اردو زبان' اس عنوان سے ایک نظم کہی ہے جو واقعی سننے ،سمجھنے اور پڑھنے کے قابل ہے۔جس کے ہر شعر میں اچھوتے خیالات جنم پاتے ہیں۔یہ نظم موصوف کی اردو دوستی کی عمدہ مثال ہے۔

کتنی شیریں زبان ہے اردو
کل زبانوں کی جان ہے اردو
کل جہاں جانتا سمجھتا ہے
کتنی آساں زبان ہے اردو
جسکو دیکھو وہ چاہتا ہے اسے
کتنی پیاری زبان ہے اردو
دن بہ دن چھا رہی ہے دنیا پر
کیا تیری آن بان ہے اردو
ہند ہی میں بنی بنائی ہے
خاص ہندی زبان ہے اردو
فوج سی ہے قطار حرفوں میں
گویا فوجی زبان ہے اردو
کیا فصاحت کیا بلاغت ہے
قادرؔ اعلیٰ زبان ہے اردو

سورج کا طلوع اور غروب ایک زندہ حقیقت ہے،نصف النہار بھی ایک وقت ہے اور اللہ کی پناہ اسے اپنی منزل طے کرنے میں زوال سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔زندگی کا یہی رویہ انسان کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔موصوف اتنے حساس طبیعت ہوگزرے کہ خصوصی طور پر وہ مسلمانوں کے ماضی حال اور مستقبل پر نظر جمائے رہے۔شاعری کی فنی باریکیوں کی بات چلے تو وہ چست و چالاک نظر آتے ہیں ۔انھوں نے اپنی نظم "دورِ مسلم۔حال و ماضی، مستقبل" میں شاعر کو حالتِ فاعلی اور حالتِ مفعولی دونوں طریقوں سے استعمال کیا ہے اور یہ استعمال ان کے پختہ فن کی دلیل بھی ہے۔وہ طنز کرتے ہیں تو مسلمانوں کی زبوں حالی کی داستان بھی سناتے ہیں۔کبھی رہبر کی طرح راستہ دکھاتے ہیں تو کبھی سماج کو خود سوچنے پر آمادہ کرتے ہیں۔اس کے ماضی و حال، مستقبل کا انوکھا روپ بتا کر ہوش مندی کی دعوت بھی دیتے ہیں۔یہ نرم مزاجی انھیں مرحومین (شعراء) کی اوّلین صف میں کھڑا کرتی ہے۔

دور مسلم حال وماضی، مستقل

اپنی دنیا اس قدر زیر وزبر پاتا ہوں میں
چوٹ سی پڑتی ہے دل پر تلملا جاتا ہوں میں
رنج و غم درد و الم کا دورِ پیہم دیکھ کر
حال و ماضی اور مستقبل کو دہراتا ہوں میں
پیش میرا جذبۂ احساس ملت اب کہاں
صرف گویا نام کا مسلم نظر آتا ہوں میں
تنگ آکر مجھ سے یوں کہنے لگا میرا ضمیر
تیری اس طرزِ روش سے تو جلا جاتا ہوں میں
سرد اے مسلم تیرا خونِ حمیت ہوگیا
جذبۂ اسلاف سے آ، تجھے گرماتا ہوں میں
اک ذرا سی اختلافِ رائے پر ناداں تجھے
ہر گھڑی آپس کے شر میں مبتلا پاتا ہوں میں

حالات حاضرہ سے آگاہی ضروری ہے۔ خواب خرگوش ٹوٹ جانا ہے۔ عزت وعظمت، توقیر وتحقیر ،عروج وزوال، دن رات، بقاوفنا اور روزمرہ کی تگ ودو وغیرہ سے وہ نزدیک تر دکھائی دیتے ہیں ۔تمام حالات سے نمٹنے کی خاطر وہ بیداری کا درس بھی دیتے ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر انسان کو چاہئے کہ چوکنا رہے اور سکھ وچین کی خاطر زندگی میں زہر نہ گھولے۔ غالبؔ نے کہا تھا ؎

رات دن گردش میں ہے سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

غالبؔ نے حالات کا مقابلہ کرنے کی طرف توجہ دلائی تھی ۔گھبرا جانا واقعی ناکامی کی طرف مراجعت ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ہمت وجواں مردی کے ساتھ کھڑا رہے تاکہ آنے والی نسلیں اس کے نقش قدم سے استفادہ کرسکے۔ موصوف نے اپنی نظموں 'درسِ بیداری' اور 'نوائے بیداری' میں انہی حالات کا ذکر کرتے ہوئے نئی صبح کا پیغام دیا ہے۔

درسِ بیداری

مانا تیری آہوں میں، دعاؤں میں اثر ہے
رفعت کا تیری فرش سے تا عرش گزر ہے
بدلا ہے مگر ساتھ زمانے کے تیرا رنگ
کل اور تھا، آج اور ہے کچھ تجھ کو خبر ہے
گر چشم بصیرت ہے تو، لے دیکھ حقیقت
آئینہ دو عالم کا تیرے پیش نظر ہے
دنیا میں ہے توقیر، نہ ہے دین میں عزت
تیرا ہے وہ عالم، کہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے
آرام کی راتیں گئیں او نیند کے مارے
بیدار ہو بیدار کہ اب وقت سحر ہے
ہنستا ہے کبھی اور کبھی روتا ہے زمانہ
قادرؔ تجھے ماحول کی کچھ اپنی خبر ہے

نوائے بیداری

کیوں حال پہ اپنے روتا ہے ، رونے سے بھلا کیا ہوتا ہے
غم کرنے سے غم بڑھتا ہے ، کیوں وقت کو ناحق کھوتا ہے
ہمت سے لیا کر کام سدا، امداد کرے گا آپ خدا
تدبیر تو کچھ کر دیکھ ذرا ، کیوں بخت کا رونا روتا ہے
سمجھا کے تجھے سب نیک و بد، دی اس نے طاقتِ عقل وخرد
مجبور محض خود کو نہ سمجھ ، کیوں حوصلہ اپنا کھوتا ہے
وہ ہمت و جرأت دکھلا دے ، دنیا کی زباں سے کہلا دے
بے باکی ایسی ہوتی ہے ، یہ اس کا عالم ہوتا ہے

انسانی ترقی کا راز اس کی محنت اور استقامت میں مضمر ہے۔ انسان کو چاہئے کہ خواب خرگوش سے بیدار ہو کر زمانے کی روش پر غور کرے جو پلک جھپکتے ہی زندگی تہہ وبالا کر دیتی ہے۔ وہ صاف طور پر اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر ترقی کی معراج حاصل کرنی ہو تو واحد راستہ سنّتِ رسولؐ ہے جس کے لیے انسان کو چاہئے کہ بیدار رہ کر قرآن کے اس حکم پر عمل پیرا ہو جائے جو تمام عالم کے لیے کامیابی کا ضامن ہے۔ قرآن نے واضح طور پر کہا ہے کہ یاایھاالذین آمنو الدّخلو فی سلم کافۃہ ولا تتبعُ خطواتِ الشیطان ہ

قادری صاحب کی پوری نظر عاقبت پر ہے وہ دنیاوی ترقی پر عاقبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ انسانی تذلیل کا کارن دنیا کو سب کچھ سمجھ لینا ہے۔ ریاکاری بڑا عیب ہے۔ کفر کی حد تک لے جاتا ہے۔ اس قسم کے انیک مذہبی رجحانات آپ کی شاعری میں ملتے ہیں۔ جگہ جگہ وہ مبلغ کا کام بھی انجام دیتے نظر آتے ہیں۔

آج دروازوں پر آنے والے سائل کو بہت آسانی سے ، بہت بہانوں سے واپس کر دیا جاتا ہے ۔اس نازیبا حرکت پر بھی شاعر موصوف نے بڑا پر خلوص طنز کیا ہے۔ مندرجہ ذیل کلام انھیں خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔ ان کی دو نظمیں 'نوائے عمل' اور 'بارگاہِ بندہ نواز میں' اپنی پختہ ذہنی کے اعتبار سے قابل صد تحسین بھی ہے۔

بارگاہِ بندہ نواز میں

بندہ نواز رحمت اسطرح تیری برسے   بندے کا بن کے بندہ ، بندہ نہ کوئی ترسے

جو مانگتا ہے تجھ سے، کیا مانگے کوئی اس سے — بندہ نواز سب کو، ملتا ہے تیرے در سے

میں جانتا ہوں تجھ کو، تو جانتا ہے مجھ کو — دیکھے کوئی جو تجھ کو، دیکھے میری نظر سے

صرفِ سجود کر دے، صرفِ سجود کر دے — لمحات زندگی کے قادرؔ ہیں مختصر سے

نوائے عمل

تجھ کو معراج ترقی ہے اگر درکار آج — کر عمل پیدا بہ طرزِ احمدِ مختار آج

ہر طرف در پہ، آزار ہیں اغیار آج — خواب غفلت سے او غافل ہو ذرا بیدار آج

تجھ کو وہ دلچسپی نہیں قرآن کی تعلیم سے — غیر علم و فن کا دلدادہ ہے تو ہر بار آج

تو نے دنیائے ترقی سمجھا ہے دورِ حال کو — اس غلط فہمی نے کر ڈالا ذلیل و خوار آج

دعاؤں کی قبولیت، قدم قدم پر سنبھلنا، عزت و احترام کی منزلیں، بڑے بڑے وعدے کرنا اور پارسائی کا زوال ان تمام موضوعات کو شاعر نے اپنے کلام کے ذریعے عوام الناس تک پر اثر انداز میں پہنچانے کی کوشش کی ہے لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ سب کچھ جان کر بھی انجانے کا سوانگ رچے پھرتے ہیں۔ فتح و ظفر کا تعلق بہر حال ہمت و عمل پر منحصر ہے۔ اتنا ہونے کے باوجود قادر صاحب مایوسیوں کے اندھیروں سے بھی گزرتے نظر آتے ہیں۔

ہمت نہ کبھی ہار، بڑھے جا سوئے منزل — ہمراہ تیرے دم بہ دم فتح و ظفر ہے

اب خانہ بدوشوں کی طرح حال ہے قادرؔ — جائیں تو کہاں جائیں کوئی گھر ہے نہ در ہے

مقبول دعا کیوں نہ ہو، اس بارگاہ میں — لیکن خلوصِ دل ہو، دلِ داد خواہ میں

رکھنا قدم قدم پہ قدم کو سنبھال کر — کانٹے بچھے ہوئے ہیں محبت کی راہ میں

کافی ہے مجھ کو، سارے زمانے سے کیا غرض — عزت اگر ہے میری، تمھاری نگاہ میں

ہے پارسا سے پارسا آمادۂ گناہ — قادرؔ ہے ایسی کون سی خوبی گناہ میں

اوروں کے اچھے برے میں شریک ہونا، اچھے روّیوں اور سلوک کی پاسداری کو شاعر نے قدر کی نظر سے دیکھا ہے۔ بے اطمینانی کی وجوہات آپ نے یوں ڈھونڈ نکالی کہ ہر کس و ناکس اقرار میں گردن جھکالے اور حسیت کے اجالے اندھیروں کے محرکات کھل کر سامنے آجائیں یہی تو وجہ ہے کہ خوش فکر اور حساس دل نرم مزاجی کے باعث پریشان ہو رہتا ہے۔

کون سی فکر ہے در پیش دگر گوں ہے حواس
کس لیے رنگ، طبیعت نظر آتا ہے اداس

زندگی کے نہیں اسرار سے واقف قادؔر
جن کو اوروں کی مصیبت کا نہیں ہے احساس

انکساری کی حدوں سے گزر جانے کو موصوف عیب گردانتے ہیں۔ہاں ۔۔ایسا اس زمانے میں ضرور ہوتا ہے۔

نہ حد سے زیادہ کرو انکساری
کہ پامال خودداریت ہو تمھاری

بھارت کی جدوجہدِ آزادی میں تحریک عدم تعاون کافی شہرت کی حامل تھی ۔اس کی نسبت سے ہندوستانیوں نے غیر ملکی سامان کی خرید فروخت روک دی تھی ۔ یہاں تک کہ بدیسی مال کی ہولی بھی انجام پائی ۔دراصل اپنے گھروں میں غیروں کی مداخلت کبھی بھی اچھا شگون نہیں ہوتا۔غیروں سے نزدیکی اور اپنوں سے راہ فرار ۔۔۔ یہ تو نادانی ہے!موصوف نے اپنے علاقے کے لوگوں کو حالتِ فاعلی میں اس طرح پیش کیا کہ وہ بذاتِ خود حالت مفعولی میں آجاتے ہیں ۔اس فکر کے ساتھ ہی احساس خودداری کو جگانے کی بھرپور کوشش کی ہے ۔احساس خودداری اس نظم میں وہ رقمطراز کچھ اسطرح سے ہوئے۔

نہ دیسی پہ شاداں، نہ دیسی پہ نازاں ۔۔۔ بدیسی کے خواہاں ،بدیسی پہ قرباں
بنا جائے ناداں بھی ،جن کو ناداں ۔۔۔ وہ ہیں خاندیسی بھولے مسلماں

آپ کے کلام میں صنعت تلمیح کے اشارے بھی ملتے ہیں جو سبق آموزیت کے درس جگہ جگہ دیتے ہیں ۔یہ واقعہ اظہر من الشمس ہے کہ انسانی حسن سلوک میں کہیں کہیں دل توڑنا اور دل کا ٹوٹنا بھی شریک ہے عمارتوں کے ٹوٹ جانے سے کچھ نہیں ہوتا مگر دل کے توڑنے یا ٹوٹنے پر اللہ کے ناراض ہوجانے کے امکانات بھی روشن ہوجاتے ہیں ۔شاعر موصوف کے کلام میں تصوف کا رنگ بھی بھرا پڑا ہے ۔۔۔اگر کوئی اٹھائے ۔اللہ کی یاد سے بیگانہ ہونے یا بھول جانے پر انھوں نے افسوس کا ظہار بھی کیا ہے ۔وہ زندگی کو بہت مختصر گردانتے ہیں جو بہت سچ ہے ۔

پاسِ اسرار حقیقت سے ہوں چپ ورنہ مجھے ۔۔۔ کیا کہوں ،کیا تو نظر آیا ،نظر آنے کے بعد
ہے وہ بنیادِ خلیل اللہ ،یہ اللہ کی ۔۔۔ کعبۂ دل کیا بنائے گا کوئی ڈھانے کے بعد
سرنگوں کس نے کیا ،صبر وسکوں کس نے دیا ۔۔۔ امتحان کس نے لیا ،جور کی تلواروں میں
صرفِ سجود کردے ،صرفِ سجود کردے ۔۔۔ لمحات زندگی کے قادؔر ہیں مختصر سے

طور سینا پر اسے جانے سے پھر کیا واسطہ   جس کو یارب ہر جگہ آئے نظر جلوہ تیرا

بہت سلاست ، بہت روانی ، نئے مفاہیم ، نئے موضوعات ، نئی فکر ، تصوف ، رہبری ، گہری فکر ، تراکیب ، تشبیہات ، محاوروں کا استعمال ، بات میں بات پیدا کرنا ، رہبرانِ ملت کو نئی روشنی سے آشنا کرنا ، انسانی ناکامی سے سبق حاصل کرنا اور انسانوں کو کامیابی کی منزل کی طرف بلانا ، ماضی کو حال پر ترجیح دینا ، لحہ لحہ نصیحتوں سے کام لینا ، حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ، وحدانیت پر یقین کامل رکھنا اور نئے منظر ناموں کے ساتھ مرحوم قادر جاگانوی نے اردو شاعری کے توسط سے ہی ادب کی آبیاری نہیں کی بلکہ قارئین کو حقیقتوں سے آگاہ بھی کیا ہے۔

ان گنت مفاہیم اپنے اندر سمیٹے ہوئے موصوف کی ایک نظم 'صدائے طوطی' اردو کے باذوق قارئین کی نذر ہے۔

کون بکنے کے لیے آیا تھا بازاروں میں   کون تھا جس کا تھا شور خریداروں میں

کس کے انوار کے پرتو سے یہ چمکا بازار   کون روپوش ہوا حسن خریدار وں میں

یہ تو سب کچھ ہے بجا ، پر او مجاہد بتلا   کون تھا بانیٔ کردار جہاں داروں میں

یا خدا تو ہی سنے گر ، تو سنے ورنہ   کون طوطی کی صدا سنتا ہے نقاروں میں

پھر وہی گرمیٔ جذبات عطا کر قادرؔ   جان باقی ہے ابھی تیرے پرستاروں میں

بکھری زندگی کے اوراق پر نظر ثانی کرتے ہوئے اللہ کے حضور ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگنے پر وہ یقین رکھتے ہیں کہ ایاک نستعین کھرا استعان وہی تو ہے۔۔۔

☆☆☆☆
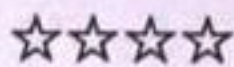
انیسویں صدی میں مشرقی خاندیش کے کہنہ مشق شعرائے کرام اوران کا طرزِ سخن

مضمون نگار : قدوس بیگم این خان

پیدائش : یکم جون ۱۹۵۶ء

تعلیم : بی اے بی ایڈ (پونہ)

پیشہ : ریٹائرڈ معلمہ ایم ٹی پی اردو ہائی اسکول پالدھی

پتا : ۲۰۲ رشیرین اپارٹمنٹ، شیوا جی نگر، جلگاؤں

مشرقی خاندیش کے مرحوم فنکاروں کی جستجو میں ہندوستان بھر میں شائع ہونے والے مختلف رسالوں میں یہاں کے شعراء بہ کثرت چھپتے رہے ہونے کے چندایک ثبوت بھی دستیاب ہوئے ہیں ۔ان میں جو بڑی جانفشانی سے ہاتھ لگے ان کے کلام سے ان کی کہنہ مشقی ٹپک پڑتی ہے۔ بھلے سے ان کے حالات زندگی کے سراغ نہیں مل پائے نہ کہیں سے کوئی اطلاع ملی لیکن فکر وفہم کی پختگی ان کے فن پاروں کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔

قنوج (یوپی) سے شائع ہونے والا عدیم المثال رسالہ پیام عاشق میں مشرقی خاندیش کے کئی شعرائے کرام ۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۲ء بکثرت چھپا کرتے تھے ۔یہ الگ بات ہے کہ ان کے تعلق سے تفصیلی معلومات کا ملنا کٹھن ہوگیا پھر بھی ان کے شائع شدہ کلام سے ان کی کہنہ مشقی اوران کی فکر کی گہرائی کا احساس جاگتا ہے۔تلاش بسیار کے بعد

جناب مجاہد حسین۔ مجاہد حنفی ملکی رسولپوری:

یوں تو دوست کا دشمن ہوجانا کافی چرچا جانے والا موضوع ہے لیکن اسے کسی خاص پیرائے میں بیان کرنے کا ہنر مجاہد حنفی کے پاس بدرجہا اتم موجود ہے۔ وہ اپنی بات کو تشبیہاً چونکا دینے والے انداز

میں شعر کی رگوں میں خون کی طرح بہا گئے۔

ہوئے دوست بھی دشمن جاں ہماری
محبت ہوئی جیسے جاتی تمہاری

جناب میر مقبول علی۔ اختر دھرن گانوی:

شاعری کے لیے دھرن گاؤں (مینا نگر) بہت شاداب زمین کی حیثیت رکھتا تھا جہاں سے ارشد مینا نگری جیسے ادب کے خدمت گزار اٹھے ہیں۔ وہیں میر مقبول علی اپنے نام کی طرح زبان و بیان کو مٹھاس عطا کر گئے۔ لفظوں کی بندشوں کو اپنے تخلص اختر کی طرح چمکانے پر موصوف قدرت بھی رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں مزاج کی رنگینی اور بیان کی پختگی ملتی ہے۔

لبوں پر وہ دھڑی مستی کے اس پر یہ کہا اس نے
کروگی کیا صنم گلشن میں جاکر خون سوسن کا

جناب منشی نیاز الدین۔ نیاز بیاولی:

نیاز صاحب نے اپنے کلام کو جہاں عوام و خواص کے لیے خصوصی انداز بخشا ہے وہیں وہ نصیحت آمیز مفاہیم کو برتنے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی فکری اونچائی کو پرکھنے کے لیے اس زمانے کے لوگ شاید تھک جایا کرتے ہوں گے۔ ایک جگہ وہ طبیب کو دل و جان سے تشخیص پر آمادہ کرتے ہوئے نظر آئے تا کہ کوئی کسر باقی نہ رہ جائے اور مرض جاتا رہے۔ آج بھی اکثر جگہوں پر یہ منظر نظر سے گزر جاتا ہے۔

کیجیے تشخیص بیماری طبیبو غور سے
آہ و نالے اضطراب و چشم گریاں دیکھ کر

جناب بابو سید محمد حفیظ اللہ۔ صیاد نصیر آبادی:

کہاں تھے رات سے صاحب جواب دو تو سہی
مری طرف کو تو دیکھو ذرا سنو تو سہی
بگڑ گئے مری باتوں پہ کیوں بتاؤ تو
قصور کیا ہوا اے جانِ جاں کہو تو سہی
تو یہ قطع تعلق تو ہم سے خوب نہیں
کبھی کبھی ہی ملو تم ملو تو سہی

محمد ابراہیم جلگانوی:

خدا جانے کدھر ہے دیر اور کعبہ کہاں پر ہے
ہمیں معلوم کیا تیری گلی کے رہنے والے ہیں
طبیعت اپنی اپنی ہے جدھر آئی ادھر آئی
پری رویوں پہ ہم حوروں پہ واعظ مرنے والے ہیں

منشی محمد ابراہیم۔ اختؔر جلگانوی:

پھنس کے اس زلف میں دل نے کیا رسوا مجھ کو

دوست سمجھے تھے جسے ہم وہی دشمن نکلا

جناب منشی غلام مصطفی خان۔ اطہؔر جلگانوی:

بکثرت شائع ہونے والوں میں اہم نام غلام مصطفی خان اطہؔر جلگانوی کا تھا۔ اپنی فکر میں جہاں عاشقی اور نازکی کے مضمون باندھتے وہیں کلام کی دھار بھی تیز ہوا کرتی تھی۔ عاشق و معشوق کا ذکر کرتے ہوئے وہ صاف گوئی کو شعر میں ڈھالتے نظر آئے۔ معشوق کی بے رخی اور عاشق کی بے بسی کو اطہر صاحب نے سیاہی کے بدلے خون جگر سے لکھ کر پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔

اپنی فکری گہرائی کو وہ سطحی طور پر بیان میں نہ لاتے ہوئے حقیقت نگاری کے اسلوب بھی اپناتے نظر آئے۔ شاعری میں لفظوں کی ترکیب اور زبان کی چستی اور پھر اس سے جڑا ہوا خوش مزاج مضمون اپنی شیرینی اور گیرائی کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ آپ نے استعاروں، تشبیہات اور محاوروں کے استعمال سے شعریت کو حسن بھی بخشتا تھا۔ ان کا طنزیہ انداز بھی واہ سے خالی نہیں تھا۔

جو تم بے مثل ہو جورو جفا میں — تو میں یکتا مروت میں وفا میں

چلے آؤ گے گھبرا کر مرے گھر — اثر آنے تو دو آہ رسا میں

وہ چھڑک کر نمک یہ کہتے ہیں — زخم دل کے ترے دوا کی ہے

رنگ لایا ہے خون عاشق کا — سرخی ہاتھوں میں یا حنا کی ہے

نیچی نظروں سے یہ ہوا معلوم — آمد آنکھوں میں اب حیا کی ہے

جناب غلام نبی خاں۔ افسؔر جلگانوی:

افسؔر جلگانوی کے بارے میں مفصل معلومات کا ملنا کچھ مشکل ہوگیا تھا لیکن ان کے کلام کی شیرینی اور نازکی سے یہ اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ وہ کتنے سلیس مزاج رہے ہوں گے۔ ان کے کلام میں جدیدیت کا عنصر تو نہیں ہے پھر بھی نازک مزاجی ان کے تخیل کی شگفتگی کا اظہار دلکش انداز میں پیش کیے بغیر نہیں رہی۔ وہ عاشق و معشوق کے روابط کا چرچا کرتے ہوئے فرما گئے کہ لاکھ جتن کر کے اگر بے اطمینانی کی سچی داستان بھی سامنے رکھ دی گئی تو معشوق اونھ کردے گا۔ اتنا ہی نہیں تا حیات غم واندوہ میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے زندگی بے رونق ہو کر رہ گئی ایسا بھی اظہار ملتا ہے۔

کچھ حال دل جو ان کو سناتا ہوں بیٹھ کر — کہتے ہیں یہ تو اور کو پٹی پڑھائیں آپ

دل لے کے خوب سایہ ستا ئینگے رات دن　　　افسرؔ بتوں کی باتوں پہ ہرگز نہ جائیں آپ

برباد گئی مفت میں افسرؔ یہ جوانی　　　صد حیف رہائی نہ ہوئی رنج ومحن سے

اسی طرح درج ذیل شعرائے کرام کی شاعری پر اگر اظہار خیال کیا جائے تو ایک ایک کرکے سارے اصناف اورفن کے سارے محاسن سامنے آجائیں گے۔ کیوں نہ ہوانیسویں صدی کے اواخر میں جلگاؤں کے ان شعرائے کرام کی تخلیقات ملک بھر کے مختلف رسالوں کی زینت بنی ہے۔ بالخصوص پیام عاشق قنوج میں تزک واہتمام سے شائع ہوتے تھے۔ ان کے اشعار آنکھوں سے دل میں در آتے ہیں۔ ان کے کلام کو الگ الگ انداز میں دیکھا، سمجھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ ان کے کلام کے لئے مختلف موضوعات طے کیے جاسکیں گے اور انھیں کی روشنی میں فنکاریت کے جوہر ملتے ہیں۔ حاشیے میں دی گئی سرخیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا کلام اگر دیکھا پرکھا گیا تو زبان پر قدرت اور چست تراکیب کا گمان بیان کی معراج سے واقف کراتا ہے۔

زبان کی سلاست:

جناب منشی گھاسی عرف عبدالغنی۔ محتاجؔ ساودوی:

وہ ہے مری آنکھوں کا تارا　　　کبھی ہوتا نہیں اک پل جدا ہے

اسے محتاجؔ آنکھوں سے نکالو　　　نگاہوں پر تمہاری مرچکا ہے

سرشار ہوں میں عشق رسالت پناہ میں

مصروف ہوں میں نعت حبیب الہٰ میں

محتاجؔ رہنمائی کا میں تو نہیں خضر

رہبر ہے میرا شوق مدینہ کی راہ میں

جناب منشی عبداللہ خان عرف سانڈومیاں۔ اطہرؔ جلگانوی:

پریشان حال رہتا ہے جو اطہرؔ

کسی کی زلف کا سودا ہوا ہے

میری نظروں میں ہے ہر دم وہ صورت　　　تصور جب کیا تو روبرو ہے

بری نیت سے بولے وصل میں وہ　　　کہو سچ کیا تمہاری آرزو ہے

فقط بوسہ کے لینے پر یہ خفگی　　　ابھی کچھ اور میری آرزو ہے

کہوں میں کیا بھلا اپنی زبان سے　　　تمہیں سمجھو جو میری آرزو ہے

یہ رات دن کی لڑائی نہیں مجھے بھاتی
صلح نہ ہوتو اچھی طرح ہوجائے

لکھاجوزلف یار کے پردے میں روئے یار
پھبتی کہی کہ ماہ منور گہن میں ہے

منشی ابراہیم صاحب چشتی نظامی۔ساودوی:

اس زلف یاہ وش کا تصور ہی ہر گھڑی
بے وجہ دل نہیں ہے مرا پیچ وتاب میں

لفظی تراکیب پر دسترس ایسی:

جناب قاضی قربان علی صاحب۔قربانؔ ساودوی:

چشم میگوں کا تصور جو کبھی آتا ہے
لے کے جاتا ہے سوئے خانہ خمار مجھے

تم کو بوسہ نہیں دینا ہے تو دو صاف جواب
گالیاں دیتے ہو کس واسطے ہر بار مجھے

شعلہ رویوں کا ہے رونے میں تصور قربانؔ
آگ پانی میں لگا نا نہیں دشوار مجھے

روئے روشن پر تری ظالم نہ نکلے میرا دم
جان پر وانہ ندائے شمع شبستاں دیکھ کر

پھر گیا ہے مری آنکھوں میں کسی گل رو کا قد
روتا پھرتا ہوں کھڑا سرو گلستاں دیکھ کر

جناب منشی نوازالدین۔نوازؔ ارنڈولی:

ناتوانی نے یہاں تک کیا ناچار مجھے
سانس لینا بھی الٰہی ہوا دشوار مجھے

بدزبانی مری ہوجائے نہ جگ میں مشہور
گالیوں کا تری شکوہ نہیں زنسار مجھے

جناب مولوی اکرام القدر۔اکرامؔ نصیر آبادی:

اے غنچہ گل کی طرح ہنس کے ہر ایک سے
شبنم کی روش تونے رلایا مرے دل کو

جمالیات اور کلاسیکی:

پیام عاشق (قنوج) میں ۱۹ ریں صدی کے آخری دہے میں جلگاؤں کے جو معتبر اور کہنہ مشق شعراء مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں ان میں دوسرا اہم نام منشی عبدالکریم احقرؔ جلگانوی کا ہے۔کہتے ہیں کہ سودا اردو زبان اور مزاج شناسی پر دسترس رکھتے تھے لیکن احقرؔ جلگانوی کے کلام میں بھی وہی صورتحال ابھر کر آتی ہے۔جمالیات اور کلاسیکی کے ساتھ ساتھ وہ رتی بھر جدیدیت کی طرف بھی مڑے ہوئے لگے۔ان کے اشعار اردو زبان کی شیرینی قائم رکھنے پر قادر لگتے ہیں۔مندرجہ ذیل اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ انھوں نے شاعری کو وقت دیا تھا۔

صدر مدرس جناب منشی عبدالکریم۔احقرؔ جلگانوی:

تمہاری گوہر دندان کے آگے
نہیں کچھ موتیوں کی آبرو ہے

کروں کیا داد خواہی پیش خالق
مکر جانا ہی قاتلوں کی خو ہے

شرابِ شوق سے انکار زاہد
کہ احقرؔ آج یہ کیا گفتگو ہے

خراب ہوگئے نہ لو نام آشنائی کا
برا نتیجہ ہے اس آنکھ کی لڑائی کا

عزیز آشنا رہتے ہیں عیب جوئی میں
زمانہ اب نہیں احقرؔ رہا بھلائی کا

سانپ سینے پر نہ لہرائیں ہمارے کیسے
ان کے گیسوئے معتبر ہیں بکھرنے والے

دل تو ٹھنڈا ہو کسی شکل سے اے غیرت مہر
میرے رہنے کو ترا سایۂ دیوار ملے

مشرقی خاندیش کے مرحوم فنکاروں کے لیے انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دہے بڑے زرخیز رہے ہیں۔اس زمانے میں اردو زبان وشاعری کے بال و پر خوب سنوارے گئے۔ان کے یہاں صرفی ونحوی تراکیب کا وجود بھی ملتا ہے یہ کیا کم ہے کہ زبان و بیان کے سارے حسن ان کی شاعری میں ضم دکھائی دیتے ہیں۔بھلے سے جدیدیت اور حالات حاضرہ کے تذکرے کم ہوتے تھے پھر بھی مستقبل کے فنکاروں کے لیے چیلنج سے کم نہیں کہ وہ نقد ونظر کے پیمانے سامنے رکھیں۔

استعارے، تشبیہات، صنعتیں، محاسن، تضاد، مبالغہ، جمالیات، کلاسیکی اور روایت سے ہم آہنگ شاعری کا وہ انمول دور لگتا ہے:

ہیڈ ماسٹر جناب منشی محمد حسین۔سرورؔ دھرن گانوی:

ہجر جاناں میں عجب ہوگئی حالت میری
نہ رہا دین نہ دنیا سے سروکار مجھے

غلام رستم خان۔اطہرؔ جلگانوی:

تو مائل گیسو نہ ہوتا اے دل ناداں
گرفتار ہرگز نہیں ہوتے نہیں ہوتے
کس کے خاطر اجی بن ٹھن کے ہوئے تیار

کس کے گھر آج چلی ہو کہو مہمان ہو کر

مرہم وصل ہے درد کا ر طبیب ناداں ۔۔۔ زخم دل یوں مرے ہرگز نہیں بھرنے والے

سحر الفت میں کبھی بھول کے رکھنا نہ قدم ۔۔۔ اسکے ڈوبے نہیں اطہرؔ ہیں ابھرنے والے

جناب شیخ تاج محمد۔اطہرؔ جلگانوی:

ناز و ادا و عشوہ و غمزہ غضب کے ہیں

کس کس بلا سے کوئی آکے بچائے دل

جناب منشی رحمان خان۔راویری:

عیاں ہے چشم سے ابرو سے تیر مژگاں سے

کسی سے مورچہ باندھیں گے یہ لڑائی کا

جناب عبدالغنی۔محتاجؔ ساودوی:

اس ماہ وش کو پائے جدا مجھ سے کردیا

کیا مجھ سے رنج اس دل چرخ کہن میں ہے

بی سکینہ نازؔ:

جلگاؤں کی سب سے پہلی شاعرہ بی سکینہ نازؔ تلمیذ حضرت علیم اللہ خیالیؔ برہانپور۔بی سکینہ نازؔ کو تپ دق کے آزار نے ہم سے چھین لیا۔تاریخ وفات ۱۹۰۴ء ہے۔مرحومہ کا کلام جلگاؤں کے سب سے پہلے شعری ماہنامہ ''نغمۂ عندلیب'' کے شمارے ۱۸۹۲ء سے لیا گیا ہے۔

کفِ پا کو تری رشک یدِ بیضا دیکھا

جنبشِ لب ترا اعجازِ مسیحا دیکھا

بے خودی کا ہو بُرا ،دید سے محروم رہے

بے حجاب آئے اگر وہ تو یہ پردا دیکھا

وہ سلطنت کو جہاں کی مٹائے بیٹھے ہیں ۔۔۔ تمہارے در پہ جو دھونی رمائے بیٹھے ہیں

سنا ہے آج وہ پردا اٹھائے بیٹھے ہیں ۔۔۔ نکھر کے آج لبِ بام آئے بیٹھے ہیں

الٰہی شوقِ شہادت کا باغ ہو سرسبز ۔۔۔ وہ آبِ زہر سے خنجر بجھائے بیٹھے ہیں

اٹھے تو درد اٹھے ہم تو اٹھ نہیں سکتے ۔۔۔ وہ میرے دامنِ دل کو دبائے بیٹھے ہیں

چلو تو حضرتِ واعظ دکھادوں قدرتِ حق ۔۔۔ نقاب رخ سے وہ اپنا اٹھائے بیٹھے ہیں

سکینہ ناز نے چرچا کیا ہے مجلس میں
یہی سبب ہے کہ وہ منہ چھپائے بیٹھے ہیں

انتھک کوششوں کے بعد بھی مشرقی خاندیش کے اکثر مرحوم فنکاروں کی معلومات حاصل کرنے میں کامیابی نہیں مل پائی۔ ان میں درج ذیل شعرائے کرام بھی شامل ھیں جن کے کلام کی پختگی ہر ذی فہم قاری کو چونک جانے پر آمادہ کرتی ھے۔ جن کے کلام کی روانی آج تک گوہر نایاب کی طرح ھے۔

جناب اصغر علی۔ فتنہؔ جلگانوی:

موصوف کی تاریخ وفات تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکی۔ ان کا کلام جو ۱۸۹۳ء کے ماہنامہ ''نغمۂ عندلیب'' میں شائع ہوا تھا وہ کلام بزم یاران قہقہہ فروش جلگاؤں کا ترتیب شدہ مجموعہ 'سخن در سخن' (۱۹۸۶ء) سے لیا گیا ہے۔

اس قدر حال پریشان نہ تھا خوار نہ تھے
جب تلک شیفتۂ گیسوئے خم دار نہ تھے
نالے کب عرشِ معلیٰ کے مرے پار نہ تھے
دادخواہ تجھ سے کب اے چرخِ ستم گار نہ تھے
کھینچ کر وحشتِ دل لائی ہے صحرا کی طرف
کاہے کو آتے جنوں واقفِ اسرار نہ تھے
کب تسلّی دلِ مایوس کی کرتے نہ تھے تم
مجھے کب وصل کے انکار تھے اقرار نہ تھے
کیوں رہیں کوچۂ جاناں میں نہ عاشق مرکر
باغ فردوس کے رضواں یہ طلب گار نہ تھے

پیام عاشق (قنوج) کے علاوہ ایک رسالہ 'گلزار خلد' بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ اس رسالہ میں مشرقی خاندیش کے چند مرحوم شعراء کا کلام ۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۵ء کے دوران بکثرت شائع ہوا ہے۔ ان میں نعت پاک اور حمد وثناء کی افراط تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ بیسویں صدی کے پہلے دہے میں یہاں کے شعرائے نعت

پاک، حمد وثناء، منقبت اور قصیدہ خوانی کی جانب تیز گام رہے تھے۔

جناب شیخ بھکن حاذقؔ دھرن گانوی:

سراسر نور خالق ہے عجب کچھ حسن ہی تیرا
خدا نے شکل تیری یا نبی سانچے میں ڈھالی ہے

جناب شیخ امیر صادق دھرن گانوی:

گل رخسار احمد کا میں واعظ دل سے شیدا ہوں
طبیعت حورو غلماں پر مری کب آنے والی ہے

جناب شیخ علی محمد صاحب :

روز محشر کا نہیں واعظو کھٹکا مجکو
مل گیا شافع محشر کا وسیلا مجکو
واعظو خوف نہیں قبر کی ظلمت کا مجھے
زلف محبوب الٰہی کا ہے سودا مجکو

جناب مولوی محمد اسماعیل ۔فوقؔ ساودوی:

لِلّٰہ الحمد ہے کیا خوب طبیعت میری
ہوگئی نعت نبیؐ کہنے کی عادت میری
چھوڑ کوئے نبیؐ میں نہ کبھی جاؤں گا
راہ تکتی ہے تو تکتی رہے جنت میری
نعت محبوب الٰہی کی بدولت واللہ
بڑھ گئی فوق بہت عزت و حرمت میری

جناب یوسف خاںؔ ۔یوسفؔ دھرن گانوی:

جلوہ گر نور خدا حضرت کے رخ پر ہوگیا — ماہ انور اوج خوبی پر منور ہوگیا
نعت گوئی کا سلیقہ اب تجھے یوسف ہوا — خدمت استاد سے یہ فن میسر ہوگیا

جناب منشی بگو میاں افسرؔ دھرن گاؤں:

لو مسلمانو خدا کا فضل تم پر ہوگیا — مرحبا پیدا شفیع روز محشر ہوگیا
ہوگئی پوری تمنا دل کی بر آئی مراد — مرحبا عشق شفیع روز محشر ہوگیا

جناب منشی حسام الدین مضمرؔ دھرن گانوی:

جب سے دل مصروف یادروئے انور ہوگیا
بیچ آنکھوں میں فروغ مہر خاور ہوگیا

اک یہ ادنیٰ معجزہ ہے آپ کے اوصاف کا
نرمی گفتار شہ سے موم پتھر ہوگیا

کیوں نہ دکھلائے بہاریں تو زمین نعت میں
جب ترا استاد راغب سا اے مضمرؔ ہوگیا

جناب شیخ محمد عباسؔ ساودوی:

دلوں میں آگئے دل عاصیوں کے محشر میں
خبر سنی جو شفیع الوریٰ کے آنے کی

زمین پہ گر گئے بت سارے سر کے بل عباس
خبر سنی جو رسولِ خدا کے آنے کی

جناب منشی ثمرو صاحب ثمرؔو پارولوی:

ہم مدینے کے چلے عشق کا سودا لے کر
دل میں محبوب الٰہی کی تمنا لے کر

جناب حسین خان صاحب حسین فیضپوری:

جو روشنی ہے نقش کف پائے شاہ میں
اے چرخ وہ نہیں ہے تری مہرو ماہ میں
مرجائے یہ حسین مدینہ میں پہنچ کر
یارب یہ التجا ہے تری بارگاہ میں

جناب شیخ عبداللہ۔ غریبؔ مصطفی آبادی:

ہے طبع میری مدحت خیر الوریٰ پسند
اور دل ہے میرا الفت شاہِ ہدیٰ پسند
جن کو ہوئی نصیب گدائی حضورؐ کی
کب کرتے ہیں وہ دولتِ دنیا بھلا پسند

جناب محمد یٰسین۔ اطہرؔ پارولوی:

روزِ جزا کی گرمی سے کیا اُن کو خوف ہے
جن کو ہوئی ہے الفتِ خیر الوریٰ پسند

جناب شیخ امیرؔ پارولوی:

خالق نے اپنا فضل کیا تجھ پہ اے امیرؔ

تجکو ہوئی ہے الفت خیر الوریٰ پسند

جناب حکیم محمد اسحاق۔طالبؔ پارولوی:

بتلاؤں یا نبیؐ دل فرقت زدہ کی بات
پوچھیں تو آپ مجھ سے کہ ہے تجکو کیا پسند
خالق کا شکر کیوں نہ کروں رات دن غریب
ہے طبع میری مدحت خیر الوریٰ پسند

جناب منشی عبدالقادر پارولوی:

کب وہ کہتا ہے تمنا خلد کی اے زاہدو
جس کے دل میں شوق طیبہ کا سراسر ہوگیا

منشی نور محمد۔نورؔ دھرن گاؤں:

صدق دل سے جو ثناخوان پیمبر ہوگیا
بچ گیا دوزخ سے اوپر لطف داور ہوگیا
میں ثناخوانِ حبیب ربِّ اکبر ہوگیا
مدح کے باعث جہاں میں شور گھر گھر ہوگیا

جناب یاسین خاں یاسینؔ دھرن گانوی:

ان دنوں تابندہ کیا نجم مقدر ہوگیا
سامنے آنکھوں کے حسن روئے سرور ہوگیا
تیرا آنا کیا ہوا اے گلشن خوبی یہاں
خار سے بدتر چمن میں ہر گل تر ہوگیا
مفت میں یاسینؔ تو نے زندگی برباد کی
کیوں مدینہ کو نہ جاکر سائل در ہوگیا

جناب منشی شیخ لال کوثرؔ دھرن گانوی :

مرے سر پر سایۂ لطف پیمبر ہوگیا
میں نذر روز قیامت سے مقرر ہوگیا
شعر لکھنے کا سلیقہ کچھ نہ تھا کوثرؔ مجھے
حضرت راغبؔ کے صدقے میں سخنور ہوگیا

جناب منشی محمد ابراہیم منشی ساودوی:

یا نبیؐ ہے ترے ملنے کی تمنا دل میں
آرزو اور نہیں ہے مرے مولا دل میں
نہ ہوئے ہائے گدائے درِ سلطان رسل
لے کے حسرت یہ گئے قیصر و دارا دل میں

پیام عاشق (قنوج) اور گلزار خلد (قنوج) ان رسالوں نے تو مشرقی خاندیش کے فنکاروں کو کافی عزت بخشی تھی۔علاوہ ازیں میرٹھ سے نکلنے والا رسالہ 'جلوۂ یار' بھی یہاں کے شعراء کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ان دنوں طرحی مشاعروں اور طرحی غزلوں کا دور خوب چلتا رہا۔جلوۂ یار میں ایک

طرحی محفل کا انعقاد ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا۔ طرحی مصرعہ تھا ''صدق دل سے جو پیمبر کا ثناء خواں ہوگیا'' مصرعہ طرح پر نعت پاک بھی کہی گئی اور روایت کے ساتھ جدید فکر وفن کا بھی اظہار ہونے لگا تھا۔ اس زمانہ میں جن شعرائے کرام کا کلام جلوۂ یار میں شامل کیا گیا تھا ان کی غزلوں میں محض نغمگی ہی نہیں بلکہ فکری پرواز کی بلندی بھی قید تھی۔

بقول مرحوم صابر زاہدؔ ؎

کنواریوں کے بدن سی لچک ھے لفظوں میں
کساؤ ایسا کہ لگتے نہیں ھیں برتے ہوئے

(اس شعر کے نفس مضمون کی روشنی میں)

جناب منشی محمد عبدالعزیز۔ دردؔ ایرنڈولی:

دشت نازک میں جو دیکھا آپ کے رنگ حنا — خون ہوکر دل مرا لعل بدخشاں ہوگیا
چٹکیاں لینے لگا اے دردؔ دل میں شوق وصل — جب کسی وعدہ شکن سے عہد و پیماں ہوگیا

منشی سید اصغر علی اصغر۔ ورن گانوی:

بے نقاب اس شوخ کا جب روئے تاباں ہوگیا — آئینہ ششدر خجل مہر درخشاں ہوگیا
چاہ میں اسکی ہی اصغرؔ یوسف دل اپنا غرق — چاہ کنعاں یار کا چاہ زنخداں ہوگیا

منشی امین الدین۔ امینؔ بیاولی:

صدق دل سے جو پیمبر کا ثناخواں ہوگیا — سچ تو ہے اسکا حصہ باغ رضواں ہوگیا
خوف کیا اعمال بد کا روز محشر اس کو امینؔ — لطف فرما جس پہ وہ محبوب سبحاں ہوگیا

جناب محمد ایوب خاں۔ تجملؔ دھرن گانوی:

زلف رخ سے جب ہٹائی جائے گی — صبح ہوگی رات کالی جائے گی
دل کے جانے کا تحملؔ رنج کیا — چیز ہے یہ جانے والی جائے گی

جناب منشی محمد عباس خاں۔ ایمانؔ بیاولی:

ہر داغ دل کا جب پس مردن بنا دیا — فن شہد ناز کا روشن بنا دیا
ایمانؔ دین دار تھا لیکن خدا کی شان — اک بت کی دوستی نے برہمن بنا دیا
مرے حق میں بس یہی رشک مسیحا کیجئے — آپ کا بیمار میں ہوں مجھ کو اچھا کیجئے
اب تحملؔ بھی تحمل سے لیا کرتا ہے کام — جتنا دل میں آئے اس پر ظلم اتنا کیجئے

جناب منشی ہدایت علی۔رہبر مصطفیٰ آبادی:

محمد بادشاہ اِنس و جاں ہے　　　محمدؐ تاجدارِ دوجہاں ہے
جو رہبرؔ فاتحہ کو آئے بولے　　　شہد ناز کی تربت کہاں ہے

منشی موسیٰ خان۔مہمانؔ پارولوی:

روئے زیبا جو دکھانا ترا دستور نہیں　　　زندہ دنیا میں بھی رہنا ہمیں منظور نہیں
بن کے مجنوں نہ بھٹک یار کی خاطر مہماںؔ　　　ڈھونڈ دل ہی میں ذرا دل سے تو وہ دور نہیں

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں (۱۹۲۰ء کے بعد) دھولیہ سے ایک رسالہ البدر شائع ہوا کرتا تھا۔یہ رسالہ کافی مقبول تھا جس میں شائع ہونے والے فنکار بڑی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔آج تک دھولیہ اور مالیگاؤں اردو زبان وادب کے ناقابل تسخیر قلعے ہیں۔

۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء میں مشرقی خاندیش کے بیشتر شعراء کا کلام البدر میں شائع ہو چکا تھا جو معنی آفرینی، جمالیات، روایت پسندی، قصیدہ اور ہلکے پھلکے نئے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔وہ کلام بھی مختصراً سامنے آیا ایسا لگتا ہے کہ اس زمانہ میں دو چار پانچ اشعار ہی بغرض اشاعت پسند کیے جاتے رہے ہوں گے۔ایسا نہیں بھی ہوسکتا ہے۔مرحوم جاں نثار اختر نے کہا تھا ؎

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

بالکل اسی کی وضاحت وروشنی میں البدر نے درج ذیل شعراء کو جگہ دی ہوگی ہوسکتا ہے۔۔۔نہیں بھی!

سید اشرف علی۔سیدؔ جلگانوی:

جب سے مجھکو عشق ترا ہوگیا　　　اے بت کافر میں رسوا ہوگیا
ہوگیا سیدؔ کو شوقِ شاعری　　　دل دہی کا شغل اچھا ہوگیا

جناب بھکاری میاں۔نشترؔ ارنڈولی:

اے صنم میں کروں کس منہ سے شکایت تیری　　　ہے لگی منہ پہ مرے مہر محبت تیری
مرگیا پر یہ نہ ہوا وصلِ دلِ آرام نصیب　　　مفت برباد اے نشتر گئی محنت تیری

جناب منشی محمد عبداللہ۔اطہر ساودوی:

مدینہ یا الٰہی دہر میں کیا یکطرفہ بستی ہے　　　کہ عرش پاک سے جس خاک پر رحمت برستی ہے

اے اطہرؔ تیرے دل میں کیوں ہو خطرہ روزِ محشر کا
کہ دستِ شافعِ محشر میں تیری سر پرستی ہے

جناب محمد طاہر۔ طاہرؔ فیضپوری:

نار میں نور تیرا جل میں ہے جلوہ تیرا
گل میں بو ہے تیری بلبل میں ہے نغمہ تیرا

طاہرؔ خستہ پہ ہو جائے عنایت کی نظر
خادم فخرِ رسل اور ہے بندہ تیرا

شیخ سکندر۔ سکندرؔ جلگانوی:

ستانے میں کمی کب یہ ستم ایجاد کرتے ہیں
جفا پر اک جفا بیداد پر بیداد کرتے ہیں

سکندرؔ اس کا رتبہ آسماں سے کم نہیں ہوتا
توجہ جس زمینِ شعر پر استاد کرتے ہیں

جناب مولوی غلام مصطفی خاں۔ اطہرؔ جلگانوی:

اشہب طبع رواں کتنا ہی جولاں ہوگا
طے نہ نعت شہ لولاک کا میداں ہوگا

پاک ہے حشو و زوائد سے کلام اطہرؔ
داد اس کی وہی دے گا جو سخنداں ہوگا

جناب عبدالعزیز۔ شادؔ ارنڈولی:

ہوا ہے عشق زلفِ عنبریں سے
رہے گی چھیڑ مارِ آستیں سے

لعل خاں گوہرؔ:

جنھیں ہے عشق و الفت شاہِ دیں سے
وہ جنت لیں گے رب العالمین سے

صفت اے گوہرؔ ان کی کیا لکھوں میں
کہ درباں جن کے ہیں روح الامین سے

جناب منشی محمد قاسم پارولوی:

ہوائے چمن دلکشا ہو رہی ہے
گلوں کی مہک فرح زا ہو رہی ہے

جناب منشی قطب الدین۔ شعلہؔ رئیس پارولوی:

کل تری شان تھی کیا آج یہ حالت کیا ہے
حیف اے مسلم خوابیدہ یہ غفلت کیا ہے

میں ہوں مدہوش عشق خدا میں شعلہؔ
راحتِ دہر ہے کیا مجھ کو مصیبت کیا ہے

جناب مرزا کریم بیگ۔ اخترؔ بھساولی:

غرض کیا ہے پتہ پوچھیں کسی سے کوئے قاتل کا
ہماری رہبری کو شوق ہے یا ولولہ دل کا

شہادت کی تمنا میں بہت مشتاق آتے ہیں
چلو اخترؔ تماشا دیکھیں چل کر کوئے قاتل کا

جناب میاں خان۔ احسان بھساولی:

الٰہی کب گزر ہوگا کسی زہرہ و شمائل کا
مقدر چمکے گا کس دن ہمارے خانۂ دل کا

خدا کے فضل سے ایمان کی دولت ملی مجھکو
ہوا احسان مجھ پر جب مرے استاد کامل کا

جناب حافظ ایس ایم۔ حافظ بھساولی:

کوئی پکار اٹھے کہ دُہائی حسین کی
بھاگو ہٹو سواری وہ آئی حسین کی

اکبرؓ کے واسطے علی اصغرؓ کے واسطے
حافظ کو ہو نصیب گدائی حسین کی

محمد ہاشم۔ بسمل ساودوی:

کہتی تھی رو کے ان میں یہ جالی حسین کی
دیتی نہیں ہے شکل دکھائی حسین کی

بسمل جلاتی ہی رہے گی آتشِ فراق
جب تک نہ شکل دے گی دکھائی حسین کی

محمد ابراہیم۔ درویش ساودوی:

اے مومنو ہے ساری خدائی حسین کی
ہر سمت ہے جہاں میں دہائی حسین کی

یاروں نے سن کے بزم درویش سے کہا
کیا خوب تم نے مدح سنائی حسین کی

محمد عبدالعزیز۔ شاد ایرنڈولی:

دل میں ہے میرے ساری خدائی حسین کی
کیونکر نہ ہو جہاں میں دہائی حسین کی

اے شاد کیوں اسے نہ ملے خلد میں جگہ
کرتا رہے جو مدح سرائی حسین کی

عاشق بھساولی:

الفت ہے جس کے دل میں سمائی حسین کی
لیتا ہے شاہی دے کے گدائی حسین کی

عاشق کہوں گا داورِ محشر کے سامنے
لوٹا ہے شامیوں نے کمائی حسین کی

مولانا غلام پیمبر۔ ساودوی:

کیا خاک اس کو نارِ جہنم جلائے گی
الفت ہے جس کے دل میں سمائی حسین کی

قبلہ و کعبہ اپنا سمجھ کر جھکا یا سر
دہلیز جب نظر مجھے آئی حسین کی

کشور صاحب۔ مصطفیٰ آبادی:

ہے نور حق حسین خدائی حسین کی
روشن ہے مثل مہ بھلائی حسین کی

ذرہ میں بھی ہے جلوہ نمائی حسین کی
دیکھے تو کوئی آ کے صفائی حسین کی

ہر سمت ہے جہاں میں دہائی حسین کی

منشی امام الدین چشتی ۔ساودوی:

لگا ہے وار ایسا خنجر ابروئے قاتل کا — تڑپتا ہی رہا مقتل میں لاشہ اسکے بسمل کا

مریدؔ خادمؔ و بندہ امام الدین چشتی کاؔ — ابوالبرکات شہ برہانپوری پیر کامل کا

۱۹۴۳ءتا ۱۹۴۷ءآگرہ سے شائع ہونے والا رسالہ 'شاعر' بھی چھان بین کے دوران سامنے آیا ۔اس رسالہ میں بھی مشرقی خاندیش کے شعراء کی شرکت کے ثبوت ملتے ہیں۔اس زمانہ میں شاعر نے جن شعراء کو جگہ دی تھی ان کی فہرست مختصر ہی سہی لیکن فن کے اعتبار سے جامع تھی۔جن شعراء کا کلام شاعر میں شائع ہوا کرتا تھا ان کے کلام کی پرواز کافی بلند بھی رہی جیسے مطلب پرستی پر لعن طعن، انسان کا بھیس بدل کر دغا دینا، حالات نے اتنا بے چین کر دیا کہ زندگی بے لطف ہو کر رہ گئی، حب الوطنی کے جذبات، اپنے وطن کو جنت سے تشبیہہ دینا، شاعری کو دل بہلانے کا وصیلہ بھی سمجھنا، عمر کے آخری حصے میں بھی شاعر اپنے یار کی واپسی کا انتظار کرتا ہے، جلوہ حسن کو مبالغوں کی طرح استعمال کرنا وغیرہ وغیرہ مفاہیم برتے گئے تھے جن سے قارئین چپکے رہا کرتے تھے۔اور اشاعت نے سر بلند رکھا۔اسی لیے شاید غالب نے کہا تھا ؎

غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں نئے نئے

(بالکل اسی پس منظر میں مشرقی خاندیش کے وہ شعراء جو شاعر میں شائع ہوئے تھے)

جناب نصیرانصاری ۔بیاولی:

ہے وطن کی سرزمیں بے حد حسیں میرے لیے — بھیج دی اللہ نے جنت یہیں میرے لیے

شاعری سے ہی میں بہلاتا ہوں اپنا دل نصیرؔ — ہے یہی الفت میں شغلِ بہتریں میرے لیے

جناب حکیم ایرنڈولی:

لے لیا مقدر نے آج امتحاں اپنا — ورنہ در کہاں ان کا اور سر کہاں اپنا

شیخ و برہمن جائیں دیر اور حرم جائیں — ہم نے ڈھونڈ رکھا ہے اک الگ مکاں اپنا

جناب وکیل ایرنڈولی:

اسی امید میں اب عمر بسر ہوتی ہے — دیکھیں کب ہم پہ عنایت کی نظر ہوتی ہے

چھوڑ کر ان کو رہوں کس کے سہارے میں وکیل — وہ جدھر ہوتے ہیں مخلوق اُدھر ہوتی ہے

جناب وحشتؔ انصاری املنیری:

جلوۂ حسن ازل وہ جو نمایاں کردیں
ذرہ ذرہ سے عیاں طور کا ساماں کردیں
ساتھ آئے ہیں بہاروں کو وہ لیکر وحشتؔ
آج وحشی نہ کہیں چاک گریباں کردیں

جناب حیدرؔ املنیری:

ملک کی جڑ جو کھودتے ہیں اپنے مطلب کے لیے
حیف ہے ان پر کہ جو ہندی ہیں حرص وآز کے

جناب معصوم انصاری۔ بیاولی:

اب سکون زندگی باقی نہیں میرے لیے
اک مجسم درد ہے جانِ حزیں میرے لیے
گو بہت بیزار ہیں معصومؔ وہ مجھ سے مگر
بھیجتے ہیں پھر بھی پیغام حسیں میرے لیے

جناب قاضیؔ بینانگری:

جب تصور میں تری راہگذر ہوتی ہے
منزلِ عرش سے بھی دور نظر ہوتی ہے
اشک تر دردِ تمنا زبان ہے قاضیؔ
بیکلی دل کی ہم آہنگ نظر ہوتی ہے

دارلسرور جسے برہانپور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اردو زبان وادب اور نثر ونظم کے میدان میں نادر المثال گاؤں ہے جہاں جید علمائے دین، بزرگان دین اور مشاہیر اہل قلم بودوباش اختیار کیے ہوئے تھے۔ اولیائے کرام کی زمین چاہے شعراء کی کہہ لیجئے کہیں سے بھی غلط نہیں۔ وہیں سے ۱۹۲۶ء کے آس پاس ''نسیم بہار'' ایک رسالہ نکلتا تھا۔ مشرقی خاندیش کی آخری حد برہانپور ہے۔ یہاں کے شعراء اور دیگر نثر نگار اکثر اپنا کلام وتخلیقات بغرض اشاعت روانہ کرتے تھے اور نسیم بہار نے ان کا خیر مقدم بھی کیا۔

۱۹۲۶ء میں 'نسیم بہار' میں جن کا کلام شائع ہوا تھا ان کے کلام میں شائستگی کے ساتھ مذہبی رواداری کے ذکر بھی ملتے ہیں۔ نعت گوئی کے فن کو انھوں نے فکر کے خون سے سنوارنے کی کوشش کی تھی۔ یوں تو آپؐ کی حمد وثناء کے لیے پوری کائنات بھی ادھوری پڑ جائے گی پھر بھی ان کے کلام میں آپؐ کے عشق میں ڈوب جانا اسی طرح پسند کرتے تھے جیسا شمع کے گر پروانے کا حال ہوجاتا ہے۔ جہاں عشق کی بات ہوتی انھوں نے اپنے آپ کو اس قدر لاغر بتایا کہ قوت گویائی جیسے ختم ہوگئی۔ شعریت کے ساتھ ان کے کلام میں تبلیغ کے عنصر بھی ملتے ہیں۔ دنیاداری میں اپنی پوری عمر کھپادینے کو انھوں نے برا گردانا اس لیے کہ عقبیٰ کا خیال آجاتا تھا۔

اس طرح نت نئے موضوعات بھی ان کے قلم سے رواں ہوئے ہیں۔ ان قلمکاروں میں 'نسیم بہار' کے

توسط سے۔ جن کے نام ملے ہیں ان کے کلام میں مذکورہ بالا احساسات کو بخوبی سمجھا و پرکھا جا سکتا ہے۔

منشی حسین خاں۔ اختر املنیری:

کیوں میں بھولوں انہیں کیوں یاد نکالوں دل سے
چار یاروں سے بڑی شان ہے یارانے کی

شمع رخسار محمدؐ پہ فدا ہوتا ہوں
وہی حال اپنا ہے حالت ہے جو پروانے کی

منشی عبدالکریم۔ قالبؔ املنیری:

ابھی آئے ہو ابھی باتیں ہیں گھر جانے کی
خوب تدبیر ہے اے جان مرے تڑپانے کی

پی کے چلو ہی میں ہم مست رہیں گے قالبؔ
ہم کو شیشے کی ضرورت ہے نہ پیمانے کی

سوال وصل کا کیوں اس قدر ملال کیا
یہ ہم نے آپ سے بیجا سوال کیا

لگا بجھا کے رقیبوں نے کچھ نہ کچھ قالبؔ
مری طرف سے انھیں آج بد خیال کیا

منشی فقیر محمد مومنؔ۔ پارچہ فروش، نصیر آبادی:

اس قدر لاغر ہوا ہوں عشق کے آزار میں
تاب گویائی نہیں ہے اب ترے بیمار میں

کام دنیا کے سوا کچھ نہیں عقبی کا کیا
عمر مومنؔ سب گزاری آپ نے بیکار میں

منشی جمال احمد۔ روشنؔ بھساولی:

خاک پا ہاتھ آئے گر شبیرؓ کی
پھر نہ خواہش ہو مجھے اکسیر کی

آپ کی فرقت میں یا شاہ اُمم
لب پہ جان ہے عاشق دلگیر کی

فوجیؔ جلگانوی:

۱۹۳۵ء میں فوجی صاحب جلگاؤں میں پیدا ہوئے یہاں مزاحیہ شاعری میں ان کا کوئی ثانی گزرتا نظر نہیں آیا جبکہ مزاح نگاری میں گردوں مارولوی کا مقام بلند تر ہے۔ آپ کی شاعری کا مقصد ہی ہنسنا ہنسانا تھا۔ انھیں مقامی لب ولہجہ میں شاعری کرنے پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے ہنسانے کی خاطر نت نئے مضمون باندھے تھے۔ ہر چند کہ راستے سے گزرتے والی کار دھول کا ایک طوفان اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہے جس کی وجہ سے راہگیروں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن انھوں نے وہ احساس راہگیروں سے ذہن سے با آسانی صاف کر دیا اور انھیں جیسے نسیان ہو جانے کے اندیشوں میں گم رکھا۔

بڑی عمر والوں کی شادی پر بھی انھوں نے مزاح کے پیمانے چھلکائے ہیں۔ موضوعات و مفاہیم آسانی سے سمجھ میں آجایا کرتے ہیں۔ محسوس یوں ہوتا ہے کہ محفلوں میں ان کی آمد کا انتظار ہوتا تھا۔ ماحول زعفران زار ہو جاتا اور وہ چلے جاتے تو اداسی چھا جانے لگتی تھی۔ ان کا درج ذیل کلام ماہنامہ

'اردو میلہ اگست ۲۰۰۲ء ناگپور' سے ماخوذ ہے۔

کار والے بھلا یہ کیا جانیں
کتنی آنکھوں میں دھول جاتی ہے
اپنی جنتا ہی بھولی بھالی ہے
پوچھ لیتی ہے بھول جاتی ہے

ہاں نکاح کرلیا تھا منھ میں بٹھا کر چوکا
خوش تھا بوڑھا کہ دیا خوب سنہری دھوکا
چھینک دلہن نے جو لی ہوش ٹھکانے آئے
ہاتھ میں آگیا دولہا کے دولہن کا چوکا

وہ اپنی کھڑکی میں آکے بھونڈے سروں میں گنگنا رہے ہیں
تو کھٹ کی گاڑی پہ ہم بھی بیٹھے گھمیلا پھٹکا بجا رہے ہیں

ثمر جلگانوی۔ احمد خان:

ان کے اشعار میں طنز کی گہرائی نظر آتی ہے۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں انھیں قدرت حاصل تھی۔ انتہائی ظریف شخص تھے اور خوش گپیاں ان کی روح کی غذا تھی۔ اشعار رواں دواں اور سہل ممتنع میں کہتے تھے۔ چند شعر دیکھئے:

زمین والے دیکھنے والے
آسمان پر رہا کرے کوئی
عقل پر جن کی پڑ گئے پتھر
ایسے لوگوں کا کیا کرے کوئی

اپنے مطلب کے سوا کچھ بھی نہیں
اے ثمر دنیا اسی کا نام ہے

دنیا میں فقط انساں اتنا نظر آتا ہے
آتا نظر آتا ہے جاتا نظر آتا ہے

چند جانے انجانے شعرائے کرام:

تذکروں کے درمیان ریاست مہاراشٹر ہی نہیں ہندوستان بھر میں شائع ہونے والے مختلف

رسالوں میں جیسے نگار، دیارِ سخن اور الحافظ مشرقی خاندیش کے چند شعرائے کرام کا مختصر سا کلام بھی زیر قلم آتا ہے۔ حالات زندگی کا ذکر تو اب افسانہ لگتا ہے پھر بھی پھول نہ سہی پنکھڑی تو ہے کے مترادف فکری پروازوں پر بھی خامہ فرسائی ہونی چاہئے تا کہ سند رہے۔

جہاں شاعری مختلف رجحانات سے بھری پڑی ہے وہیں میر تقی میر کا ذکر آتے ہی قنوطیت کے دروا ہوجاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مایوسی کفر ہے البتہ اس مکتب فکر کے فنکاروں کی فنکاریت کیا فراموش کی جاسکے گی؟ نہیں۔۔ میر اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اے ایچ خان انجمؔ بھڑگانوی:

حالات کیسے ہوں لیکن انسان تصورات کی دنیا میں اپنی مرضی کا کل مختار ہوتا ہے۔ وہ اقرار سے کام لیتا ہے تو کبھی انکار یہ لب ولہجہ کی پرتیں سنوارنے لگتا ہے۔ ایسا قطعاً نہیں کہ جب تک زندہ رہے سب کچھ حاصل ہوگیا۔ یہ تو خواب کی ایک صورت ہے۔ کچھ لوگ غموں سے اسقدر مانوس ہوجاتے ہیں کہ انہیں یاسیت کے علاوہ کسی اور جذبے سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ وہ یوں رقمطراز ہیں۔

تصور کو آج اوج پر پا رہا ہوں — فضائے دو عالم پہ میں چھا رہا ہوں
خوشی کے اجالے سے کیا کام انجمؔ — ابھی مشعل غم کو بھڑکا رہا ہوں

منشی شہید حسین۔ شہید چالیس گانوی:

خالق کائنات کو یاد کرنا خوش بختی کی علامت ہے اسے یاد کرنے کیلئے کسی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی قدرت کائنات کی ہر چیز سے ظاہر ہوتی ہے۔ بہانے سب بے معنی ہونے لگتے ہیں اگر ایسا ہوا تو ایمان کی کمزوری ہے۔ آنکھ سے آنکھ لڑنا بہرحال زباندانی میں نکھار پیدا کرتا ہے لیکن اس کو شعر میں اسطرح سے پرویا جائے کہ تصوراتی زندگی کو فروغ ملے پھر تو سننے میں اچھا لگتا ہے حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔

یاد اُس دم مجھے اللہ کی قدرت آئی — آنکھ سے آنکھ لڑی دل میں محبت آئی
کھینچ کر خنجر ابرو یہ کہا قاتل نے — لو مبارک ہو شہیدؔ آپ کی نوبت آئی

شاکرؔ جلگانوی:

محبت میں جنوں نگاری کا ذکر چلے تو لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا کے واقعات تاریخ کے صفحات پر پھیلے پڑے ہیں۔ گلشن، پھول، موسم اور بہاروں کے استعمال سے شعراء اپنی ذاتی کیفیت کا اظہار بھی کر گئے۔ مبالغوں سے شعریت دیر تک قائم نہیں رہتی، ہاں نزاکتیں، ترکیبیں، لفظوں کے استعمال

،محاوروں کا برتاؤ اور خیالات کی رنگینی وقتی طور پر سماعتوں سے گزر کر کچھ دل جوئی کے سامان ضرور مہیا کرتی ہے ؎

مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری بالآخر رنگ لے آئی محبت کی جنوں کاری
نہ برگ وگل پہ شادابی نہ غنچوں پر خوشی طاری عجب انداز سے گلشن سے گزری ہے بہار اب کے

ظاہرؔ بھڑگانوی:

انیک شاعروں نے غزل کے لغوی معنیٰ کو ہو بہو استعمال کیا ہے جن کے کلام کی روانی بے ساختہ واہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ایک شعر ہاتھ لگا تو ظاہرؔ بھڑگانوی ظاہر ہو گئے ؎

بے رخی میں ہے لگاوٹ تو لگاوٹ میں حیا
دیدنی ہے ترا اس طرح سے دیکھا کرنا

عازمؔ بھڑگانوی:

دھولیہ سے نکلنے والا رسالہ 'دیارِ سخن' (۱۹۷۱ء) میں عازمؔ بھڑگانوی دو شعر کے ساتھ منظر عام پر آئے۔حیات وموت کے تعلق سے کوئی معلومات نہ مل پانے کے کارن ان کے وہی دو شعر زیر قلم لانے پڑے۔زمانے کے روّیوں نے انھیں خوب مایوس کیا۔اگر اس برتاؤ کو وہ ہمت اور ہوشمندی سے پرکھ لیتے تو شاید فرار کا خیال ان کے ذہن میں نہ آتا اور نہ وہ مایوسی کے جال میں پھنس پاتے ۔حالات کچھ بھی آجائیں سامنا مردانگی کی علامت ہے ؎

مستی نگاہ میں ہے نہ دل میں خمار اب کیا ہوگا جن وعشق کا پرور دگار اب
انساں بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا عازمؔ جہاں سے ڈھونڈیے راہ فرار اب

بڑی محنت ومشقت کے بعد مذکورہ بالا تمام شعرائے کرام کی تفصیلی معلومات تو حاصل نہ ہو سکی مگر مختلف رسالوں اور واسطوں سے ان کا کلام ضرور دستیاب ہوا۔ہوسکتا ہے کچھ حضرات چھوٹ گئے ہوں گے لیکن پوری کوشش کی گئی، ہر طرح کے ذرائع استعمال میں لائے گئے پھر بھی جو کچھ ہے وہ مشرقی خاندیش کے باذوق قارئین کی خدمت میں یہ عقیدت بھرے پھول پیش ہیں۔

☆☆☆☆

اکبر شاہین

خاندیش کی سرزمین شاعری کے لئے سازگار رہی ہے۔بزرگ شعراء کی صف میں ایک اہم نام مرحوم اکبر شاہین بھی ہے۔مرحوم کا اصل نام محمد اکبر اور آبائی وطن گجرات تھا۔ان کے والد محمد ابراہیم

اپنے وقت کے مشہور انجینئر تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم جلگاؤں میں مکمل ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد سلسلہ تعلیم ٹوٹ گیا تھا۔

شعر و سخن کی محفل میں گزر ہوا تو جلگاؤں کے استاد شاعر اور نقاد مرحوم ناظر انصاری سے تعلقات قائم ہو گئے۔ آپ نے ان سے اصلاح بھی لی۔ بعد ازاں کرم دھولیوی سے مشورۂ سخن کیا۔

مرحوم اکبر شاہین علمی، ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے اور ادبی کاموں میں عملی تعاون کا مظاہرہ بھی کیا۔ کئی رسائل کو مالی امداد بھی فراہم کی۔

نمونۂ کلام

آدمی کی آدمی کو جب وفا مل جائے گی
زندگی کو اک متاعِ بے بہا مل جائے گی
ختم ہوگا سلسلہ جبر و ستم کا ایک دن
زندگی تجھ کو بھی جینے کی ادا مل جائے گی
وہ بدل ڈالیں گے اک دن گردشِ افلاک کو
جن کو اکبر تیرے نغموں کی صدا مل جائے گی

ہوتے ہیں شب و روز اِدھر بند اُدھر بند
رہتے ہیں کبھی بند تو ریلوں کا سفر بند
شامل ہو کوئی خوف جو باہر کی فضا میں
ہو جاتے ہیں لوگ اپنے مکانوں میں نظر بند
راہیں بھی مہکتی نہیں کھلتے بھی نہیں پھول
مسموم ہواؤں سے ہوئی بادِ سحر بند
گلشن کے نقیبوں سے کوئی پوچھ لے اکبر
کب ہوگا یہاں سلسلۂ برق و شرر بند

(آمد: ۱۹۲۴ء رخصت: ۱۹۹۷ء)

☆☆☆☆

میکش انورؔ

شہر جلگاؤں کے مرحوم شعراء کی فہرست میں ایک اور نام ہے میکش انورؔ۔ مرحوم کا آبائی وطن

راجستھان تھا۔ روزگار کی تلاش میں جلگاؤں آ گئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

جب شعر گوئی میں دلچسپی ہوئی تو مرحوم افسرؔ سیمابی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے تھے۔ حمد، نعت، نظم اور غزل گوئی میں کہنہ مشق تھے۔ سادگی پسندی کے ساتھ زود گو واقع ہوئے۔ مقامی شعری محفلوں میں ہمیشہ نعت وحمد پڑھتے تھے۔ اساتذہ کے بیشتر اشعار ازبر تھے۔ ساتھ ہی ملنسار، خلیق اور مترنّم شاعر تھے۔

نمونۂ کلام

وحدت کا لا شریک تری کیا مزہ لگا
ہر لحہ ٔ حیات ہمیں جاں فزا لگا
کس کی مجال ہے جو کرے تیری ہمسری
تو ابتدا لگا توہی انتہا لگا
میکشؔ کو لگ گئی ہے بہت فکر آخرت
روزِ جزا قریب جو آتا ہوا لگا

تو التجا مری سن لے مری دعا لے جا
درِ حبیب پہ مجھ کو صبا اڑا لے جا
ترے نبی کے غلاموں کی خاکِ پاہوں میں
اس انتساب سے یارب مجھے سنبھالے جا
کہ ہے جس کی خاک فرشتوں کی آنکھ کا سرمہ
تو اس دیار میں میکشؔ کو اے خدا لے جا

(آمد: ۱۹۴۰ء رخصت: ۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆

مرحوم شیخ محمد اسحاق: ایک باصلاحیت صحافی

ایک دن آج کاشی پیٹھ اور اس وقت کے کاٹیا فائل کی گلی کے موڑ پر مسجد کے سامنے بھاری بھر کم وجود، چوڑی شکل، کشادہ پیشانی، چہرہ پر بشاشت اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک رکھنے والے سفید کھادی پوش شخص سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ شیخ محمد اسحاق ہیں۔ تعلیم یافتہ اور تعلیمی میدان کے آدمی جنھیں صحافت اور سیاست سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ محمد اسحاق نے خاندیش جلگاؤں سے پہلا اردو

ہفت روزہ اخبار' خاندیش' نکالا اور مراٹھی اخبار لوک مت، پروگامی وچار، مجور اور اردو اخبار فرخندہ جاری کیا۔ جس کے لیے دنیائے صحافت یقیناً انہیں یاد رکھے گی۔

ان کا آبائی وطن پارس، ضلع آکولہ تھا۔ محمد اسحاق کی ننہیال میں پرورش ہوئی۔ والد محمد اسمٰعیل خاندیش کپڑا مِل جلگاؤں میں جابر تھے اور نانا محمد عثمان حاجی بسم اللہ ماسٹر خاندیش کپڑا مِل کے ماہر انجینئر تھے۔ ان کے مطالعہ میں زمیندار، عالمگیر، مولوی، پیسہ اخبار کے علاوہ شمالی ہند اور حیدرآباد دکن کے بہت سے اخبارات ورسائل ہمیشہ رہتے تھے۔ ان کی والدہ صغریٰ بیگم میونسپل اسکول جلگاؤں میں صدر معلمہ تھیں جبکہ بہن منیبہ کبریٰ فی الوقت کراچی میں ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ان کے ماموں محمد یوسف صاحب کی موت ایک سڑک حادثہ میں ہوئی تب یہ خاندان بکھر گیا۔ محمد اسحاق جلگاؤں میں ہی رہے اور چھوٹے بھائی یعقوب سحر جلگانوی پونہ جا بسے۔

☆☆☆☆
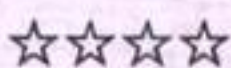
ڈاکٹر تنویر عالم

ہندوستان بھر میں اپنے کلام نیز اپنے ترنم اور آواز کی بنیاد پر شہرت پانے والے مرحوم مجاہد جلگانوی کے چشم و چراغ ڈاکٹر تنویر عالم نے بھی شاعری کی طرف توجہ کی تھی۔ کافی جدوجہد کے باوجود مرحوم کا کوئی بھی کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ کہتے ہیں کہ تنویر عالم جدیدیت کی طرف پوری طرح توجہ کیے ہوئے تھے۔ کیوں نہ ہو اگر والد مجاہد جلگانوی روایت پسندی اور جمالیاتی شاعری کے دلدادہ تھے تو دوسری جانب چاچا صابر زاہد نے نئی شاعری کی باگ ڈور سنبھال رکھی تھی۔ وہی خمیر تنویر عالم کی رگوں میں دوڑتا دکھائی دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ عین جوانی کے عالم میں اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

☆☆☆☆
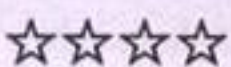
رہبرؔ جلگانوی

شفیق ناظم

جناب مرحوم رہبر صاحب کی پیدائش یکم ستمبر ۱۹۱۷ء میں جلگاؤں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جو اس زمانے میں مڈل (فائنل) کہلاتی تھی۔ اپنے وطن جلگاؤں ہی میں حاصل کی۔ والد کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ جانے سے مرحوم کی تمام تعلیمی ضرورتیں والد صاحب کی وصیت کے مطابق ان کی والدہ نے کی۔ مفلسی اور غربت کی بناء پر مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے اور تلاشِ معاش میں لگ گئے۔ ابتدا میں پرائمری اسکول کے مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد ازاں ڈھائی سال تک پوسٹ مین کی حیثیت سے ملازمت کی۔ بیرسٹر ایس ایم حسن صاحب کے یہاں تقریباً تین سال منشی کا کام بھی کیا اور اسی سلسلہ کی وجہ سے ممبئی جیسے شہر میں سولہ سال تک اپنی زندگی کے دن گزارے۔ ممبئی جیسے شہر میں بھی اردو زبان وادب کا دامن مرحوم نے نہیں چھوڑا۔ وہاں بھی روزنامہ انقلاب اور کہکشاں میں بحیثیت کالم نویس اردو کی خدمت کرتے رہے۔

مرحوم کو بچپن ہی سے شعر وادب سے لگاؤ تھا۔ کسی بھی شعر کو سن کر ان کی فطرت میں اس پر غور وفکر کرنے کا جذبہ طاری ہو جاتا تھا۔ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ مرحوم اردو ادب کی دیگر اصناف میں خصوصاً افسانہ نویسی اور ڈرامہ نویسی میں بھی دلچسپی لیتے تھے لیکن آپ کا لگاؤ اور آپ کی طبیعت کا جھکاؤ شعر گوئی کی طرف ہی زیادہ رہا۔ اپنی ابتدائی دو غزلوں پر سید منظور حسین منظورؔ بخاری صاحب سے اصلاح لی۔ ۱۹۴۸ء میں جناب شفاء گوالیاری سے رابطۂ تلمذ قائم کیا۔ ۱۹۵۲ء میں فارغ اصلاح کی سند حاصل کی۔ گردشِ حالات نے دھولیہ پہنچایا۔ وہاں بھی ابوالبیان حضرت حنیف دھولیوی کی صحبت میں انہیں شاعری کے رموز ونکات سے آگاہی ہوئی۔ بعد میں سورت (گجرات) میں مستقل سکونت اختیار کی۔ دھولیہ کے علاوہ شہر مالیگاؤں بھی مرحوم کا مستقر رہا ہے۔ تقریباً ۲۰۰ رغزلیں، ۲۵ رنظمیں اور ۱۰۰ رسے زیادہ قطعات مرحوم کا شعری سرمایہ تاریخ ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

مرحوم کی زندگی میں ہر قدم پر جو نشیب وفراز کا سامنا کرنا پڑا۔ تلاشِ روزگار میں مختلف علاقوں میں ہجرت کرنی پڑی۔ بس اسی جدوجہد کی وجہ سے مرحوم کی زندگی بے پناہ تجربات کا خزانہ بن گئی۔ جس کا اندازہ ہم ان کے درج ذیل کلام سے لگا سکتے ہیں۔

مثالی ہے جہانِ شوق میں یہ سانحہ اپنا
زمانہ آج تک دہرا رہا ہے واقعہ اپنا
حیاتِ شوق بھی اللہ رے کیا سخت منزل ہے
نہ کوئی ہم سفر اپنا، نہ کوئی راستہ اپنا
نہیں ہے یہ اگر دیوانگی تو اور پھر کیا ہے
کہ اپنے آپ ہی سے پوچھتے ہیں اب پتہ اپنا
خدا رکھے سلامت حوصلہ ان راہ گیروں کا
بنا لیتے ہیں جو اوروں سے ہٹ کر راستہ اپنا
چلے آئے ہیں جب سے چھوڑ کر دنیا کی گلیوں میں
تکا کرتی ہے رہبرؔ خلد اب تک راستہ اپنا

نگارِ صبح میں پوشیدہ شب کا چہرہ ہے
نکالو ڈھونڈ کے خود کو ابھی سویرا ہے
روِش روِش پہ کنویں کھودنے چلے ہیں ہم
ہمارے سامنے پیاسا جہان ٹھہرا ہے
اگیں گی کسطرح کھیتوں میں دھان کی فصلیں
مری زمین پہ خشکی کا آج پہرہ ہے
میرا پڑوسی جو تنہا تھا مر گیا کل شب
چراغ جلتا تھا جس جا وہاں اندھیرا ہے
حصارِ آگہی نہ رہبرؔ ٹوٹنے پائے
مذاق شوق کا ہر دل میں زخم گہرا ہے

جہاں تک عشق میں خود آگہی محسوس کرتا ہوں
وہاں تک عقل کی دیوانگی محسوس کرتا ہوں
خرد کی دور اندیشی میں بس مرنا ہی مرنا ہے
جنوں میں زندگی ہی زندگی محسوس کرتا ہوں
دلِ پر شوق میں کیا کیا تمنا لے کے نکلا تھا
پہنچ کر پھر بھی منزل پر کمی محسوس کرتا ہوں
جہاں تک آدمی کا آدمیت سے تعلق ہے
وہاں تک آدمی کو آدمی محسوس کرتا ہوں
دلِ حساس نے رہبرؔ مجھے شاعر بنایا ہے
اثر ہر چیز کا میں واقعی محسوس کرتا ہوں

دل کی دنیا ہو یا ہو مری چشمِ نم
آپ کے دم سے دونوں ہیں اے محترم
کون رہتا ہے دیکھیں گے ثابت قدم
کون رکھتا ہے باقی وفا کا بھرم
اپنے چاکِ گریباں کی لیجے خبر
نقشِ ماضی کا کھلنے لگا ہے بھرم
اپنا دامن جھٹک کر جنوں چل دیا
ہوش نے سہہ لیے سارے رنج و الم
ہم نے رہبرؔ نشاں تو بنا ہی دیئے
کون رکھتا ہے دیکھیں قدم پر قدم ؟

☆☆☆☆

اس کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد مشرقی خاندیش کے موجودہ فنکاروں پر دوسری کتاب کا کام بھی شروع کیا جا رہا ہے۔ یقیناً آپ سب کا تعاون متوقع ہے۔ مستقبل میں جب کبھی کوئی طالب علم یا محقق مشرقی خاندیش (ضلع جلگاؤں) کے فنکاروں پر ریسرچ کرے گا تو ان شاء اللہ یہ دونوں کتابیں اس کے لیے اہم تصانیف ثابت ہوں گی۔

کچھ کتاب کے بارے میں۔۔۔

جو قوم اپنے اسلاف کی تاریخ بھلا دیتی ہے، ان کے کارناموں کو فراموش کر دیتی ہے، اس کی سرخروئی کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ ریاست مہاراشٹر کا علاقہ خاندیش جس کی سرحدیں کبھی ایک جانب برہانپور تو دوسری جانب تھالنیر تک پھیلی ہوئی تھیں اب سمٹ کر محض ضلع نندوربار، دھولیہ اور جلگاؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ضلع جلگاؤں 'مشرقی خاندیش' کہلاتا ہے۔ اس کی ایک تحصیل بھساول بھی ہے جو اپنے وسیع و عریض ریلوے یارڈ کیلئے ملک بھر میں مشہور ہے۔ خاندیش پر کبھی مغلوں نے حکومت کی تو کبھی عنانِ حکومت فاروقیوں کے ہاتھ میں رہی۔

ضلع جلگاؤں کی اپنی ادبی تاریخ ہے۔ یہاں کے فنکاروں نے گیسوئے اردو کو سنوارنے کیلئے مخلصانہ کوششیں کیں مگر دل میں یہ کسک رہی کہ اردو کے ان جیالوں اور متوالوں کے کارناموں کو تاریخ میں وہ جگہ نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ چونکہ ناچیز میدانِ تعلیم کا ایک ادنیٰ سا سپاہی ہے۔ تعلیم کے فروغ، طلبہ کی رہنمائی، قوم کے ہونہاروں کی حوصلہ افزائی و پذیرائی کیلئے مہاراشٹر کے علاوہ دیگر ریاستوں کی بھی خاک چھانتا رہا ہے۔ جب کسی علمی ادبی، عالم و فاضل شخصیت سے ملاقات ہوتی اور وہ مشرقی خاندیش یعنی ضلع جلگاؤں کے فنکاروں کا ادبی شجرہ دریافت کرتا تو ناچیز دو چار اسمائے گرامی بیان کر کے گویا ہانپنے لگ جاتا۔ اس کیفیت کے بعد یہ ارادہ مصمم ہوا کہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو سمیٹ کر موتیوں کی صورت ایک خوبصورت ہار بنا لیا جائے۔ 'اردو کے بے لوث سپاہی' دراصل موتیوں کی مالا ہی ہے۔ مطالعہ کا ذوق رکھنے والا جب بھی اسے پہنے گا نکھر جائے گا، سنور سنور جائے گا انشاء اللہ۔

اس کتاب کی ترتیب میں اگر میں اپنے ان ساتھیوں کے نام نہ لوں تو یہ بہت بڑی ناانصافی ہوگی جن میں خصوصاً رشید قاسمی، قیوم اثر، مشتاق کریمی، شاہد لطیف (ممبئی)، عزیز انصاری (دھولیہ)، ڈاکٹر الیاس صدیقی (مالیگاؤں)، ڈاکٹر وسیم (آکولہ)، شمیم طارق (ممبئی)، پروفیسر عزیز (دہلی) اور ارتکاز صابر و دیگر قابل ذکر ہیں جن کی انتھک محنتوں اور تعاون سے یہ کتاب پایہء تکمیل تک پہنچی۔

میں خاص طور پر ان مضمون نگاروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے بڑے عمدہ مضامین لکھ کر اپنے بزرگوں کی روح کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ممکن ہے اس میں کمیاں بھی ہوں اور خامیاں بھی۔ آپ کی آراء ہی روشنی سے سفر مزید آسان ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالکریم سالار

چیئرمین بزم اردو ادب، الفیض فاؤنڈیشن، جلگاؤں